99

قومی کتب خانہ لاہور

26

محمد بن قاسم

نسیم حجازی

L. Middle School
LIBRARY
Mochi Gate

پبلشرز

می کتب خانہ۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

شیخ محمد نصیر ہمایوں نے
کپور آرٹ پریس لاہور میں چھپوا کر
قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے شائع کیا

(جملہ حقوق محفوظ)

تاریخِ اشاعت۔ مئی ۱۹۴۹ء
قیمت ـــــــ پانچ روپے
تعداد ـــــــ دو ہزار
تیسرا ایڈیشن

پہلا حصّہ

ناھید

دوسرا حصّہ

کمسن سالار

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

(اقبال)

پیش لفظ

وہ تمام خطوط جو مجھے داستانِ مجاہد کی اشاعت کے بعد موصول ہوئے۔ میرے اِس دعویٰ کی تصدیق کر چکے تھے کہ مسلمانوں کے ماضی کی تاریخ اس دور میں بھی اُن کے لئے قیس و فرہاد کے افسانوں سے زیادہ دلکش ہے۔ گزری ہوئی بہار کی یاد اس خزاں رسیدہ چمن کے پودوں میں ذوقِ نمود پیدا کر سکتی ہے۔ ماضی کے دھندلکے میں چھپے ہوئے نقوش ہمیں مستقبل کی منزل دکھا سکتے ہیں۔

مَیں بذاتِ خود شاید تاریخِ اسلام کا کوئی اَور ورق اُلٹتا لیکن جن حضرات نے مجھے "داستانِ مجاہد" کی طرز کے اَور ناول لکھنے کی ترغیب دی۔ اُن میں سے اکثر کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ مَیں محمد بن قاسم کے متعلق ضرور کچھ لکھوں۔

میاں محمد احسن داستانِ مجاہد کا مسودہ پڑھتے ہی میری اگلی تصنیف کے لئے "فاتحِ سندھ" کا عنوان پیش کر چکے تھے۔

مارچ سنہ ۱۹۴۵ء تک مَیں کم سن سالار کی داستانِ حیات لکھنے کا فیصلہ نہ کر سکا۔ اور چُپکے سے احسن صاحب، سلیم پانی پتی اور دوسرے احباب کی شکایات سُنتا رہا۔ عماد الدین محمد بن قاسم سے میری دلچسپی اور عقیدت اپنے کسی دوست سے کم نہ تھی۔ لیکن میرے تذبذب کی وجہ صرف یہ تھی کہ زمین کی وہ سطح جس پر عالمِ اسلام کا یہ سترہ سالہ ہیرو اپنے اقبال کے گھوڑے دوڑا چکا تھا، مجھے اپنے تخیل کے ہر آسمان سے بلند نظر آتی تھی۔

احباب مجھ سے عزم و ہمت کے اُس دریائے ناپیدا کنار کی تصویر کھینچنے کا مطالبہ کر رہے تھے جس کی موجیں ستاروں پر کمندیں ڈال رہی ہیں اور میری مثال اُس مصور سے مختلف نہیں جس نے اپنے تخیل کے صحرا میں آزادی کا گیت گانے والی ندیاں تک نہ دیکھی ہوں۔

بہرحال مارچ کے اختتام پر میں نے یہ کام شروع کیا اور آج اُن احباب کی خواہش کو پورا کر رہا ہوں جنہوں نے اس تصویر کے لئے میرا قلم منتخب کیا۔ اگر اس تصویر میں کوئی خوبی نظر آئے تو اسے محمد بن قاسم سے عقیدت کا پھل یا اُن احباب کی توجہ کا کرشمہ سمجھئے جن کے ذوقِ نظر کی تسکین کا خیال مجھے اس تصویر کے لئے اپنے بہترین رنگ استعمال کرنے کی ترغیب دیتا رہا۔

اس کتاب کا پہلا حصہ "ناہید" اس لڑکی کی سرگزشت ہے جس کی آواز نے ہندوستان کی تاریخ بدل دی اور دوسرا حصہ "کم سن سالار" تاریخِ اسلام کے اُس آفتاب کی داستان ہے جو عرب کے اُفق سے نمودار ہوا۔ سندھ کے آسمان پر چمکا اور عین دوپہر کے وقت غروب ہو گیا۔

یہاں پر محترم میر جعفر خاں جمالی کے متعلق کچھ کہے بغیر شاید تعارف نامہ مکمل نہ ہو۔ میر صاحب موصوف اس کتاب کی تکمیل کے لئے مجھے وہ تمام سہولتیں مہیا کرتے رہے جن کی "داستانِ مجاہد" لکھتے وقت میں خواہش کر سکتا تھا اور میں شکر کے رسمی الفاظ سے احسان مندی کے اُن جذبات کی توہین نہیں کرنا چاہتا جو اُن کے لئے میرے دل میں ہیں۔

کوئٹہ

نسیم حجازی

۳ر اکتوبر ۱۹۴۵ء

ابوالحسن

(۱)

ہندوستان کے مغربی ساحل کی اہم بندرگاہوں اور جزیرہ سراندیپ[۱] کے ساتھ ایک مُدت سے عربوں کے تجارتی تعلقات چلے آتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں چند عرب تاجر سراندیپ میں آباد ہو گئے تھے۔ ان ہی دنوں عرب میں ایک نئے دین کا چرچا شروع ہوا۔ یہ دین ان تاجروں کو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ لیکن ایرانیوں اور رومیوں کے مقابلے میں عربوں کی شاندار فتوحات کی خبریں سُن کر اُن کی قومی عصبیت جاگ اُٹھی۔ ایران، عرب کے مقابلے میں ایک متمدّن مُلک سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے ہندوستان کے بازاروں میں عرب کے مقابلہ میں ایران کی مصنوعات کی زیادہ قدر تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے حکمران ایران کو ایک طاقتور ہمسایہ خیال کرتے تھے۔ اور عربوں کے مقابلہ میں ایرانی تاجروں کو زیادہ عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر شام سے کوئی قافلہ آ جاتا تو روما کی قدیم سطوت سے مرعوب ہندوستانی انہیں بھی عربوں سے زیادہ مراعات دیتے۔ لیکن ابوبکر صدیق رض اور عمر فاروق رض کی شاندار فتوحات

[۱] موجودہ لنکا یا سیلون۔

نے عربوں کے متعلق ہمسایہ ممالک کے باشندوں کا زاویۂ نگاہ تبدیل کر دیا۔

سراندیپ اور ہندوستان کے دُوسرے حصّوں میں آباد ہونے والے وُہ تاجر جو ابھی تک عرب کے اندرونی انقلاب سے متاثر نہ ہوئے تھے، کفر کے مقابلہ میں اسلام کی فتوحات کو ایرانیوں اور رومیوں کے مقابلہ میں عرب کی فتوحات سمجھ کر خوشی سے پھُولے نہ سماتے تھے۔ عربوں کے نئے دین سے اُن کی نفرت اب محبت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں جنہیں عرب جانے کا اتفاق ہؤا وہ نئے دین کی نعمتوں سے مالا مال ہو کر واپس آئے۔

سراندیپ میں عبد الشمس عرب تاجروں کا سرکردہ تھا۔ اُس کا خاندان ایک مُدّت سے اس جزیرے میں آباد تھا۔ وہ اسی جزیرے میں پیدا ہؤا اور اسی جگہ آباد ہونے والے ایک عرب خاندان کی لڑکی سے شادی کی۔ جوانی سے بڑھاپے تک اُس کے بحری سفر بھی سراندیپ سے کاٹھیاواڑ تک محدود رہے۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عرب میں اُس کے خاندان کے دوسرے افراد کون ہیں اور کس جگہ رہتے ہیں۔

دوسرے عربوں کی طرح وہ بھی مادرِ وطن کے ساتھ اُس وقت دلچسپی لینے لگا، جب یرمُوک اور قادسیہ میں مسلمانوں کی شاندار فتوحات کی خبریں دُنیا کے ہر گوشے میں پہنچ چکی تھیں۔

موجودہ راجہ کے باپ کو انہیں خبروں نے عرب کے ایک گمنام تاجر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر آمادہ کیا تھا۔ اُس نے عبد الشمس اور اُس کے ساتھیوں کو دربار میں بُلایا اور بیش قیمت تحائف دے کر رخصت کیا۔

۷۵ھ میں اپنے باپ کی وفات کے بعد نئے راجہ نے تختِ نشین ہوتے ہی عبدالشمس کو بُلایا اور کہا: "مدت سے ہمارے مُلک میں تمہارے مُلک کا کوئی تاجر نہیں آیا۔ مَیں عرب کے تازہ حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں مجھے تمہارے نئے دین کے ساتھ بھی دلچسپی ہے۔ اگر تم وہاں جانا پسند کرو تو مَیں تمہارے لئے ہر سہولت مہیا کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

عبدالشمس نے جواب دیا: "آپ کے مُنہ سے میرے دِل کی دبی ہوئی آواز نکلی ہے۔ مَیں جانے کے لئے تیار ہوں۔"

پانچ عرب تاجروں کے سوا باقی سب عبدالشمس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گئے۔

دس دن کے بعد بندرگاہ پر ایک جہاز کھڑا تھا، اور عرب اپنے بال بچوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ عبدالشمس کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اُس نے سینے پر پتھر رکھ کر اپنی اکلوتی بیٹی کو الوداع کہی۔ اس لڑکی کا نام سلمیٰ تھا۔ شہر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اُسے نسوانی حُسن کا بلند ترین معیار تصور نہ کرتا ہو۔ شاہسوار اُسے تند و سرکش گھوڑوں کو دوڑاتے اور بہترین تیراک اُسے خوفناک آبشاروں میں کُودتے اور سمندر میں مچھلی کی طرح تیرتے دیکھ کر دم بخود رہ جاتے۔

عبدالشمس کی روانگی کے بیس دن بعد کاٹھیاواڑ کے تاجروں کا ایک جہاز بندرگاہ پر رُکا۔ اور عبدالشمس اور اُس کے دو اَور ساتھیوں نے اُتر کر یہ المناک خبر سُنائی کہ اُن کا جہاز اور دُوسرے ساتھی، سمندر کی لہروں کا شکار

ہو چکے ہیں۔ اور اگر کاٹھیاواڑ کے تاجروں کا جہاز وقت پر نہ پہنچتا تو وہ بھی چند ساعت اور پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ڈوب جاتے۔

راجہ نے اس حادثہ کی خبر نہایت افسوس کے ساتھ سُنی۔ سندھی تاجروں کے سردار کا نام دلیپ سنگھ تھا۔ راجہ نے اُسے دربار میں بُلایا اور تین عربوں کی جان بچانے کے عوض اُسے تین ہاتھی انعام دیئے۔ راجہ کو مہربان دیکھ کر دلیپ سنگھ اور اُس کے ساتھیوں نے وہاں آباد ہونے کا خیال ظاہر کیا۔ راجہ نے خوشی سے اُن کی یہ درخواست منظور کی اور شاہی خزانے سے اُن کے لئے مکانات تعمیر کرا دیئے۔

چند سال کی وفادارانہ خدمات کے بعد دلیپ سنگھ راجہ کے بحری بیڑے کا افسرِ اعلےٰ بنا دیا گیا۔

(۲)

اس واقعہ کے تین سال بعد ابوالحسن پہلا مسلمان تھا جسے تجارت کا ارادہ اور تبلیغ کا شوق اِس دُور اُفتادہ جزیرے تک لے آیا۔

کئی ہفتوں کے سفر کے بعد ایک صبح ابوالحسن اور اُس کے ساتھی جہاز پر کھڑے سرانديپ کے سرسبز ساحل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بندرگاہ کے قریب چند مرد، عورتیں اور بچے کشتیوں پر سوار ہو کر اور چند تیرتے ہوئے جہاز کے استقبال کو نکلے۔ ایک کشتی پر ابوالحسن کو جزیرے کی سیہ فام اور نیم عریاں عورتوں کے درمیان ایک اجنبی صورت دِکھائی دی۔ اُس کا رنگ سفید تھا اور شکل وصورت جزیرے کے باشندوں

سے بہت مختلف تھی ۔ دوسری کشتیوں سے پہلے جہاز کے قریب پہنچنے کے لئے وُہ اپنی کشتی پر کھڑی دو تنومند ملاحوں کو جو اس کے چپّو کھینچ رہے تھے، ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔

یہ کشتی تمام کشتیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی جہاز کے ساتھ آ لگی ۔ لڑکی نے ابوالحسن کی طرف دیکھا اور اُس نے اس کی بے باک نگاہوں کا جواب دینے کی بجائے دُوسری طرف مُنہ پھیر لیا ۔ ابوالحسن کے ساتھیوں کو بھی عورتوں کا نیم عریاں لباس ناگوار محسوس ہُوا ۔ سفید فام لڑکی نے جہاز والوں کی بے اعتنائی کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے سراندیپ کی زبان میں کچھ کہا لیکن جہاز پر سے کوئی جواب نہ آیا۔

اچانک ابوالحسن نے کسی کی چیخ پکار سُن کر پیچھے دیکھا ۔ کشتی سے آٹھ دس گز کے فاصلے پر وُہی خوبصورت لڑکی پانی میں غوطے کھا رہی تھی اور کشتی والے اُس کی چیخ پکار کے باوجود سخت بے اعتنائی سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ابوالحسن نے پہلے رسّی کی سیڑھی پھینکی ۔ لیکن جب اِس بات کا یقین ہو گیا کہ لڑکی کے ہاتھ پاؤں جواب دے رہے ہیں اور وہ سیڑھی تک نہیں پہنچ سکتی تو وُہ کپڑوں سمیت سمندر میں کُود پڑا ۔ لیکن لڑکی اچانک پانی میں غائب ہو گئی ۔ اور وُہ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ اتنی دیر میں بہت سی کشتیاں جہاز کے گرد جمع ہو چکی تھیں ، اور جزیرے کے باشندے قہقہے لگا رہے تھے۔

ابوالحسن نے تین مرتبہ غوطہ لگانے کے بعد دل برداشتہ ہو کر سیڑھی کی

رسّی پکڑ لی۔ اور اُوپر چڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اُوپر سے اُس کا ایک ساتھی چلّانے لگا "وہ اِدھر ہے جہاز کی دُوسری طرف۔ وہ ڈوب رہی ہے۔ شاید کسی مچھلی نے پکڑ رکھا ہے"

مقامی مردوں اور عورتوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ ابوالحسن لڑکی کے جہاز کی دُوسری طرف پہنچنے کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ تشویش اور حیرانی کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ اُس نے جلد ہی پھر غوطہ لگایا اور جہاز کے نیچے سے گُزرتا ہُوا اُس کی دُوسری طرف پہنچ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اُوپر سے اُس کا وہی ساتھی شور مچا رہا تھا۔

"وہ ڈوب گئی۔ اُسے مچھلی نگل گئی"

ابوالحسن مایوس ہو کر پھر دُوسری طرف پہنچا۔ اس دفعہ لوگوں کے قہقہوں میں اُس کے ساتھی بھی شریک تھے۔ ایک عرب نے کہا "آپ آ جائیے۔ وہ آپ سے بہتر تیر سکتی ہے"

ابوالحسن نے کھسیانا ہو کر سیڑھی پکڑ لی۔ لیکن ابھی ایک ہی پاؤں اُوپر رکھا تھا کہ کسی نے اُس کی ٹانگ پکڑ کر پانی میں گرا دیا۔ اُس نے سنبھل کر اِدھر اُدھر دیکھا تو لڑکی تیزی سے سیڑھی پر چڑھ رہی تھی۔

ابوالحسن جہاز پر پہنچا تو اُس کے ساتھی پریشان سے ہو کر جزیرے کی لڑکی کے قہقہے سُن رہے تھے۔

لڑکی نے ابوالحسن کی طرف دیکھ کر عربی زبان میں کہا "مجھے آپ کے بھیگ جانے کا بہت افسوس ہے"

لڑکی کے مُنہ سے عربی کے الفاظ سُن کر سب کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔

ابوالحسن نے پُوچھا "کیا تم عرب ہو؟"

لڑکی نے ایک طرف سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کا پانی نچوڑتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں میں عرب ہوں۔ ایک مُدت سے ہم عربوں کے جہاز کی راہ دیکھا کرتے تھے۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ آپ کیا مال لائے ہیں؟"

ایک عرب لڑکی کو اس لباس میں دیکھنا ابوالحسن اور اُس کے ساتھیوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

لڑکی نے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر پھر پُوچھا۔ "میں پُوچھتی ہوں کہ آپ کیا مال لائے ہیں؟ آپ حیران کیوں ہیں؟ کیا عرب عورتیں تیرنا نہیں جانتیں؟ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ اچھا میں خود دیکھ لیتی ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا۔ "ٹھہرو۔ ہم گھوڑے لائے ہیں۔ میں تمہیں خود دکھاتا ہوں۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اس جزیرے کے عرب ابھی تک زمانۂ جاہلیت کے عربوں سے بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا انہیں انسانوں کا لباس پہننا اور مردوں سے حیا کسی نے نہیں سکھائی؟"

لڑکی کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ اُس نے جواب دیا۔ "کیا یہ انسانوں کا لباس نہیں؟"

"نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے گھروں تک اسلام کی روشنی ابھی تک نہیں آئی۔" یہ کہہ کر ابوالحسن نے ایک جبّہ اُٹھایا، اور لڑکی کے کندھوں پر ڈال کر بولا۔ "اب تم ہمارا جہاز دیکھ سکتی ہو۔"

لڑکی نے ابوالحسن کے الفاظ سے زیادہ اُس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اپنے عریاں بازوؤں اور پنڈلیوں کو جبّے میں چھپا لیا۔

ابوالحسن کی پُونجی پچاس عربی گھوڑے تھے۔ لڑکی نے یکے بعد دیگرے تمام گھوڑوں کا معائنہ کیا۔ اور ایک گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بولی،:-

"مَیں یہ خریدوں گی۔ اس کی قیمت کیا ہے؟"

ابوالحسن نے کہا۔ "تم میں ابھی تک عربوں کی ایک خصوصیت باقی ہے۔ یہی گھوڑا ان سب میں بہترین ہے۔ لیکن تم نہ اس کی قیمت ادا کر سکو گی، اور نہ یہ عورتوں کی سواری کے قابل ہے۔ یہ جس قدر خوبصورت اور تیز رفتار ہے، اُسی قدر مُنہ زور ہے۔"

لڑکی اِس جواب پر مسکرائی اور بولی۔ "خیر دیکھا جائے گا۔ آپ نے جہاز اِتنی دُور کیوں ٹھہرا لیا؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "مَیں اس مُلک کی حکومت سے اجازت لینا ضروری خیال کرتا ہوں۔"

لڑکی نے کہا۔ "سراندیپ کا راجہ ایک مُدّت سے عربوں کے جہاز کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ کنارے پر لے چلیے۔ لیجیے راجہ کے امیرالبحر خود ہی پہنچ گئے۔"

دلیپ سنگھ، عبدالشمس سے گہرے تعلقات کی بدولت عربی میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر چکا تھا۔ اُس نے جہاز پر چڑھتے ہی عربی زبان میں کہا "آپ نے جہاز اتنی دُور کیوں ٹھہرا لیا؟"

ابوالحسن کی بجائے لڑکی نے جواب دیا "ان کا خیال تھا کہ شاید جہاز کو بندرگاہ پر لگانے سے پہلے راجہ سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہو"۔

دلیپ سنگھ نے جواب دیا "مہاراج آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے"۔

لڑکی نے کہا "میں جاتی ہوں۔ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ وہ سفید گھوڑا میرا ہے اور میں اُس کے مُنہ مانگے دام دُوں گی" یہ کہہ کر لڑکی نے جبہ اُتار کر ایک عرب کے کندھوں پر پھینک دیا۔ اور بھاگ کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

(۳)

عبدالشمس کو عربوں کے جہاز کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ اُس نے شہر کے چند معززین کے ساتھ ابوالحسن اور اُس کے ساتھیوں کا استقبال کیا اور اُنہیں اپنے گھر اور اُن کے گھوڑوں کو اپنے اصطبل میں جگہ دی۔ آن کی آن میں پچاس گھوڑوں کے کوئی دو سَو خریدار جمع ہو گئے اور تمام ایک دوسرے سے بڑھ کر بولی دینے لگے۔

دلیپ سنگھ نے مشورہ دیا کہ راجہ کو دکھائے بغیر کوئی گھوڑا فروخت نہ کیا جائے۔ ممکن ہے وہ تمام گھوڑے خرید لیں۔ عبدالشمس نے دلیپ سنگھ کی تائید کی۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ راجہ کا ایلچی آیا اور اُس نے کہا

"مہاراج عرب تاجروں سے ملنا اور اُن کے گھوڑے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

دلیپ سنگھ نے ایلچی سے کہا۔ "تم جاؤ اور مہاراج سے کہو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وُہ ابوالحسن سے مخاطب ہوا۔ "ایک گھوڑا شیخ عبدالشمس کی بیٹی نے اپنے لئے منتخب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُسے یہیں رہنے دیا جائے۔"

ابوالحسن نے کہا۔ "اگر شیخ خود اپنے لئے لینا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ لیکن وہ لڑکیوں کی سواری کے قابل نہیں۔ وہ بہت سرکش ہے۔"

ایک طرف سے آواز آئی۔ "نہیں ابا جی! ان کا خیال ہے کہ ہم اُن کی قیمت ادا نہیں کر سکیں گے۔"

ابوالحسن نے دیکھا۔ وہی لڑکی جسے اُس نے جہاز پر دیکھا تھا، ایک ہاتھ میں لگام اور دوسرے ہاتھ میں چابک لئے کھڑی تھی۔ لیکن اِس دفعہ اُس کا لباس عرب عورتوں کا سا تھا۔

ابوالحسن نے قدرے خفیف ہو کر کہا۔ "اگر مجھ پر اعتبار نہیں آتا، تو تم خود دیکھ لو۔ اگر تم اُسے لگام بھی دے سکو تو یہی گھوڑا تمہارا انعام ہوگا۔"

لڑکی تیزی سے قدم اُٹھاتی اصطبل کی طرف بڑھی۔ باقی سب لوگ بھی اُس طرف چل دیئے۔ لڑکی تمام گھوڑوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد سفید گھوڑے کی طرف بڑھی۔ گھوڑے نے اُسے دیکھتے ہی چارہ چھوڑ کر کان کھڑے کر لئے۔ لڑکی نے گھوڑے کو تھپکی دی اور وُہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اُسے دیکھ کر دوسرے گھوڑے رسّے تڑانے لگے۔

ابوالحسن نے کہا "ٹھہرو!" اور آگے بڑھ کر گھوڑے کا رسہ کھول کر باہر لے آیا اور اُسے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر کہنے لگا "اب آپ ہمت آزمائی کر سکتی ہیں۔" لڑکی نے اچانک آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے گھوڑے کا نچلا جبڑا پکڑ لیا، اور دُوسرے ہاتھ سے ایک زخمی درندے کی طرح تڑپتے، اُچھلتے اور کُودتے ہوئے جانور کے مُنہ میں لگام ٹھونس دی۔ تماشائیوں نے حیرانی پر قابو نہ پایا تھا کہ اُس نے رسا کھولا اور کُود کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو گئی۔ گھوڑا چند بار پیچ پا ہونے کے بعد چھلانگیں لگاتا ہُوا مکان سے باہر نکل گیا۔

شیخ عبدالشمس نے فخریہ انداز میں کہا "عرب کی گھوڑیوں نے ایسا گھوڑا پیدا ہی نہیں کیا۔ جس پر سلمیٰ سواری نہ کر سکتی ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ شرط ہار گئے۔ لیکن اطمینان رکھئے۔ آپ کو اس کی پُوری قیمت ادا کی جائے گی۔"

ابوالحسن نے جواب دیا "یہ شرط نہ تھی انعام تھا اور انعام کی قیمت نہیں لی جاتی۔ خوش قسمت ہے وہ گھوڑا جسے . . . ایسا سوار مل جائے۔"

(۴)

راجہ دیکھنے سے پہلے ہی تمام گھوڑوں کو خریدنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ شاہی خزانے سے جو قیمت ادا کی گئی وُہ عربوں کی توقّع سے کہیں زیادہ تھی۔ راجہ نے ابوالحسن سے عربوں کے نئے دین اور اُن کی فتوحات کے متعلّق کئی سوالات پُوچھے۔ دلیپ سنگھ نے ترجمان کے فرائض سرانجام دیئے۔ ابوالحسن نے تمام سوالات کا جواب دینے کے بعد دینِ اسلام کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔ راجہ نے اسلام کی بہت سی خوبیوں کا اعتراف کرنے کے بعد ابوالحسن سے دوبارہ ملاقات

کا وعدہ لے کر اُسے رُخصت کیا۔

جب ابوالحسن اپنے میزبان کے گھر واپس پہنچا تو اُسے معلوم ہُوا کہ سلمیٰ ابھی تک واپس نہیں آئی اور عبدالشمس چند آدمیوں کے ہمراہ اُس کی تلاش میں جا چکا ہے۔ ابوالحسن نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد پریشانی کی حالت میں مکان کے صحن میں ٹہل رہا تھا کہ سفید گھوڑا خالی پیٹھ بے تحاشا بھاگتا ہُوا اندر آیا۔ گھوڑے کی لگام بھی غائب تھی۔

ابوالحسن نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا "خدا معلوم اُسے کیا ہُوا یہ گھوڑا سرکش ضرور تھا لیکن گرے ہوئے سوار کو چھوڑ کر آنے والا نہ تھا۔ اور لگام کی باگیں پاؤں کے نیچے آکر ٹوٹ سکتی تھیں لیکن لگام کا گر پڑنا ممکن نہ تھا۔ میں جاتا ہوں"

ابوالحسن نے شیخ عبدالشمس کے خادم سے دوسری لگام منگوا کر گھوڑے کو دی اور ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر مکان سے باہر نکلا اور گھوڑے کو اُس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ گھوڑے کی رفتار ظاہر کرتی تھی کہ اُس سے بہت زیادہ کام لیا جا چکا ہے۔ گھوڑا چند کوس گھنے جنگل میں سے گزرنے کے بعد ایک ٹیلے پر چڑھا۔ اور ایک آبشار کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ اس سے اُوپر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد ابوالحسن گھوڑے سے اُترا اور اُسے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر سلمیٰ کو آوازیں دینے لگا۔ دیر تک تلاش کرنے کے بعد وُہ تھک کر آبشار کے قریب ایک پتھر کے کنارے بیٹھ گیا۔ شام ہونے کو تھی۔ ابوالحسن نے عصر کی نماز ادا کی اور دشوار گزار راستے سے اُس مقام تک پہنچا۔ جہاں سے پہاڑی ندی کا پانی ایک آبشار کی شکل میں نیچے گرتا تھا۔ سلمیٰ چند قدم کے فاصلے پر ندی کے کنارے ایک درخت

کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ ابوالحسن کی نظر اُس پر اس وقت پڑی جب ایک تین چار گز لمبا اور آدمی کی ران کے برابر موٹا اژدہا گھاس میں سے سرکتا ہُوا اُس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ابوالحسن "سلمیٰ! سلمیٰ!!" کہتا ہُوا بھاگا۔ اور اُسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہُوا چند قدم دُور لے گیا۔ سلمیٰ نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ آنکھیں کھولیں۔ اژدہا شکار جاتا دیکھ کر پھُنکارتا ہُوا لپکا۔ اتنی دیر میں ابوالحسن نیام سے تلوار نکال چکا تھا۔ اژدہا نے اُس کے بالکل قریب پہنچ کر گردن بلند کی۔ ابوالحسن نے ایک طرف کُود کر وار کیا۔ اژدہا کا سر کٹ کر علیحدہ ہوگیا۔ ابوالحسن نے ندی کے پانی سے تلوار صاف کرتے ہوئے کہا۔ "بہت بیوقوف ہو تُم۔ سونے کی یہ کون سی جگہ تھی؟"

سلمیٰ ابھی تک دہشت زدہ ہو کر کانپ رہی تھی۔ وہ بولی۔ "مَیں تھک کر یہاں بیٹھ گئی تھی اور اُونگھتے اُونگھتے نہ جانے کِس وقت لیٹ کر سو گئی۔ مَیں یہاں کئی بار آچکی ہوں۔ لیکن ایسا اژدہا کبھی نہیں دیکھا۔ آپ پہنچ گئے۔ ورنہ یہ اژدہا اس وقت اِس طرح تڑپنے کی بجائے مجھے نگل رہا ہوتا۔ آپ یہاں کیسے پہنچے؟"

"تم جانتی ہو مَیں یہاں کیسے پہنچا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ تُم نے یہاں پہنچ کر گھوڑا کیوں چھوڑ دیا؟"

سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "مَیں نے کب چھوڑا۔ وہ مجھے گرا کر بھاگ گیا تھا۔"

ابوالحسن نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری تربیت بہت ناقص ماحول میں ہوئی ہے۔ بے شک تمہارے اخلاق کا معیار وہی ہونا

چاہیئے جو زمانۂ جاہلیت کے عربوں کا تھا۔ لیکن وہ بھی ہزار برائیوں کے باوجود مہمان کے ساتھ جھوٹ بولنا ایک نہایت گھناؤنا فعل خیال کرتے تھے۔ اور اس گھوڑے کو خالی واپس آتا دیکھ کر مجھے یہ یقین نہ آتا تھا کہ یہ تمہیں گرا کر بھاگ آیا ہے۔ اس کی تربیت میرے اصطبل میں ہوئی ہے۔ یہ سرکش اور مغرور ضرور ہے۔ لیکن دھوکا دینا نہیں جانتا۔ سچ بتاؤ تم نے اپنے ہاتھوں سے اس کی لگام نہیں اُتاری اور اسے ڈرا دھمکا کر واپس نہیں بھیجا؟"

سلمیٰ نے ندامت سے آنکھیں جھکاتے ہوئے جواب دیا "اگر آپ بُرا مانتے ہیں تو وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گی۔"

"تم میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جنہیں میں بُرا جانتا ہوں۔ جنہیں ہر مسلمان بُرا جانے گا۔"

"آپ چاہیں تو میں اپنی ہر عادت بدلنے کے لئے تیار ہوں۔ مہمان کی پاسداری ہمارا فرض ہے اور آپ نے تو آج میری جان بھی بچائی ہے۔"

"تمہیں مجھے خوش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتا ہوں تمہارا خدا تم سے خوش ہو۔ تمہیں صرف وہ چیز پسند کرنی چاہیئے جو اُسے پسند ہو۔ اور ہر اُس چیز کو ناپسند کرنا چاہیئے جو اُسے ناپسند ہو۔ خدا کو عورتوں کا نیم عُریاں لباس میں مردوں کے سامنے جانا پسند نہیں۔"

سلمیٰ نے جواب دیا۔ "لباس تو میں نے آپ کے کہنے سے تبدیل کر لیا ہے؟"

ابوالحسن نے کہا "لباس سے زیادہ دل کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

خیر اب باتوں کا وقت نہیں۔ شام ہو رہی ہے۔ تمہارے والد بہت پریشان ہوں گے۔ وہ گھوڑا پہنچنے سے پہلے ہی تمہاری تلاش میں نکل گئے تھے۔"

چاندنی رات میں ابوالحسن اور سلمیٰ جنگل عبور کر رہے تھے۔ سلمیٰ گھوڑے پر سوار تھی اور ابوالحسن باگ تھامے آگے آگے جا رہا تھا۔ راستے میں سلمیٰ نے ابوالحسن کے بحری سفر، اُس کے خاندان اور اُس کے ساتھیوں کے متعلق کئی سوالات کئے۔ لیکن اُس کی توقع کے خلاف ابوالحسن کی بے اعتنائی بڑھتی گئی۔ سلمیٰ پریشان بھی تھی اور نادم بھی۔ بالآخر اُس نے کہا "آپ کو میری وجہ سے بہت تکلیف ہوئی۔ مَیں معافی چاہتی ہوں۔ آپ مجھے سزا دے لیں۔ لیکن خفا نہ ہوں یہ میرا قصور تھا اور مجھے پیدل چلنا چاہئے تھا۔ مَیں اُتر جاتی ہوں۔ آپ گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔"

اس دفعہ بھی اُس کی توقع کے خلاف ابوالحسن نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "اگر مجھے اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ تم ایک عورت ہو اور کوئی درندہ تمہیں کھا جائے گا تو مَیں یقیناً اس وقت تمہارے ساتھ چلنا گوارا نہ کرتا۔"

سلمیٰ شکست خوردہ سی ہو کر تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر بولی "اگر وہ اژدہا مجھے نگل جاتا تو آپ کو اس بات کا افسوس ہوتا؟"

"یہ صرف تمہارے لئے ہی نہیں۔ میرے سامنے اگر وہ کسی کو بھی ہلاک کر دیتا تو مجھے اُسی قدر افسوس ہوتا"

"آپ نے میرے لئے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی؟"

"ایک انسان کی جان بچانا مسلمان کا فرض ہے۔"

سلمیٰ دیر تک خاموش رہی۔ دُور سے چند گھوڑوں کی ٹاپ سُنائی دی۔ اور ابوالحسن نے کہا۔ "دیکھو وُہ ابھی تک تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں"۔

تھوڑی دیر کے بعد عبدالشمس اور اُس کے ساتھی پہنچ گئے۔ بیٹی کو سلامت دیکھ کر عبدالشمس نے واقعات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ سلمیٰ کی زبانی اژدہا کے متعلق سُن کر اُس نے ابوالحسن کا شُکریہ ادا کیا۔

(۵)

اگلے روز علی الصباح عبدالشمس اپنے مکان کی چھت پر نیم خوابی کی حالت میں لیٹے لیٹے اذان کی دلکش آواز سُن رہا تھا۔ کچھ دیر انگڑائیاں لینے کے بعد اُس نے آنکھیں کھولیں۔ سلمیٰ ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی۔ عبدالشمس اُسے جگا کر صُبح کی ہوا خوری کے ارادے سے نیچے اُتر آیا۔

ابوالحسن کے ساتھی شبنم آلود گھاس پر چادریں بچھا کر اُس کے پیچھے صف بستہ کھڑے تھے۔ ابوالحسن نے ایک دلکش آواز میں سورۂ فاتحہ کے بعد چند آیات کی تلاوت کی۔ قرآن کے الفاظ نے عبدالشمس کے دِل میں تلاطم برپا کر دیا۔ اُس کے پڑوسی عرب بھی اُس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ اور اپنی قوم کے نوجوانوں کے نئے طریقِ عبادت کو دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ رکوع و سجود کے بعد دوسری رکعت تک عبدالشمس پر ایک بے خودی سی طاری ہو چکی تھی۔ اُس نے آہستہ آہستہ نمازیوں کی طرف چند قدم اُٹھائے۔ قریب پہنچ کر جھجکا، رُکا اور جذبات کے ہیجان کی کسی رَو کے ماتحت بھاگتا

ہوا صف میں کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔ نماز کے اختتام پر ابوالحسن نے اُٹھ کر عبدالشمس کو گلے لگالیا۔ عبدالشمس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک رہے تھے۔ ابوالحسن اور اُس کے ساتھیوں نے انہیں مبارکباد دی۔

عبدالشمس نے کہا" آپ کی زبان میں ایک جادو تھا۔ مجھے کچھ اور سُنایئے۔"

ابوالحسن نے جواب دیا" یہ میری زبان نہ تھی۔ یہ خدا کا کلام تھا۔"

عبدالشمس نے کہا" بے شک یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ سُنایئے مجھے!"

ابوالحسن نے اپنے ایک ساتھی طلحہ کی طرف اشارہ کیا۔ طلحہ قرآن کا حافظ تھا۔ عرب اُس کے اردگرد بیٹھ گئے۔ طلحہ نے سورہ یٰسین کی تلاوت کی۔ قرآن کے مقدس الفاظ اور طلحہ کی دلگداز آواز سے عبدالشمس اور اُس کے ساتھیوں پر رقت طاری ہوگئی۔ تلاوت کے بعد ابوالحسن نے رسولِ کریمؐ کی زندگی اور اسلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اُنہیں اسلام کی دعوت دی۔ عبدالشمس اور اُس کے ساتھی جو ایک مدت سے عربوں کی عظمت کی داستانیں سُن کر رسولِ کریمؐ کی عظمت کا اعتراف کر چکے تھے، ابوالحسن کی تبلیغ کے بعد دینِ اسلام کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ کلمۂ توحید پڑھنے کے بعد عبدالشمس نے اپنے لئے عبداللہ کا نام پسند کیا۔

سلمیٰ ناریل کے ایک درخت کا سہارا لئے کھڑی یہ تمام واقعات دیکھ رہی تھی۔ وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی اور اپنے باپ سے کہنے لگی:۔

"ابّا! کیا عورتیں بھی مسلمان ہو سکتی ہیں؟"

اُس کے باپ نے مُسکراتے ہوئے ابوالحسن کی طرف دیکھا اور وہ بولا:۔

"خدا کی رحمت عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں ہے"۔

سلمیٰ نے کہا "تو میرا نام بھی تبدیل کر دیجئے میں بھی مسلمان ہونا چاہتی ہوں"

ابوالحسن نے کہا "تمہارا یہی نام ٹھیک ہے۔ تم فقط کلمہ پڑھ لو"

سلمیٰ نے کلمہ پڑھا اور سب نے ہاتھ اُٹھا کر اُس کے لئے دُعا کی۔

آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ اچانک موسلا دھار بارش ہونے لگی اور یہ لوگ ایک کمرے میں چلے آئے۔

دوپہر کے وقت بارش تھم گئی اور دلیپ سنگھ نے آکر خبر دی کہ مہاراج آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

ابوالحسن اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑ دلیپ سنگھ کے ساتھ ہو لیا۔

(۶)

دوپہر کے وقت ابوالحسن واپس آیا اور اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ راجہ اور بعض سرداروں نے اَور عربی گھوڑے خریدنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اِس لئے ہمارا جہاز چوتھے روز واپس روانہ ہو جائے گا۔

عبداللہ (عبدالشمس) نے انہیں کچھ دن اَور ٹھہرنے کے لئے کہا لیکن ابوالحسن نے جلدی واپس آنے کا وعدہ کر کے اجازت حاصل کر لی۔

عبداللہ نے کہا "ابھی ہمیں اسلام کے متعلق بہت کچھ جاننا ہے۔ اگر آپ طلحہ کو یہاں چھوڑ جائیں تو بہت اچھا ہو گا"

ابوالحسن نے طلحہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "اگر یہ پسند کریں تو میں انہیں خوشی سے یہاں چھوڑنے کے لئے تیار ہوں"

طلحہ نے یہ دعوت خوشی سے قبول کی۔

اگلے دن ابوالحسن کے ساتھی جہاز کے بادبانوں کی مرمت اور خورد و نوش کا ضروری سامان خریدنے کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ دلیپ سنگھ اور عبداللہ سے مشورہ کرنے کے بعد ابوالحسن نے اپنے تمام سرمائے سے آٹھ ہاتھی خرید لئے اور باقی جہاز ناریل سے بھر لیا۔

شام کے وقت ابوالحسن، عبداللہ کے باغیچے میں چہل قدمی کر رہا تھا، کہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو سلمیٰ کھڑی تھی۔ وہ چہرہ جو دو دن پہلے مسرتوں کا گہوارہ تھا، اب حزن و ملال کی تصویر بنا تھا۔ وہ آنکھیں جو اندھیری رات کے ستاروں سے زیادہ دلفریب اور چمکیلی تھیں، اب پُرنم تھیں۔

اس نے قدرے بے اعتنائی سے پوچھا "سلمیٰ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

ابوالحسن کا روکھا پن دیکھ کر ضبط کی کوشش کے باوجود اُس کے آنسو چھلک پڑے۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی ایک آواز نکلی "آپ پرسوں جا رہے ہیں؟"

"ہاں! لیکن تمہیں کیا ہوا؟ تم رو کیوں رہی ہو؟"

"کچھ نہیں — کچھ نہیں۔"

آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مغموم مسکراہٹ ابوالحسن کے دِل پر اثر کئے بغیر نہ رہی۔

اُس نے کہا "سلمیٰ! تم ابھی تک وہی ہو۔ اسلام قبول کرنے کے باوجود

میں تم میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھتا۔ تمہیں اب نامحرموں کے سامنے آنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ ایک مسلمان لڑکی کا سب سے بڑا زیور حیا ہے۔"

"آپ اب تک مجھ سے خفا ہیں۔ آپ کے کہنے پر میں لباس تبدیل کر چکی ہوں نماز پڑھ چکی ہوں۔ پرسوں سے میں نے گھر کے باہر پاؤں نہیں رکھا۔ کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں ایک مسلمان کے سامنے بھی نہ آؤں۔"

"ہاں! یہ بھی ضروری ہے۔ میں طلحہ کو یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ وہ تمہیں ایک مسلمان عورت کے فرائض سے آگاہ کرے گا۔ تمہیں اسلام کی صحیح تعلیم دے گا۔"

سلمیٰ نے جواب دیا۔ "مجھے کسی اور تعلیم کی ضرورت نہیں۔ آپ جو حکم دیں گے میں مانوں گی۔ آپ کے اشارے پر میں پہاڑ پر سے کودنے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا۔ "سلمیٰ! اگر تمہیں میری خوشی اس قدر عزیز ہے تو سنو۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا کہ تم سر سے پاؤں تک اسلام کے سانچے میں ڈھل جاؤ۔ مسلمان کی ہر نیت اور اس کے ہر فعل کو کسی انسان کی خوشی نہیں بلکہ خدا کی خوشی کا طلبگار ہونا چاہیئے۔ کلمہ پڑھنے کے بعد تم ایک ایسی دنیا میں پاؤں رکھ چکی ہو جو ایک لامتناہی جدوجہد کا گھر ہے۔ اس میدان میں کودنے والے کے دل میں آنسوؤں اور آہوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیئے۔ مسلمان کے لئے زندگی ایک بہت بڑا امتحان ہے۔ اس کے پہلو میں وہ دل ہونا چاہیئے جو خدا کی راہ میں زندگی کی بلند ترین خواہشات کو بھی قربان کرنے سے نہ گھبرائے۔ اس کا سینہ تیروں سے چھلنی ہو لیکن زبان سے آہ تک نہ نکلے۔

"تم عرب جاؤ تو یہ دیکھ کر شاید حیران ہو گی کہ مسلمان عورتیں اپنے شوہروں بھائیوں اور بیٹوں کو جہاد پر رخصت کرتی ہیں۔ لیکن اُن کی آنکھوں میں آنسو تو درکنار پیشانی پر شکن تک نہیں آتی۔ اور یہ صرف اس لئے کہ وہ خدا کی خوشی کو دنیا کی ہر خوشی پر ترجیح دیتی ہیں۔ اگر تم نے مجھے خوش کرنے کے لئے قبول اسلام کیا ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ تم اسلام کو سمجھی نہیں۔ اگر خدا کو خوش کرنا چاہتی ہو تو گھر جاؤ۔ میں طلحہ کو بھیجتا ہوں وہ آج ہی تمہیں قرآن پڑھانا شروع کر دیگا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں واپس آؤں تو تم میری پیراکی کا امتحان لینے کے لئے ساحل سے ایک میل کے فاصلے پر سمندر میں میرا استقبال نہ کرو، اور مجھے جنگلوں اور پہاڑیوں میں تمہیں تلاش نہ کرنا پڑے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو گی کہ عبدالشمس کا نام تبدیل ہونے کے بعد اُس کے گھر کا نقشہ بھی تبدیل ہو چکا ہے اور اس چار دیواری میں ایک مسلمان لڑکی پرورش پا رہی ہے۔"

سلمیٰ نے پُراُمید ہو کر پوچھا۔ "آپ کب آئیں گے؟"

"میں دِن معین نہیں کر سکتا۔ لیکن ارادہ یہی ہے کہ گھوڑے خریدتے ہی وہاں سے واپس آجاؤں۔ لیکن اگر مجھے جہاد کے لئے کہیں جانا پڑے، تو ممکن ہے کہ میں دوبارہ نہ آسکوں۔"

سلمیٰ کے چہرے پر پھر ایک بار اُداسی چھا گئی، اور اُس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں یوں نہ کہیئے۔ خدا آپ کو ضرور واپس لائے گا۔"

"تم دُعا کرتی رہو گی تو انشاءاللہ میں ضرور آؤں گا۔"

سلمیٰ نے کہا "دعا؟ آپ کیا کہتے ہیں۔ اگر میری دعا قبول ہو سکتی، تو آپ جانے کا ارادہ کیوں کرتے؟"

ابوالحسن نے اچانک محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ باتیں کر چکا ہے۔ اُس نے لہجے کو ذرا ترش بناتے ہوئے کہا "سلمیٰ جاؤ۔ اگر عرب کی تمام عورتیں تمہارے جیسی نیک دعائیں کرتیں تو اسلام کی مشعل عرب کی حدود سے باہر نہ نکلتی۔"

سلمیٰ نادم سی ہو کر واپس ہوئی۔ بار بار اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے "میں بہت بے وقوف ہوں۔ میں نے یہ کیوں کہا۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھے پر چڑھی۔ افقِ مغرب پر گرم لوہے کے سرخ تھال کی طرح چمکتا ہوا سورج پانی میں غوطہ لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں ہلکے ہلکے بادل شفق کی سرخی کی عکاسی کر رہے تھے۔ مرطوب ہوا کے جھونکے ناریل کے پتوں پر ایک دلکش راگ پیدا کر رہے تھے۔ ارد گرد کے تمام مناظر سے ہٹ کر سلمیٰ کی نگاہیں سمندر کے کنارے عربوں کے جہاز پر مرکوز ہو گئیں۔ دل میں ہیجان سا پیدا ہوا۔ اُس نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی "اے خشکی اور تری کے مالک! مجھے ایک مسلمان عورت کا ایمان دے۔ مجھے سیدھی راہ دکھا، اور جب وہ واپس آئیں مجھے دیکھ کر خفا نہ ہوں۔"

(۷)

تیسرے دن آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ سلمیٰ کوٹھے پر چڑھ کر حسرت بھری نگاہوں سے سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ساحل سے دور ابوالحسن کا جہاز موجوں پر رقص کرتا نظر آ رہا تھا۔ ہوا کے چند تیز جھونکے آئے اور بارش ہونے لگی۔ بارش

کی تیزی کے ساتھ اُس کی نگاہوں کا دائرہ محدود ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جہاز آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ ضبط کی کوشش کے باوجود اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور رخساروں پر بہتے ہوئے بارش کے قطروں کے ساتھ مل گئے۔ سلمیٰ دیر تک ہاتھ اُٹھا کر یہ دُعا دُہراتی رہی۔ "میرے مولا! اُسے سمندر کی سرکش لہروں سے محفوظ رکھیو۔"

باغیچے میں ابوالحسن سے آخری ملاقات کے بعد سلمیٰ کے خیالات اور عادات میں ایک بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ اُسے ابوالحسن کی بے اعتنائی کا بےحد ملال تھا تاہم اُسے انسانیت کا بلند ترین معیار تصوّر کرتے ہوئے وُہ اِس بات پر ایمان لاچکی تھی۔ اُس کی جو عادت ابوالحسن کو ناپسند ہے یقیناً بُری ہوگی۔ چنانچہ اُس نے دوبارہ کسی کے سامنے بےحجاب ہونے کی جرأت نہ کی۔

جب ابوالحسن اور اُس کے ساتھی بندرگاہ کی طرف روانہ ہوئے، تو اُس نے اپنے دل میں ایک زبردست کشمکش محسوس کی۔ کئی بار اُسے ابوالحسن سے چند الوداعی الفاظ کہنے کا خیال آیا۔ لیکن ہر بار ضمیر کا فیصلہ اُس کے جذبات پر غالب آیا۔ کئی بار اُس نے اپنے دل سے یہ سوال کیا۔ "کیا اُس کے دل میں تیرے لئے کوئی جگہ ہوسکتی ہے؟" ابوالحسن کی گزشتہ باتوں میں وہ اس سوال کا جواب تلاش کرتی۔ اُس کے دل پر کبھی یاس کی تاریکیاں مسلط ہوجاتیں اور کبھی اُمّید کے چراغ چمک اُٹھتے۔

عبداللہ کی آواز سُن کر وُہ نیچے اُتری۔ بوڑھے باپ نے سوال کیا "سلمیٰ! تم بارش میں اُوپر کیا کر رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں ابّا جی! میں . . . " سلمیٰ کوئی بہانہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اُسے ابوالحسن کی نصیحت یاد آگئی۔ اور وُہ بولی "میں اُن کا جہاز دیکھ رہی تھی"۔

عبداللہ نے کہا۔ "وہ تو دیر ہوئی جا چکے۔ جاؤ تم کپڑے بدل آؤ۔ طلحہ ابھی آجائے گا۔ ہم اُس سے قرآن پڑھیں گے"۔

سلمیٰ نے پُوچھا۔ "آپ اُنہیں کہاں چھوڑ آئے؟"

"وہ راستے میں زید کے گھر ٹھہر گیا تھا۔ ابھی آجائے گا"۔

چند دنوں میں طلحہ کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہُوا کہ سلمیٰ اپنی ہر بات میں ابوالحسن کی خوشی کو مقدّم سمجھنے کی بجائے خدا کی رضا کو مقدّم سمجھنے لگی۔ تاہم ہر نماز کے بعد اُس کی سب سے پہلی دُعا ابوالحسن کے لئے ہوتی۔

چھ مہینے گزر گئے، اور ابوالحسن کی کوئی خبر نہ آئی۔ سلمیٰ کی اُداسی بے چینی میں تبدیل ہونے لگی۔ وُہ صبح و شام کوٹھے کی چھت پر چڑھ کر سمندر کی طرف دیکھتی۔ بندرگاہ کی طرف آنے والا ہر نیا جہاز اُسے دُور سے ابوالحسن کی آمد کا پیغام دیتا۔ وہ اپنے خادم کو دن میں کئی بار بندرگاہ کی طرف بھیجتی۔ جب وہ مایوس نگاہوں کے ساتھ واپس آتا تو وہ بے قرار سی ہو کر پُوچھتی "تم نے اچھی طرح دیکھا تھا۔ ممکن ہے اُن میں کوئی عرب بھی ہو؟"

خادم جواب دیتا۔ "وہ جہاز فلاں جگہ سے آیا ہے۔ مَیں پُوری طرح چھان بین کر کے آیا ہوں۔ اُن میں ایک بھی عرب نہ تھا!"

وہ اُمید و بیم کے سمندر میں غوطے کھانے والے انسان کی طرح تنکوں کا سہارا لیتی اور کہتی "تم نے ملّاحوں سے پُوچھا ہوتا۔ ممکن ہے اُنہوں نے

راستے میں کسی بندرگاہ پر عربوں کا جہاز دیکھا ہو یا اُن کے متعلق سُنا ہو؟"

خادم پھر بھاگتا ہُوا بندرگاہ پر جاتا۔ سلمیٰ کی اُمنگیں پُرانی اُمیدوں کے کھنڈروں پر نئی اُمیدوں کا محل کھڑا کر لیتیں۔ بوڑھے نوکر کا افسردہ اور ملول چہرہ پھر وہی حوصلہ شکن خبر دیتا اور سلمیٰ کی اُمیدوں کا محل دھڑام سے نیچے آ رہتا۔ ہر صبح وہ اپنے دل میں اُمید کے چراغ روشن کرتی۔ جب سُورج سمندر کی لہروں میں چُھپ جاتا تو یہ چراغ بھی بُجھ جاتے۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں آہوں اور آنسوؤں میں تبدیل ہو جاتیں۔

مُدّت تک طلحہ یا اپنے باپ میں سے کسی پر اُس نے اپنے دِل کا حال ظاہر نہ ہونے دیا۔ لیکن ایک شام سلمیٰ کے طرزِ عمل نے ان دونوں کو شبہ میں ڈال دیا۔ باہر مُوسلا دھار بارش ہو رہی تھی، اور طلحہ اور عبداللہ برآمدے میں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ سلمیٰ ایک کمرے کے دریچے کے سامنے بیٹھی بارش کا منظر دیکھ رہی تھی۔ باتوں باتوں میں ابوالحسن کا ذکر آ گیا۔ عبداللہ نے کہا۔

"خدا جانے وہ اب تک کیوں نہیں آئے۔ آٹھ مہینے ہو گئے۔"

طلحہ نے کہا۔ "اگر خدا نے اُسے سمندر کے حوادث سے محفوظ رکھا ہو تو اتنی دیر اُس کے واپس نہ آنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وُہ کہیں جہاد پر چلا گیا ہے۔"

عبداللہ نے کہا۔ "آج مجھے دلیپ سنگھ نے بتایا کہ یہاں سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر مالابار کا ایک جہاز غرق ہو چکا ہے۔ صرف ایک کشتی پانچ آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچی ہے۔"

طلحہ نے پوچھا: ”اُس پر کتنے آدمی تھے؟“

”شاید بیس تھے۔ جہاز بہت بڑا تھا، اور اُس پر تجارت کا بہت سا مال تھا۔“

”جہاز کیسے غرق ہُوا؟“

”ملاح منزل قریب دیکھ کر بے پرواسے ہو گئے اور جہاز مونگے کی ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔“

سلمیٰ پاس کے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنے خیالات میں محو تھی۔ اُس نے فقط آخری فقرہ سُنا، اور ایک ثانیہ کے لئے اُس کی رگوں میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔

برآمدے سے پھر عبداللہ کی آواز آئی ”یہ چٹانیں بہت خطرناک ہیں۔ ہر سال ان کی وجہ سے کوئی نہ کوئی جہاز غرق ہو جاتا ہے۔ یہاں کے باشندوں کا خیال ہے کہ یہ چٹانیں سمندر کے دیوتا کے مندر ہیں۔“

یہ سُنتے ہی سلمیٰ کی رگوں میں ایک غیر معمولی ارتعاش پیدا ہُوا۔ وہ اُٹھی اور اپنے کمرے سے نکل کر باپ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اُس کا دہشت زدہ چہرہ اور پتھرائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر باپ نے پوچھا۔ ”بیٹی! تمہیں کیا ہُوا؟“

کچھ دیر جذبات کی شدت کی وجہ سے سلمیٰ کے مُنہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ رنج و کرب کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں ”جو کچھ تم مجھ سے چھپانا چاہتے ہو میں سُن چکی ہوں۔“

طلحہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کیوں بیٹی کیا بات ہے؟“

سلمیٰ کے بھنچے ہوئے ہونٹ کپکپائے۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں پر آنسوؤں کے باریک پردے چھا گئے۔ اُس نے کہا۔ "بتائیے کب ڈوبا اُن کا جہاز۔؟ آپ کو کس نے بتایا؟ اور وہ...... ؟ آپ خاموش کیوں ہیں؟..... خدا کے لئے کچھ کہیئے میں بُری سے بُری خبر سُننے کے لئے تیار ہوں۔" ہچکیوں اور آہوں کی شدت اُس کی آواز کے تسلسل کو توڑ رہی تھی۔

عبداللہ نے پریشان سا ہو کر جواب دیا۔ "بیٹی! ہم مالابار کے ایک جہاز کا ذکر کر رہے تھے۔ آج دلیپ سنگھ نے مجھے بتایا...... "

لیکن سلمیٰ نے عبداللہ کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا۔ "نہیں نہیں آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ مجھے جھوٹی تسلیاں نہ دیں۔" یہ کہہ کر سلمیٰ ہچکیاں لیتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

بوڑھا باپ کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ وہ طلحہ کی طرف معذرت طلب نگاہوں سے دیکھتا ہوا اُٹھا اور سلمیٰ کے کمرے میں چلا گیا۔ سلمیٰ مُنہ کے بل بستر پر لیٹی ہچکیاں لے رہی تھی۔

بوڑھے باپ کا دِل بھر آیا۔ اور اس نے قریب بیٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی کیا ہو گیا تمہیں؟"

سلمیٰ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنسو پونچھے، اور ہچکیاں ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ "کچھ نہیں ابا! مجھے معاف کرنا۔ آئندہ آپ مجھے کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھیں گے۔"

"لیکن رونے کی کوئی وجہ بھی تو ہو؟ ایسی خبریں تو ہم ہر روز سنا کرتے ہیں۔

آخر مالابار کا ایک جہاز غرق ہو جانے کی خبر میں کیا خصوصیت تھی؟"
سلمیٰ نے غور سے اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا اور قدرے مطمئن ہو کر بولی:"آپ سچ کہتے ہیں!"
عبداللہ نے برہم ہو کر کہا:"آخر مجھے جھوٹ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ آج تک تم نے میری کسی بات پر شک نہیں کیا۔ اگر مجھ پر یقین نہیں آتا تو طلحہ سے پوچھ لو۔"
سلمیٰ نے ندامت سے سر جھکا لیا، اور کہا:"ابا جان! میں معذرت چاہتی ہوں۔ میں سمجھی تھی کہ . . . . شاید آپ عربوں کے جہاز کا ذکر کر رہے ہیں۔"
"بیٹی! کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ خدانخواستہ اگر میں اُن کے جہاز کے متعلق ایسی خبر سنتا تو مجھے تم سے کم صدمہ ہوتا؟"
شام کے کھانے کے بعد طلحہ، عبداللہ اور عبداللہ کا خادم عشا کی نماز ادا کر رہے تھے۔ خادمہ برتن صاف کر رہی تھی۔ اتنے میں کسی نے باہر کے پھاٹک پر دستک دی۔ سلمیٰ نے خادمہ سے کہا:"شاید زید اور قیس آئے ہیں، تم نے باہر کا دروازہ بند تو نہیں کر دیا تھا؟"
خادمہ نے جواب دیا:"ایسی بارش میں کون آسکتا ہے۔ میں ابھی بند کر کے آئی ہوں۔ اگر انہیں آنا ہوتا تو مغرب کی نماز کے لئے نہ آتے؟ اور ہاں زید تو بیمار ہے۔ قیس بیچارا بوڑھا ہے۔ اُس نے گھر ہی پر نماز پڑھ لی ہوگی۔"
"لیکن پھر بھی کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے!"
"یہ آپ کا وہم ہے۔ دروازہ ہوا سے ہل رہا ہے۔"

"نہیں میں کسی کی آواز بھی سُن رہی ہوں۔ شاید . . . . مَیں جاتی ہوں۔"

سلمیٰ کا دِل دھڑک رہا تھا۔ تاریکی میں ایک قدم آگے دیکھنا محال تھا۔ وُہ بجلی کی چمک میں درختوں سے بچتی ہوئی پھاٹک تک پہنچی۔

پھاٹک سے باہر کوئی آہٹ نہ پا کر اُس کا دِل بیٹھ گیا۔ وُہ مایوس ہو کر واپس ہونے کو تھی کہ کسی نے دروازے کو زور زور سے دھکّے دیتے ہوئے آواز دی۔ "کوئی ہے؟" ایک آن کے لئے سلمیٰ کے پاؤں زمین میں پیوست ہو کر رہ گئے۔ پھر وُہ لپک کر آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ سلمیٰ کے سامنے ایک بلند قامت انسان کھڑا تھا۔ دروازہ کھُلتے ہی اُس نے سوال کیا۔ "کیا یہ عبداللہ کا گھر ہے؟"

پیشتر اس کے کہ سلمیٰ کوئی جواب دیتی۔ بجلی چمکی اور ابوالحسن سلمیٰ کو پہچان کر اندر داخل ہوا۔

ابوالحسن نے کہا۔ "اوہو تُم! مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میری وجہ سے تمہیں بارش میں بھیگنا پڑا۔"

سلمیٰ نے اپنے دِل میں کہا۔ "کاش! تم یہ جان سکتے کہ اِس بارش کی بُوندیں کس قدر خوشگوار ہیں۔" اور پھر ابوالحسن سے مخاطب ہو کر بولی۔ "چلیئے۔"

برآمدے میں طلحہ اور عبداللہ ابوالحسن کی آواز سُن کر اُس کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ عبداللہ نے آواز دی۔

"کون! ابوالحسن؟"

ابوالحسن نے برآمدے کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں مَیں ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ مَیں نے خواہ مخواہ اس وقت آپ کو تکلیف دی۔"

طلحہ نے پوچھا۔ کہئے خیریت ہے نا! آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟"

"ہاں خیریت ہے۔ میں اُن سب کو جہاز پر چھوڑ آیا ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں تک پہنچنے کے لئے مجھے اتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ راستے میں ایک دفعہ پھسلا، دو مرتبہ ندی میں گرا۔ پانچ چھ مکانات کو آپ کا مکان سمجھ کر آوازیں دیں۔ ایک گھر سے چند فرض شناس کتوں نے میرا استقبال کیا۔"

عبداللہ نے سلمیٰ کو آواز دی۔ سلمیٰ ابھی تک بے خودی کے عالم میں برآمدے سے باہر کھڑی تھی۔

آج بھی بارش کے قطرے اُس کے رخساروں کے آنسو دھو رہے تھے۔ لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ باپ کی آواز سن کر وہ چونکی اور بھاگتی ہوئی برآمدے میں داخل ہوئی۔ "کیا ہے ابا جان؟"

"بیٹی جاؤ، ان کے لئے کھانا اور کپڑوں کا جوڑا لے آؤ۔ اور باقی مہمانوں کے لئے بھی کھانا تیار کراؤ۔ میں انہیں بلانے کے لئے جاتا ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا۔ "کھانا ہم سب کھا چکے ہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔"

کپڑے بدلنے کے بعد ابوالحسن، عبداللہ اور طلحہ سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اُس نے دیر سے واپس آنے کی یہ وجہ بیان کی کہ بصرہ سے اُسے افریقہ کی ایک مہم میں شریک ہونے کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔

ساتویں دن عبداللہ کی رضامندی نے سلمیٰ اور ابوالحسن کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا۔

(۸)

تین سال کے بعد ابوالحسن اس شہر میں اپنے لئے ایک خوبصورت مکان، اور اُس کے قریب ایک مسجد تعمیر کروا چکا تھا۔ اُس کی دیکھا دیکھی اُس کے چند ساتھی بھی اس شہر میں آباد ہو گئے۔ پانچ سال کے عرصہ میں ابوالحسن اور طلحہ کی تبلیغ سے مقامی باشندوں کے چند گھرانے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے اور ابوالحسن نے مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک مدرسہ تعمیر کر کے درس و تدریس کے فرائض طلحہ کے سپرد کئے۔

ابوالحسن کی بدولت اُس کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ شادی کے دوسرے سال اُس کے ہاں ایک لڑکا اور چوتھے سال ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکے کا نام اُس نے خالد اور لڑکی کا نام ناہید رکھا۔ دسویں سال ایک اور لڑکا پیدا ہوا لیکن تین ماہ کی عمر میں والدین کو داغِ مفارقت دے کر چل بسا۔

جب خالد کی عمر سات اور ناہید کی عمر پانچ برس تھی، سلمیٰ کے باپ نے چند دن موسمی بخار میں مبتلا رہ کر داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

ابوالحسن کو دُنیا کی ہر نعمت میسّر تھی۔ اُس کے پاس مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ اُسے اپنے بیوی بچوں سے بے انتہا محبّت تھی۔ لیکن یہ محبت اُسے گھر کی چار دیواری میں پابندِ سلاسل نہ رکھ سکی۔ وہ قریباً ہر سال فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے ایک طویل بحری سفر کے کٹھن منازل طے کرتا۔ پانچ دفعہ اُس نے ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ میں جہاد کرنے والی افواج کا ساتھ دیا۔

ہر بار جہاد اور حج سے واپس آنے کے بعد وہ فنونِ حرب اور مذہبی تعلیم میں اپنے بچوں کا امتحان لیتا۔ خالد تیر اندازی، شاہسواری، تیغ زنی اور فنِ جہازرانی

کی تعلیم میں اپنے باپ کی بہترین توقعات پوری کر رہا تھا۔

ناہید بارہ سال کی عمر تک تیر اندازی کے علاوہ سرکش گھوڑوں پر سوار ہونا سیکھ چکی تھی۔ پڑھنے لکھنے میں بھی طلحہ کو اُس کی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف تھا۔

راجہ کے ساتھ ابوالحسن کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ مہارانی ایک مُدت سے سلمیٰ کی سہیلی بن چُکی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ پالکی بھیج کر ماں اور بیٹی کو اپنے محل میں بُلاتی۔ راجکماری ناہید سے اس حد تک مانوس ہو چکی تھی کہ خود بھی کبھی کبھی ابوالحسن کے گھر چلی آتی۔

راجکمار عمر میں خالد سے چار سال بڑا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ خالد کو ہر بات میں قابلِ تقلید سمجھتا۔

ایک دن دلیپ سنگھ نے راجہ کے سامنے فنونِ حرب میں خالد کی غیر معمولی استعداد کی تعریف کی۔ راجہ نے پُوچھا۔ "کیا وہ ہمارے راجکمار کا مقابلہ کر سکے گا؟"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "مہاراج ہمارے راجکمار نازوں کے پلے ہیں۔ اور وُہ ایک سپاہی کا بیٹا ہے۔"

"لیکن وہ بہت چھوٹا ہے۔"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "مہاراج! اگر عرب مائیں بچپن میں اپنے بچوں کی اس طرح تربیت نہ کرتیں تو آج وہ آدھی دُنیا پر قابض نہ ہوتے۔ مَیں نے سُنا ہے کہ عرب مائیں چودہ چودہ سال کے بچوں کو میدانِ جنگ میں بھیج دیتی ہیں۔"

راجہ نے پُوچھا: "خالد کی عمر کیا ہے؟"

"مہاراج! یہی کوئی بارہ سال ہوگی۔"

"آخر اُن بچّوں میں کیا خُوبی ہے جو ہمارے بچّوں میں نہیں ؟"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا" مہاراج اگر بُرا نہ مانیں تو مَیں عرض کروں "

راجہ نے کہا" کہو "

" مہاراج! ہم میں اور اُن میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ہم بے شمار دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ اِن دیوتاؤں کے علاوہ دُنیا کی ہر وُہ طاقت جو ہمیں خوفزدہ کر سکتی ہے ہماری نگاہوں میں دیوتاؤں کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ مثلاً ہماری راہ میں اگر کوئی دشوار گزار پہاڑ آجائے تو ہم اپنی قوتِ تسخیر کے امتحان کی بجائے اُسے دیوتا سمجھ کر اُس کی پُوجا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ صرف ایک خدا کو مانتے ہیں اور اُس کے سوا رُوئے زمین کی کسی بڑی سے بڑی قوت کے سامنے سر جھکانا گناہ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کا ایمان ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا۔ بلکہ مَوت کے بعد اُس کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ابوالحسن نے مجھے ایک دن بتایا تھا کہ جب خالد، اُن کا بہت بڑا سپہ سالار، شام کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا، تو شام کے گورنر نے اُسے لکھا کہ تم پہاڑ سے ٹکر لگا رہے ہو، تمہارے چالیس ہزار سپاہیوں کے مقابلے میں میرے پاس اڑھائی لاکھ ایسی فوج ہے جو بہترین ہتھیاروں سے مسلح ہے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کے سپہ سالار نے لکھا کہ مجھے تمہاری طاقت معلوم ہے۔ لیکن تم شاید یہ نہیں جانتے کہ تمہارے سپاہیوں کے دلوں میں جس قدر زندہ رہنے کی تمنّا ہے، میرے سپاہیوں کے دلوں میں مَوت کی تمنّا اُس سے کہیں زیادہ ہے "

راجہ نے کہا۔" دلیپ سنگھ! مَیں یہ چاہتا ہوں کہ راجکمار کی سپاہیانہ تربیت

ابوالحسن کو سونپ دی جائے۔ تم اُس سے ملو۔ اگر وُہ یہ خدمت قبول کرے تو ہم اُسے ایک معقول معاوضہ دینے کے لئے تیار ہیں۔"

دلیپ سنگھ کے کہنے پر ابوالحسن نے راجہ کی یہ دعوت خوشی سے قبول کی لیکن معاوضہ لینے سے انکار کر دیا۔

دو سال کی تربیت کے بعد ابوالحسن نے راجہ سے کہا "اب آپ کا بیٹا فنونِ سپہ گری میں آپ کے مُلک کے بہترین نوجوانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔"

راجہ نے پُوچھا "مَیں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ تیر اندازی اور شاہسواری میں خالد کا مدِّ مقابل ہے یا نہیں؟"

ابوالحسن نے جواب دیا "خالد نے اُس عمر میں تیر و کمان سنبھالا تھا جب آپ کا راجکمار کھلونوں سے دِل بہلایا کرتا تھا۔ اور اُس عمر میں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنا سیکھا تھا جس عمر میں راجکمار کو نوکر کندھوں پر اُٹھائے پھرتے تھے۔ خالد فطرتاً ایک سپاہی ہے اور راجکمار فطرتاً ایک شہزادہ۔"

"اور راجکمار تیغ زنی میں کیسا ہے؟"

"وہ خالد سے عمر میں بڑا ہے۔ اُس کے بازُو بھی اُسی قدر مضبوط ہیں۔ مَیں نے دونوں کا مقابلہ کرا کے نہیں دیکھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وُہ خالد کی نسبت زیادہ آسانی سے تلوار گھُما سکتا ہے۔"

راجہ نے ولی عہد کو بُلا کر پُوچھا "کیوں راجکمار تم اپنے اُستاد کے بیٹے سے تلوار کے دو ہاتھ دکھانے کے لئے تیار ہو؟"

راجکمار نے جواب دیا "نہیں پتاجی۔ وُہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اگر

مَیں ہار گیا، مجھے شرم آئے گی اور وہ ہار گیا تو بھی مجھے ہی شرم آئے گی۔"

(۹)

ابوالحسن کی شادی کو اٹھارہ برس گزر چکے تھے۔ خالد کی عمر سولہ اور ناہید کی عمر چودہ برس تھی۔ خلیفہ ولید کی مسند نشینی کے ساتھ مسلمانوں کی نئی فتوحات کا آغاز ہو چکا تھا۔

ایک دِن سندھی تاجروں کا ایک جہاز آیا۔ اُن کے ساتھ عمان کا ایک عیسائی بھی تھا۔ سندھ کے تاجروں نے جزیرے کے عربوں سے ترکستان اور شمالی افریقہ میں مسلمانوں کی شاندار فتوحات کا ذِکر کیا۔ عمان کے تاجر نے اِن تمام باتوں کی تصدیق کی۔ ابوالحسن اور اُس کے چند ساتھی حج کے لئے تیار تھے۔ اب حج کے ارادوں کے ساتھ شوقِ جہاد بھی شامل ہو گیا۔

راجہ باہر سے آنے والے تاجروں کی زبانی نئے ممالک کی خبریں نہایت دلچسپی سے سُنا کرتا تھا۔ مسلمانوں کی تازہ فتوحات کی خبریں سُن کر اُس نے ابوالحسن کو بلایا۔ اور مسلمانوں کے خلیفہ اور عراق کے گورنر کو سونے اور جواہرات کے چند تحائف بھیجنے کی خواہش ظاہر کی۔

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "مَیں خوشی سے آپ کے تحائف اُن کے پاس لے جاؤں گا۔"

سندھ کے تاجروں نے اپنا مال فروخت کیا اور نیا مال خرید کر لوٹ گئے۔ اُن کے جانے کے چند دن بعد ابوالحسن اور اُس کے ساتھی سفرِ حج کے لئے تیار ہو گئے۔ اِس سال سراندیپ کے نومسلموں کے علاوہ حج پر جانے

والے عربوں کی تعداد بھی خلافِ معمول زیادہ تھی۔

فقط طلحہ اور اُس کے علاوہ تین اور عرب تاجر حج پر جانے والوں کے گھروں کی دیکھ بھال کے لئے پیچھے رہ گئے۔ بعض عرب اپنے کمسن بچّوں کو طلحہ کی حفاظت میں چھوڑ کر بیویوں کو ساتھ لے گئے۔ اور بعض اپنے اہل و عیال کو گھروں میں چھوڑ گئے۔

ابو الحسن اپنی بیوی اور بچّوں کو ساتھ لے جانے کا وعدہ کر چکا تھا لیکن سفر سے تین دِن قبل سلمیٰ اچانک بیمار ہو گئی اور اُسے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

خالد عقاب کے اُس بچے کی طرح جو پَر نکلنے کے بعد گھونسلے میں پھڑپھڑا رہا ہو، میدانِ عمل میں اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کے لئے بے قرار تھا۔ لیکن سلمیٰ کی علالت نے اُسے گھر پر ٹھہرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ ابو الحسن نے وعدہ کیا کہ وہ واپس آتے ہی اُسے عرب کی سیاحت کے لئے بھیج دے گا۔

رُخصت کے دن سلمیٰ کو سخت بخار تھا۔ لیکن وُہ انتہائی تکلیف کے باوجود بستر پر نہ لیٹی۔ شوہر کو الوداع کہنے سے پہلے اُس نے سراپا التجا بن کر کہا۔ "دیکھئے مَیں بالکل تندرست ہوں۔ مجھے ساتھ لے چلئے۔ اپنے وعدے نہ بھولئے"۔

ابو الحسن نے مغموم سا ہو کر جواب دیا۔ "نہیں سلمیٰ! جہاز پر موسمی بخار تمہیں بہت تکلیف دے گا۔ تم تندرست ہو جاؤ گی تو مَیں دُوسرے سفر میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ دیکھو مَیں تمہاری تیمارداری کے لئے خالد اور ناہید کو چھوڑ کر جا رہا ہوں طلحہ بھی تمہارا خیال رکھے گا"۔

اُس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں! مجھے ضرور

لے چلیئے۔ مَیں آپ کے ساتھ ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا۔"سلمیٰ! ضد نہ کرو۔ دیکھو تمہاری نبض کس قدر تیز ہے۔ بخار سے تمہارا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے۔ تم نے کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا۔ مَیں جلد واپس آجاؤں گا۔"

"نہیں۔ اِس دفعہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا سفر بہت لمبا ہے اور مَیں شاید دیر تک انتظار نہ کر سکوں گی۔"

ابوالحسن نے مغموم صُورت بنا کر جواب دیا۔"سلمیٰ! تم رو رہی ہو۔ کئی برس ہوئے مَیں نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ مسلمان عورتیں مجاہدوں کی رُخصت کے وقت آنسو نہیں بہاتیں۔"

اِن الفاظ نے سلمیٰ پر جادُو کا سا اثر کیا۔ اُس نے آنسو پُونچھ ڈالے اور مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔"میرے اِس درجہ مغموم ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ جا رہے ہیں بلکہ یہ تھی کہ آپ مجھے یہاں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ اگر ایک بار مجھے میدان میں لے جاتے تو پھر شاید مجھے کمزوری کا طعنہ نہ دیتے۔ مَیں آپ کے ساتھ تیروں کی بارش میں کھڑی ہو سکتی ہوں لیکن آپ کے انتظار میں ہر روز صبح و شام کوٹھے کی چھت پر چڑھ کر سمندر کی طرف دیکھنا میرے لئے صبر آزما ہے۔"

ابوالحسن نے جواب دیا۔"اور یہی صبر عورتوں کا جہاد ہے۔ جو کام مردِ میدان میں نہیں کر سکتے، وُہ عورتیں گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر کر سکتی ہیں۔ عورتیں خالد اور مثنیٰ نہیں بن سکتیں۔ لیکن اُن کی ماؤں کا رُتبہ حاصل کر سکتی ہیں۔

آج ہمارے سپاہی اپنے گھروں سے کوسوں دُور لڑ رہے ہیں۔ اور اُن کے عزائم وہ عورتیں بلند رکھتی ہیں جو صبر و استقلال سے گھروں میں ماؤں بہنوں اور بیویوں کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ اُن پر اعتماد کی بدولت اُن کے دِل میں یہ خیال بے چینی پیدا نہیں کرتا کہ گھر پر اُن کے ننھے بھائیوں اور بچوں کا کیا حال ہوگا۔ سلمیٰ تم ہی بتاؤ، کیا وہ سپاہی جسے یہ خیال ہو کہ اُس کی بیوی رو رو کر اندھی ہو گئی ہوگی اور بچے گلیوں میں ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے ایک بہادر کی طرح مسکرا کر جان دے سکتا ہے؟ فرض کرو اگر میں نہ آؤں تو تم عرب کی دوسری ماؤں کی طرح خالد کو جہاد پر رخصت نہ کرو گی؟"

سلمیٰ نے جواب دیا۔ "آپ یقین رکھئے کہ اگر آپ خالد کے لئے ایک بُرا باپ بننا گوارا نہیں کرتے تو میں بھی ایک بُری ماں بننا پسند نہ کروں گی۔"

شام کے وقت ابوالحسن کا جہاز روانہ ہوا۔ سلمیٰ ناہید کے ساتھ چھت پر کھڑی سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ضبط کے باوجود اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ناہید نے کہا۔ "امّی جان! آپ نے ابّا جان سے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمارے سامنے آنسو نہ بہائیں گی۔"

سلمیٰ نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "بیٹی! کاش یہ میرے بس کی بات ہوتی۔ تمہارے باپ کے مقابلے میں میرا دل بہت کمزور ہے۔"

سلمیٰ یہ کہہ کر نیچے بیٹھ گئی۔ ناہید نے اُس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "امّی! آپ کو ابھی تک بخار ہے۔ آپ بستر پر لیٹ جائیں۔"

سراندیپ کے دربار میں!

(۱)

مہاراجہ سراندیپ تخت پر رونق افروز تھا۔ تخت سے نیچے دائیں بائیں آبنوس کی کرسیوں پر چند سردار حسب مراتب بیٹھے تھے۔ راجہ کے دائیں ہاتھ سب سے پہلی کرسی راج کمار اُودھے رام کی تھی۔ راج کمار ایک خوش شکل اور بارعب نوجوان تھا۔ کرسیوں کے پیچھے دو قطاروں میں چند عہدہ دار ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ چوبدار دربار میں داخل ہوا۔ اور رسمی آداب بجا لانے کے بعد بولا "مہاراج! دلیپ سنگھ حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔"

راجہ پریشان سا ہو گیا۔ اور بولا "دلیپ سنگھ آگیا؟ ابوالحسن اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟"

چوبدار نے جواب دیا "مہاراج! اُن میں سے اُس کے ساتھ کوئی نہیں۔ ایک عرب نوجوان ہے اور وہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔"

راجہ نے بیقرار سا ہو کر کہا "بلاؤ انہیں جلدی کرو۔"

چوبدار کے واپس آنے سے تھوڑی دیر بعد دلیپ سنگھ ایک بیس بائیس سالہ عرب نوجوان کے ہمراہ داخل ہوا۔ دلیپ سنگھ کے ہاتھوں میں چاندی کا ایک

طشت تھا جس میں ایک خنجر تھا۔ جس کے دستے میں مختلف رنگوں کے جواہرات جڑے تھے، اور سونے کی ایک ڈبیا چمک رہی تھی۔ وہ دروازے اور تخت کے درمیان مختلف مقامات پر تین بار جھکا۔ پھر آگے بڑھا اور راجہ کے سامنے طشت رکھنے کے بعد ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اِس دَوران میں راجہ، ولی عہد اور باقی حاضرینِ دربار کی نگاہیں زیادہ تر اُس کے نوجوان ساتھی پر مرکوز رہیں۔

یہ زمانہ جس سے ہماری داستان تعلق رکھتی ہے۔ عرب کے صحرا نشینوں کی تاریخ کا سُنہری زمانہ تھا۔ اسلام کے فتوحات کے سیلاب کی موجوں کے سامنے اس سے کئی سال قبل کُفر کے مضبوط ترین قلعوں کی دیواریں کھوکھلی ہو چُکی تھیں اور اب ایک زبردست ریلا انہیں خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہا تھا۔ تُرکستان، آرمینیا اور شمالی افریقہ کے میدانوں میں اُن کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ فتوحات کے سیلاب کی ایک لہر مشرق میں مکران تک پہنچ چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قرب و جوار کے ممالک کے باشندے ہر عرب کے چہرے پر سکندر کا بخت، ارسطو کی فراست اور سلیمان کا جاہ و جلال دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ رُوئے زمین کی ایک فرومایہ قوم اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر دُنیا کی نگاہوں میں وہ بلندی حاصل کر چُکی تھی جو آج تک کسی قوم کو نصیب نہیں ہوئی۔

سیلون (سراندیپ) کے راجہ کے دربار میں وُہ نوجوان کھڑا تھا جس کے آبا و اجداد یرموک اور قادسیہ کی جنگوں میں مشرق اور مغرب کی دو عظیم ترین

سلطنتوں کی عظمت خاک میں ملا چکے تھے، وُہ اُن نوجوانوں میں سے تھا جن کی صورت دیکھنے کے بعد کسی کو اُن کی سیرت کے متعلق تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی راجہ اور اُس کے درباری ایک ہی نظر میں اُس کی صورت اور سیرت کی ہزاروں خوبیوں کے معترف ہو چکے تھے۔ وہ بے پروائی سے قدم اُٹھاتا ہُوا آگے بڑھا اور دیکھنے والوں کی نگاہیں اُس کے جسم کی ہر جنبش میں ایک غایت درجہ کی خود اعتمادی دیکھنے لگیں۔ اُس کے ہونٹوں کو جنبش ہُوئی اور تمام حاضرین ہمہ تن گوش بن گئے۔ کچھ دیر "السلام علیکم" کے الفاظ راجہ اور درباریوں کے کانوں میں گونجتے رہے۔ راج کمار "وعلیکم السلام" کہہ کر مسکراتا ہُوا اُٹھا اور تمام سردار اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ راج کمار نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور سردار دربار کے آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے باری باری آگے بڑھ کر اُس سے مصافحہ کرنے لگے۔ راجکمار نے اُسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ اور ٹوٹی پھوٹی عربی میں اُس سے باتیں کرنے لگا۔

راج کمار نے پوچھا "آپ کا نام؟"

نووارد نے جواب دیا "زبیر"

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"بصرہ سے"

"ابوالحسن اور اُن کے ساتھیوں کا پتہ چلا؟"

زبیر نے جواب دیا "نہیں، مجھے ڈر ہے کہ وہ راستہ میں کسی حادثہ کا شکار ہو چکے ہیں"

راج کمار کے چہرے پر پژمردگی چھا گئی۔

راجہ کچھ دیر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اُسے راجکمار کی باتوں پر خوش ہونا چاہئے یا ناراض۔ حاضرینِ تخت کی بجائے اُن دو کرسیوں کی طرف دیکھ رہے تھے، جن پر راجکمار اور عرب نوجوان رونق افروز تھے، اور راجہ کے لئے یہ نئی بات تھی، لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کے منہ سے عربی کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سُننے کی مسرت اِس تلخی پر غالب آرہی تھی۔ بالآخر اُس نے کہا "ہم آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں"

زبیر نے جواب دیا "شکریہ اسراندیپ کے راجہ کو ہمارے خلیفہ اور والیِ عراق سلام کہتے ہیں"

یہ فقرہ نصف عربی اور نصف سراندیپ کی زبان میں ادا کیا گیا۔ راجہ اور ولی عہد کی مُسکراہٹ دیکھ کر تمام درباری ہنس پڑے۔

راجہ نے کہا "آپ نے ہماری زبان کہاں سے سیکھی؟"

زبیر نے دلیپ سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "یہ میرے اُستاد ہیں"

راجہ اور درباریوں نے دلیپ سنگھ کو پہلی دفعہ توجہ کا مستحق سمجھا۔ راجہ نے کہا "ہاں دلیپ سنگھ، ابوالحسن کا کچھ پتہ نہیں چلا؟"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا "مہاراج اِس سال ہمارے مُلک کا کوئی جہاز عرب کی کسی بندرگاہ تک نہیں پہنچا۔ بصرہ، مکہ، مدینہ اور دمشق میں ہر جگہ اُن میں سے کسی نہ کسی کے رشتہ دار موجود تھے۔ لیکن سب نے یہی بتایا کہ وُہ حج پر نہیں پہنچے۔ واپسی پر مَیں ہر بندرگاہ سے اُن کا سُراغ لگاتا آیا ہوں۔ لیکن ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے ساحل کے قریب اُن کا جہاز کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔ مہاراج نے دمشق کے بادشاہ اور عراق کے حاکم کو جو تحالف بھیجے تھے وہ بھی اُن کے پاس نہیں پہنچے۔ پھر بھی وہ آپ کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ میں اُن کی طرف سے یہ تحالف آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔ اِس سونے کی ڈبیا میں ایک ہیرا ہے، یہ دمشق کے بادشاہ نے بھیجا ہے اور یہ خنجر عراق کے حاکم نے۔ میں عربی نسل کے آٹھ گھوڑے بھی لایا ہوں۔ چار سفید ہیں جو بادشاہ نے دیئے ہیں اور چار مشکی ہیں جو عراق کے حاکم نے بھیجے ہیں۔ انہیں شاہی اصطبل میں پہنچا دیا گیا ہے۔"

راجہ نے جھک کر ڈبیا اُٹھائی اور کھول کر کچھ دیر چمک دار ہیرا دیکھنے کے بعد خنجر اُٹھا کر اُس کے دستے کی تعریف کرتا رہا۔ اُس کے بعد اُس نے دونو تحفے راجکمار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو راجکمار! یہ تحفہ اُس بادشاہ کا ہے جس کا لوہا ہر لوہے کو کاٹتا ہے۔ جس کی سلطنت میں کئی دریا، کئی پہاڑ اور کئی سمندر ہیں، جس کے سپاہی پتھر کے قلعوں کو مٹی کے گھروندے سمجھتے ہیں، اور گھوڑوں پر سوار ہو کر دریاؤں کو عبور کرتے ہیں۔ اور یہ خنجر مجھے عراق کے حاکم نے بھیجا ہے جس کے نام سے بڑے بڑے بادشاہ کانپتے ہیں۔"

راجکمار کسی اور خیال میں تھا۔ اُس نے یہ دونوں چیزیں بے پروائی سے دیکھیں اور وزیر کے ہاتھوں میں تھما دیں۔ یہ تحالف جنہیں سراندیپ کا سادہ دل راجہ رُوئے زمین کے تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی سمجھتا تھا، یکے بعد دیگرے تمام درباریوں کے ہاتھوں میں گردش کرنے کے بعد پھر راجہ کے پاس پہنچ گئے۔

وہ کبھی خنجر کا دستہ ٹٹولتا اور کبھی ڈبیا کھول کر دیکھتا۔ بالآخر اُس نے زبیر کی طرف دیکھا اور کہا ”میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے تمہارے بادشاہ کو دیکھوں“۔

زبیر نے کہا ”ہمارا کوئی بادشاہ نہیں“۔

راجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ابوالحسن بھی یہی کہا کرتا تھا کہ مسلمان کسی کو بادشاہ نہیں بناتے۔ آہ! بے چارا کتنا اچھا آدمی تھا۔ تلوار کا دھنی، بات کا پکا۔ اُس کی لڑکی کو کس قدر صدمہ ہو گا۔ اور وہ عبدالرحمٰن اور یوسف کس قدر شریف تھے۔ بھگوان جانے یہ خبر سُن کر اُن کے بال بچوں کی کیا حالت ہو گی آپ اُن سے ملے ہیں؟“

”جی نہیں۔ میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں“ زبیر نے اپنی جیب سے ایک خط نکال کر راجہ کو پیش کرتے ہوئے کہا ”یہ خط مجھے بصرہ کے حاکم نے دیا ہے“۔

راجہ نے ویرپ سنگھ کو اشارہ کیا۔ دلیپ سنگھ نے زبیر سے خط لے لیا، اور اُسے کھول کر ترجمہ سُنانے لگا:

”مہاراج کو والیٔ بصرہ سلام کہتے ہیں۔ وہ عرب تاجروں کی بیواؤں اور یتیم بچوں کے ساتھ مہاراج کے نیک سلوک کے ممنون ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ مہاراج ان بیواؤں اور یتیم بچوں کو بصرہ پہنچا دینے کا بندوبست کریں۔ وہ آپ کے ایلچی کے ساتھ اپنی فوج کے ایک سپہ سالار زبیر کو ایک جہاز دے کر بھیج رہے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ بہت جلد اُن کی روانگی کا بندوبست کریں گے والیٔ بصرہ کا خیال ہے کہ ابوالحسن اور اُس کے ساتھی ہندوستان کے مغربی ساحل

پر کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔ اگر یہ پتہ چلا کہ اُن کا جہاز کسی علاقہ کے بحری لٹیروں نے غرق کیا ہے تو انہیں سزا دینے میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہوگی۔"

خط کا مضمون سننے کے بعد راجہ گردن جھکائے دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ زبیر نے راجکمار کی طرف دیکھا۔ وہ آبدیدہ ہو کر چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زبیر نے کہا۔ "آپ بہت پریشان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ابوالحسن کے ساتھ بہت اُنس تھا؟"

راجکمار کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اُس نے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھا اور کوئی بات کہے بغیر عقب کے کمرہ میں چلا گیا۔

راجہ کو بذاتِ خود ابوالحسن کے ساتھ دلی لگاؤ تھا۔ اُس کی موت کی خبر اُس کے لئے کم المناک نہ تھی۔ لیکن مسلمانوں کے خلیفہ کے ایلچی کی موجودگی کا احساس اُسے انتہائی ضبط سے کام لینے پر مجبور کر رہا تھا۔ راجکمار کے اُٹھ جانے کے بعد اُس نے زبیر اور ولیپ سنگھ کے سوا تمام درباریوں کو رخصت کا حکم دیا۔ اور زبیر سے کہا۔ "راجکمار کو ابوالحسن کے ساتھ بے حد اُنس تھا۔ میں بھی اُسے اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ مجھے اُس کی موت کا بہت دکھ ہے۔ لیکن یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اور اُس کے ساتھی مر چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہیں راستے میں بحری ڈاکوؤں نے گرفتار کر لیا ہو۔ مجھے سب سے زیادہ بے چاری ناہید کا دکھ ہے۔ ابھی وہ اپنی ماں کا غم نہیں بھولی۔ اب یہ صدمہ اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگا۔"

زبیر نے سوال کیا۔ "ناہید کون ہے؟"

راجہ نے جواب دیا۔ "وہ ابوالحسن کی اکلوتی بیٹی ہے۔ مَیں بھی اُسے اپنی ہی بیٹی سمجھتا ہوں۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔" اس کے بعد راجہ دلیپ سنگھ کی طرف متوجہ ہُوا۔ "دلیپ! انہیں مہمان خانے میں لے چلو۔ اِس بات کا خیال رکھنا کہ اُنہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ مَیں راجکماری کو اُن بچّوں کو تسلی دینے کے لئے بھیجتا ہوں۔"

زبیر نے کہا۔ "مَیں سیدھا آپ کے پاس چلا آیا تھا۔ اُن بچّوں کو ابھی تک نہیں دیکھا۔"

"بہت اچھا۔ دلیپ سنگھ انہیں اُن کے پاس لے جاؤ۔"

(۲)

محل کے دروازے پر دلیپ سنگھ اور زبیر کو اُنیس بیس برس کا ایک نوجوان ملا۔ اُس نے دلیپ سنگھ کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ ابّا کا جہاز جدّہ نہیں پہنچا؟"

دلیپ سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر اُسے گلے لگالیا اور کہا۔ "خالد! میں ہر شہر اور ہر بندرگاہ میں اُنہیں تلاش کرچکا ہوں لیکن اُن کا کوئی پتہ نہیں چلا۔"

خالد نے کہا۔ "مَیں ابھی بندرگاہ سے ہوکر آیا ہوں۔ عرب کے چند جہازران کہتے تھے کہ اُن کا جہاز سندھ کے ساحل کے قریب غرق ہوچکا ہے۔ آپ دیبل کے حاکم سے معلوم کرتے، شاید کوئی سُراغ مل جاتا۔"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "سندھ کا راجہ اور اُس کے اہلکار بہت مغرور

ہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ دیبل کا سردار مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے گا۔ اس لئے میں نے خود وہاں جانے کی بجائے مکران کے مسلمان گورنر سے کہا تھا کہ وہ اپنا ایلچی بھیج کر معلوم کریں۔ دمشق سے آپ کے خلیفہ اور بصرہ میں حجاج بن یوسف سے ملنے کے بعد میں واپسی پر پھر مکران کے حاکم سے ملا تھا۔ سندھ سے اُن کا ایلچی واپس آ چکا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ دیبل کے حاکم نے اس جہاز کے متعلق لاعلمی ظاہر کی ہے"۔

خالد نے کہا۔"میں بندرگاہ سے سیدھا اسی طرف آیا ہوں۔ کیا آپ ہمارے گھروں میں یہ خبر پہنچا چکے ہیں"۔

"نہیں ہم ابھی وہاں نہیں گئے۔ میں اُنہیں مہمان خانے میں ٹھہرا کر تمہارے ساتھ چلتا ہوں"۔

خالد زبیر کی طرف متوجہ ہوا۔"آپ کی مہماں نوازی ہمارا حق ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ کم از کم عورتوں اور بچوں کو تسلی دینے کے لئے تو"۔

زبیر نے کہا۔"چلو دلیپ سنگھ"۔

اُس نے جواب دیا۔"اگر مناسب خیال کریں تو آپ خالد کے ساتھ ہو آئیں۔ میں اتنی دیر میں آپ کے ساتھیوں کو ٹھہرانے کا انتظام کر آؤں"۔

زبیر، خالد کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں اُس نے پوچھا۔"تم ابوالحسن کے بیٹے ہو؟"

"ہاں! لیکن آپ کو کس نے بتایا؟"

"میں تمام راستہ دلیپ سنگھ سے تم لوگوں کے متعلق پوچھتا آیا ہوں۔ اس

کی باتوں سے تمہاری جو تصویر میرے ذہن میں تھی، تم اُس سے مختلف نہیں ہو جس صبر و سکون کے ساتھ تم نے یہ المناک خبر سُنی ہے میں اُس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ تم سچ مچ خالد ہو۔"

خالد نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "جب ابّا جان حج کے لئے رخصت ہو رہے تھے تو میں نے بھی ساتھ جانے کے لئے اصرار کیا تھا۔ امّی جان کی علالت کی وجہ سے اُنہوں نے مجھے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ میں اُس وقت پہلی بار رویا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُنہیں بہت دُکھ ہوا۔ اُنہوں نے کہا۔ "بیٹا خالد رویا نہیں کرتے۔ میں نے تمہیں اُس مجاہدِ اعظم کا نام دیا ہے جو زخموں سے چُور ہونے کے باوجود اُف تک نہ کرتا تھا۔"

(۳)

شہر کے ایک کونے پر ایک ندی کے پاس عرب تاجروں کے مکانات تھے۔ ندی کے دونوں کناروں پر ناریل کے سرسبز درخت کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد خالد نے پتھر کی ایک چاردیواری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے ہمارا مکان۔"

چاردیواری کے اندر کیلوں اور ناریل کے درختوں کا ایک گنجان باغیچہ تھا۔ پتھر کے چھوٹے سے مکان کے سامنے ایک چبوترے پر بانس کا چھپر تھا۔ جسے ایک سرسبز بیل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوا بند ہونے سے فضا میں گھٹن بڑھ رہی تھی۔ زبیر کو پسینے میں شرابور دیکھ کر خالد نے اُسے مکان کے اندر لے

جانے کے بجائے اس چبوترے پر بٹھانا مناسب خیال کیا۔

زبیر سید کے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ خالد کے اشارے سے ایک سیاہ فام لڑکا پنکھے سے اُسے ہوا دینے لگا۔ سیاہ فام لڑکا پنکھا ہلانے میں ایک طرح کی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ لیکن زبیر نے خالد سے کہا: "ہمیں اس گرمی میں اسے تکلیف نہیں دینا چاہئے۔ اِسے کہو آرام کرے۔"

سیاہ فام لڑکے نے عربی میں جواب دیا۔ "آپ ہمارے مہمان ہیں۔ مجھے خدمت کے حق سے محروم نہ کیجئے۔"

زبیر نے کہا: "اوہو! تم تو عربی جانتے ہو؟"

لڑکے کی بجائے خالد نے جواب دیا۔ "یہ بچپن سے ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ اِسے ہمارے ابّا جان نے پالا تھا۔"

لڑکے نے مزید تعارف کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اور میں مسلمان ہوں۔ میرا نام علی ہے۔"

خالد نے سراندیپ کی زبان میں کچھ کہا اور علی پنکھا نیچے رکھ کر بھاگتا ہوا پاس ہی ایک ناریل کے اونچے درخت پر چڑھ کر چند ناریل توڑ لایا۔

ناریل کا پانی پینے کے بعد زبیر خالد سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ اپنے باپ کے المناک انجام کی خبر کے باوجود خالد عربوں کی روایتی مہمان نوازی کا ثبوت دینے کے لئے زبیر کی ہر بات میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم زبیر نے کئی بار یہ محسوس کیا کہ اُس کے ہونٹوں پر ایک غمگین مسکراہٹ آہوں اور آنسوؤں سے کہیں زیادہ جگر دوز تھی۔

باتیں کرتے کرتے خالد نے کئی بار باہر کے پھاٹک کی طرف اُٹھ اُٹھ کر دیکھنے کے بعد علی سے پوچھا۔ "علی! ناہید ابھی تک نہیں آئی۔ جاؤ اُسے بلا لاؤ۔"

علی اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ خالد نے زبیر سے کہا۔ "مہارانی اور راجہ کی بیٹی کو میری بہن سے بہت محبت ہے۔ آج صبح وہ خود یہاں آ کر اُسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ اُسے یہ خبر سُن کر بہت صدمہ ہوگا۔ وہ ابھی تک امّی کی قبر پر ہر روز جایا کرتی ہے۔ اور اب . . . . . . " یہاں تک کہہ کر وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

زبیر نے مغموم لہجے میں پوچھا۔ "آپ کی والدہ کب فوت ہوئیں؟"

"انہیں فوت ہوئے دو مہینے ہو چکے ہیں۔ ابّا کے حج پر جانے کے بعد وہ چھ مہینے موسمی بخار میں مبتلا رہیں۔ لیکن اُن کی موت کا باعث ابّا جان کا لاپتہ ہونا تھا۔ وہ صبح و شام مکان کی چھت پر چڑھ کر سمندر کی طرف دیکھا کرتی تھیں۔ جب دُور سے کوئی جہاز نظر آتا، اُن کے چہرے پر رونق آ جاتی۔ وہ مجھے خبر لانے کے لئے بندرگاہ کی طرف بھیجتیں، اور جب مَیں مایوس لوٹتا، تو دُور سے میری شکل دیکھتے ہی اُن کی آنکھیں پتھرا جاتیں۔ زندگی کی آخری شام اُن میں زینے پر پاؤں رکھنے کی ہمّت نہ تھی۔ اُن کے اصرار پر ہم اُن کی چارپائی اُٹھا کر چھت پر لے گئے۔ وہ تکیے کا سہارا لے کر دیر تک سمندر کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں۔ بدقسمتی سے ہمیں اُس دن کوئی جہاز بھی دکھائی نہ دیا۔ مَیں نمازِ مغرب کی اذان سُن کر نیچے اُترا۔ اور یہاں سے نزدیک ہی ایک مسجد میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو وہ آخری سانس لے چکی تھیں۔ اُن کی آنکھیں کھُلی تھیں، اور ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ دُور اُفق پر کسی جہاز کو دیکھ رہی ہیں۔ ناہید نے مجھے بتایا کہ اُن کے آخری الفاظ یہ تھے:۔ "ناہید! تمہارے ابّا آئیں گے، ضرور آئیں گے ــــ وُہ بے وفا نہیں، میں بے وفا ہوں جو اُن کا انتظار نہ کر سکی"۔

زبیر نے اپنی بائیس سالہ زندگی میں تیروں اور نیزوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا۔ وُہ ایک نڈر ملّاح تھا، اور فقط طوفانوں سے کھیلنا جانتا تھا۔ اُس کی زبان میٹھے اور شیریں الفاظ سے ناآشنا تھی۔ خالد کی باتوں سے بے حد متاثر ہونے کے باوجود وہ تسلّی اور تشفّی کے موزوں الفاظ تلاش نہ کر سکا۔ وہ فقط اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ "خالد! مجھے اُن کے حسرتناک انجام کا بہت دُکھ ہے۔ کاش! میں تمہارے حصّے کا بوجھ اُٹھا سکتا"۔

علی بھاگتا ہوا واپس آیا اور کہنے لگا۔ "وہ آرہی ہیں"۔

زبیر کی نگاہیں نادانستہ باہر کے دروازے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ ناہید آئی اور دُور سے اپنے بھائی کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر جھجکی، رُکی اور چہرے پر نقاب ڈال لیا۔ ایک لمحہ کے توقف کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔

زبیر کو ایک دلگداز آواز سنائی دی: "کیا یہ سچ ہے کہ ابّا جان . . . . ؟"

فقرے کا آخری حصّہ ہچکیوں میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

زبیر نسوانی حسن و وقار کی ایک غیر فانی جھلک دیکھ چکا تھا۔ اُس کی نگاہیں اس کے لئے تیار نہ تھیں اور پیشتر اس کے کہ ناہید کا چہرہ نقاب میں چھپتا، اُس کی نگاہوں کا رُخ بدل چکا تھا، وہ سامنے دیکھنے کی بجائے نیچے دیکھ رہا تھا۔

زبیر میں غایت درجہ کی حیا والدین اور ماحول کی تربیت کا نتیجہ تھی، اور اس

کے علاوہ اُس کے کردار کی سب سے بڑی خوبی انتہا درجہ کی خود اعتمادی تھی۔ وہ لڑکپن میں اپنے باپ کے ساتھ دُور دراز کے ممالک میں چکّر لگا چکا تھا۔ اوائلِ شباب میں اُسے ایک تجربہ کار جہاز ران مانا جاتا تھا۔ وہ دُور دراز کے ممالک میں غیر اقوام کی اُن شوخ و طرّار لڑکیوں کو دیکھ چکا تھا جو متاثّر ہونے والی نگاہوں کی تلاش میں پھرتی ہیں۔ شام و فلسطین میں بے شمار بے باک نگاہیں اُس کے مردانہ حُسن کا اعتراف کر چکی تھیں۔ لیکن اُس زمانے کے باحیا نوجوانوں کی طرح وہ نگاہیں نیچی رکھنے کا عادی تھا۔

زبیر جہاز پر سفر کے دَوران میں دلیپ سنگھ سے ہر عرب بچے کے متعلق سوالات پُوچھ کر اپنے ذہن میں اُن کی خیالی تصویریں بنا چکا تھا۔ دلیپ سنگھ سے ابوالحسن اور اُس کے بچّوں کے متعلق جو کچھ وہ سُن چکا تھا، اُس سے اُس کا اندازہ یہ تھا، کہ ابوالحسن کے بچّے شکل و شباہت اور عادات و اطوار میں باقی تمام بچّوں سے مختلف ہوں گے۔ یہ اُس کی دلچسپی کی پہلی وجہ تھی۔ پھر خالد کی زبانی جو کچھ اُس نے سُنا اُس کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا۔ اور اس کے بعد جب علی ناہید کو بُلانے کے لئے گیا، تو سابقہ دلچسپی کے ساتھ ایک ہلکی سی خلش کا اضافہ بھی ہو گیا۔ لیکن اُس کی دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اُس کی قوم کی ایک ستم رسیدہ لڑکی تھی۔

لڑکی نے پھر کہا۔ "مجھے جواب دیجئے۔ کیا یہ سچ ہے؟ آپ مجھ سے کیا چھپانا چاہتے ہیں۔ مَیں سُن چکی ہوں!"

خالد نے اُٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ "ناہید! تقدیر کے سامنے

کسی کا بس نہیں چلتا۔"

زبیر نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس کوئی خوشی کی خبر نہیں لا سکا۔"

ناہید کوئی اور بات کئے بغیر مکان کی طرف چل دی اور چند قدم آہستہ آہستہ اُٹھانے کے بعد بھاگ کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔

خالد ایک لمحہ کے لئے تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر زبیر کی طرف دیکھ کر بولا "میں ابھی آتا ہوں۔"

خالد بھاگ کر ناہید کے کمرے میں داخل ہوا۔ ناہید بستر پر مُنہ کے بل پڑی ہچکیاں بھر رہی تھی۔ خالد نے پیار سے اُس کا بازو پکڑ کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ناہید صبر سے کام لو۔"

علی، زبیر کے پاس تھوڑی دیر بے حس و حرکت کھڑا رہنے کے بعد آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ ناہید کی آہیں سُن کر اُسے زمین کی ہر شے اُداس اور غمگین نظر آ رہی تھی۔ وہ سہما اور جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور ڈرتے ڈرتے خالد کے بازو کو جھنجھوڑ کر بولا "آپا ناہید کیوں رو رہی ہے؟"

خالد نے اُس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "علی ابا جان واپس نہیں آئیں گے۔"

کمسن بچے کے مُنہ سے ایک جگر دوز چیخ نکلی "نہیں نہیں یہ نہ کہئے۔ وُہ ضرور آئیں گے۔"

خالد نے کہا "یہ دلیپ سنگھ کے ساتھ آئے ہیں۔ اُن کا جہاز شاید غرق

ہو چکا ہے"۔

علی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے اور وہ ہونٹ بھینچ بھینچ کر چیخوں کو ضبط کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا، جہاں اُس کی آواز سُننے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن باہر نکلتے ہی اُس نے پڑوس کے بہت سے لوگ اپنے گرد جمع کر لئے۔ تھوڑی دیر میں عربوں کے تمام بچے، عورتیں اور مرد خالد کے مکان کے صحن میں جمع ہو گئے۔ لوگوں کا شور و غوغا سُن کر خالد باہر نکلا۔ اور بیک وقت کئی زبانیں اُس سے مختلف سوالات پُوچھنے لگیں۔

طلحہ نے آگے بڑھ کر سب کو خاموش کیا اور خالد سے پوچھا "کیا جہاز کے غرق ہونے کی خبر درست ہے؟"

خالد نے اثبات میں سر ہلایا۔

اُس نے زبیر کی طرف دیکھا اور پُوچھا "کیا یہ خبر آپ لائے ہیں؟"

زبیر نے جواب دیا "مجھے افسوس ہے کہ مَیں کبھی اچھی خبر کا ایلچی نہ بن سکا!"

طلحہ نے پُوچھا "جہاز کیسے غرق ہوا؟"

زبیر نے جواب دیا "ہم یہ معلوم نہیں کر سکے"۔

زبیر نے بیواؤں اور یتیموں کو فرداً فرداً تسلی دینے کے بعد عرب واپس جانے کے متعلق اُن کے ارادے دریافت کئے۔

یتیم بچوں اور بیواؤں نے یک زبان ہو کر واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ زبیر دیر تک اُن کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ بالآخر نمازِ عصر کی اذان سُن کر اُس نے

لوگوں کے ہمراہ مسجد کا رُخ کیا۔

طلحہ کے اصرار پر زبیر نے امام کے فرائض سرانجام دیئے۔ جب وہ مسجد سے نکلا تو دروازے پر راجکمار اور دلیپ سنگھ کھڑے تھے۔ خالد کو دیکھ کر راجکمار کی سیاہ اور چمکدار آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور اُس نے آگے بڑھ کر خالد کو گلے لگا لیا۔

دلیپ سنگھ نے زبیر سے کہا۔ "مہاراج نے آپ کو یاد کیا ہے۔ خالد تم بھی چلو۔"

زبیر نے کہا۔ "میں ابھی اُن سے مِل کر آیا ہوں۔ کوئی خاص بات تو نہیں؟"

"مہاراج کے دل پر ابوالحسن کی موت کی خبر نے گہرا اثر کیا تھا۔ اُس وقت وہ آپ سے زیادہ دیر باتیں نہ کر سکے۔"

زبیر نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کو بھی اُن کے ساتھ گہری محبت تھی۔ اُن کے آنسو ابھی تک خشک نہیں ہوئے۔"

دلیپ سنگھ نے کہا۔ "ہاں راجکمار کو بہت صدمہ ہؤا ہے۔ وہ اُنہیں بہت پیار کرتے تھے۔"

(۴)

شاہی محل کی طرف جاتے ہوئے زبیر کو لوگوں کا ایک ہجوم جلوس کی شکل میں دکھائی دیا۔ دلیپ سنگھ نے کہا۔ "مہاراج آپ کے تحائف اور گھوڑوں کو دیکھ کر پھُولے نہیں سماتے۔ اُن کے حُکم سے گھوڑوں کا جلوس نکالا گیا ہے۔ گھوڑوں کی باگ تھام کر بازار میں چلنے کی عزت اُن لوگوں کے حصے آئی ہے، جو ہماری ریاست کے سب سے بڑے سردار ہیں۔ اگر اُنہیں ابوالحسن کی موت کا غم نہ ہوتا

تو شاید خود بھی اس جلوس میں شرکت کرتے"۔

زبیر نے قریب سے دیکھا تو دربار میں سب سے اگلی کرسیوں پر براجمان ہونے والے آٹھ سردار گھوڑوں کی باگیں تھامے ہجوم کے آگے آگے چلے آ رہے تھے۔ گھوڑوں پر جو دوشالے ڈالے گئے تھے۔ وہ بیش قیمت موتیوں سے مرصع تھے۔

راجکمار نے مسکراتے ہوئے زبیر کی طرف دیکھا اور کہا "کیا آپ کے ملک میں بھی گھوڑوں کی یہ عزت ہوتی ہے"۔

زبیر نے جواب دیا۔ "نہیں ہم زیادہ تر اُن کے چارے اور پانی کی فکر کیا کرتے ہیں"۔

دلیپ سنگھ بولا۔ "یہ گھوڑوں کی عزت نہیں۔ گھوڑے بھیجنے والوں کی عزت کی جا رہی ہے"۔

آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور ہوا البتہ خوشگوار ہو رہی تھی۔ راجہ محل کی دوسری منزل پر ایک دریچے کے سامنے بیٹھا سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زبیر اور اُس کے ساتھیوں کے قدموں کی چاپ سُن کر اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اُٹھ کر زبیر کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد خالد کی طرف متوجہ ہوا۔ "بیٹا! مجھے تمہارے باپ کی موت کا بہت دُکھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُس کا جہاز ..... طوفان کے باعث غرق ہو چکا ہے۔ لیکن اگر یہ ثابت ہو گیا کہ راستے میں کسی نے حملہ کر کے اُن کا جہاز غرق کر دیا ہے۔ تو میں اُس کی سرکوبی کے لئے اپنے تمام ہاتھی اور سارے جہاز بصرہ کے حاکم کے سپرد کر دوں گا"۔

راجہ سامنے کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے بیٹھ گیا۔ زبیر اور خالد بھی

بیٹھ گئے۔ لیکن دلیپ سنگھ کھڑا رہا۔

راجہ نے دلیپ سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا: "بیٹھ جاؤ۔ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ کل سے تم ہمارے دربار میں تمام سرداروں سے آگے راجکمار کے پاس بیٹھا کرو گے۔"

دلیپ سنگھ آگے بڑھ کر راجہ کے پاؤں چھونے کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا اور راجہ زبیر سے مخاطب ہوا: "میں بصرہ کے حاکم کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر آپ عرب بچوں کو لاوارث سمجھ کر یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں، تو مجھے بہت افسوس ہو گا۔ میں انہیں اپنے بچے سمجھتا ہوں۔ اگر وہ یہاں رہیں تو اُن کی ہر ضرورت ہمارے خزانے سے پُوری ہو گی۔ آپ اُن سے پُوچھ لیں اگر انہیں یہاں کوئی تکلیف ہو، تو بے شک انہیں اپنے ساتھ لے جائیے۔"

زبیر نے جواب دیا: "اُنہیں یہاں کوئی شکایت نہیں اور میں اپنی حکومت اور تمام عربوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن ہم یہ اچھا نہیں سمجھتے کہ ہماری قوم کے یتیم بچے اپنے مُلک سے اِس قدر دُور رہیں۔ ان کی بہترین تعلیم و تربیت وہیں پر ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ پسند کریں گے تو انہیں یہاں بھیج دیا جائے گا۔"

راجہ نے پُوچھا: "آپ سب کو لے جانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔ طلحہ اور چند تاجر یہیں رہیں گے۔"

"لیکن خالد اور اُس کی بہن بھی تو یہیں رہیں گے نا؟"

"نہیں۔ یہ بھی میرے ساتھ جائیں گے۔"

راجکمار نے مغموم لہجے میں کہا۔ "نہیں۔ انہیں ہم نہیں جانے دیں گے خالد کو میں اپنا بھائی بنا چکا ہوں۔"

"اور ناہید میری بہن ہے۔" پچھلے کمرے کے پردے کی آڑ سے ایک نسوانی آواز آئی اور چودہ پندرہ برس کی ایک لڑکی راجہ کے سامنے آکھڑی ہوئی اُس کا رنگ راجکمار کی طرح سانولا تھا۔ لیکن چہرے کے نقوش اُس کی نسبت تیکھے، آنکھیں خوبصورت اور چمکدار تھیں۔ اُس نے خالد کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بھیا تمہیں ماتاجی بُلاتی ہیں۔"

خالد اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اور لڑکی نے چلتے چلتے راجہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "پتاجی! آپ ان کی باتیں نہ سُنیں۔"

راجہ نے زبیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دیکھا آپ نے؟"

زبیر نے کہا۔ "بہت اچھا۔ مَیں اُن کی مرضی پر چھوڑتا ہوں۔"

خالد تھوڑی دیر بعد سر جھکائے ہوئے واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ راجہ نے پُوچھا۔ "بیٹا! اُنہوں نے یہ فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے۔ اب تم بتاؤ۔ تم یہاں رہنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

خالد نے جواب دیا۔ "آپ کے ہم سب پر بہت احسانات ہیں۔ اگر میرے پیشِ نظر دُنیا کا کوئی آرام ہوتا تو مَیں آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑتا۔ لیکن اس وقت ہماری قوم دُور دراز کے ممالک میں جہاد کر رہی ہے، اور میری رگوں میں ایک مجاہد کا خون ہے۔ مَیں نے سُنا ہے کہ موجودہ وقت کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے مجھ سے کم عمر کے لڑکے بھی جہاد پر جا رہے ہیں۔ مَیں اس سعادت سے محروم

نہیں رہنا چاہتا۔"

راجہ کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد بولا: "بیٹا! تم ابوالحسن کے بیٹے ہو۔ اگر تم ارادہ کر چکے ہو تو مجھے یقین ہے کہ تمہیں دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ خوش نصیب ہے وہ قوم جس کی مائیں تمہارے جیسے بچے جنتی ہیں۔"

خالد نے کہا: "مَیں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے خوشی سے اجازت دیں۔"

راجہ نے جواب دیا: "ابوالحسن کے بیٹے کی خوشی میری ناراضی کا باعث نہیں ہو سکتی۔"

قزّاق

(۱)

دس دن بعد ایک صبح بندرگاہ پر دو جہاز سفر کے لئے تیار کھڑے تھے۔ ایک جہاز پر زبیر یتیم بچوں اور بیواؤں کو لئے جا رہا تھا اور دوسرے جہاز پر لیپ سنگھے راجہ کی طرف سے حجاج بن یوسف اور خلیفہ ولید کے لئے ہاتھی، موتی، سونا، چاندی اور مختلف اقسام کے تحائف لے جا رہا تھا۔ ہاتھی تعداد میں دس تھے۔

راجہ اور ولی عہد زبیر اور اُس کے ساتھیوں کو رخصت کرنے کے لئے بندرگاہ تک آئے۔ راجہ بیواؤں اور یتیم بچوں میں سے ہر ایک کو گراں قدر تحائف دے چکا تھا۔ زبیر کو اُس نے کئی چیزیں پیش کیں۔ لیکن اُس نے فقط گینڈے کی ڈھال پسند کی۔ رانی اپنا موتیوں کا بیش قیمت ہار سخت اصرار کے بعد ناہید کو پہنا سکی۔ راجکماری رخصت کے دن اُس کے گھر آئی اور بضد ہو کر ناہید کو اپنی ہیرے کی انگوٹھی دے گئی۔

بندرگاہ پر جہاز میں سوار ہونے سے پہلے راجکمار نے آبدیدہ ہو کر خالد کو گلے لگا لیا۔ اور اپنی موتیوں کی مالا اُتار کر اُس کے گلے میں ڈال دی۔

جہازوں کے بادبان کھولے گئے اور ہوا کے جھونکے جہازوں کو دھکیلنے

لگے۔ شہر کے لوگوں نے اپنے مہمانوں کو آنسوؤں اور آہوں سے الوداع کہی۔

عورتوں کے لئے جہاز کے اندر ایک کشادہ کمرے کے علاوہ بالائی تختہ کے ایک حصے پر بھی چلمنیں ڈال کر پردے کا انتظام کیا گیا تھا۔ خالد اِدھر اُدھر گھوم کر ملاحوں کے کام میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ناہید علی کے ساتھ تختۂ جہاز پر کھڑی ناریل کے اُن بلند قامت اور سرسبز درختوں کو دیکھ رہی تھی جن کی چھاؤں میں اُس نے زندگی کے بہترین دن گزارے تھے۔

صبح شام میں تبدیل ہو گئی، اور سراندیپ کا ساحل اُفق پر ایک ہلکی سی سبز لکیر نظر آنے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ لکیر بھی شام کے دھندلکے میں چھپ گئی۔ وہ آنسو جو دیر سے ناہید کی آنکھوں میں جمع ہو رہے تھے ٹپک پڑے۔ علی بھی اپنا آبائی وطن چھوڑنے پر قدرے ملول تھا۔ لیکن اُس کے دل میں خالد اور ناہید کے ساتھ جانے کی خوشی اس ملال سے کہیں زیادہ تھی۔

رات کے وقت مطلع صاف تھا، اور بچے اور عورتیں تختۂ جہاز پر کھلی ہوا میں سو گئے۔ ناہید دیر تک آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتی رہی۔ چلمن کی دوسری طرف خالد، زبیر اور ملاحوں سے باتیں کر رہا تھا۔

ہاشم، ایک آٹھ سال کا لڑکا ناہید کے قریب لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی ماں فوت ہو چکی تھی، اور باپ ابوالحسن کے ساتھ لاپتہ ہو چکا تھا۔ ہاشم اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ناہید نے پوچھا ”کیا ہے ہاشم؟“

اُس نے سوال کیا ”علی کہاں ہے؟“

"وہ خالد کے ساتھ ملاحوں سے باتیں کر رہا ہے۔"

"میں اُس سے ایک بات پوچھ کر ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر ہاشم تاریکی میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہُوا علی کے پاس پہنچا۔ اور پُوچھنے لگا۔ "علی! جب جہاز ڈوب جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟"

علی نے بھولے پن سے جواب دیا۔ "سمندر کی تہ میں چلا جاتا ہے۔"

ملاح اس جواب پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ہاشم نے پھر کہا۔ "واہ! یہ تو مجھے معلوم تھا۔ میں پوچھتا ہوں لوگ کہاں جاتے ہیں؟"

"لوگوں کو مچھلیاں کھا جاتی ہیں۔"

"جھوٹ! مچھلیوں کو تو آدمی کھاتے ہیں۔"

علی نے پھر جواب دیا۔ "زمین پر آدمی مچھلیوں کو کھاتے ہیں۔ لیکن سمندر میں مچھلیاں آدمیوں کو کھا جاتی ہیں۔"

ہاشم کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا اور واپس آکر اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا۔

(۲)

چند دنوں کے بعد یہ جہاز مالابار کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں سامانِ خوراک اور تازہ پانی حاصل کرنے کے لئے انہیں مغربی ساحل کی مختلف بندرگاہوں پر لنگر انداز ہونا پڑا۔ اس دوران میں انہیں کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ مالابار کی ایک بندرگاہ پر چند عرب تاجروں نے زبیر کا خیر مقدم کیا اور گزشتہ طویل سفر میں تھکے ہوئے مسافروں کو چار دِن اپنے پاس ٹھیرا لیا

اِن چار دنوں میں سراندیپ کے راجہ کے گراں قدر تحائف کی خبر دُور دُور تک مشہور ہو چکی تھی۔

رخصت کے دن حاکمِ شہر بندرگاہ پر زبیر اور دلیپ سنگھ سے ملا۔ اور اُس نے اُنہیں راستے میں بحری ڈاکوؤں کے حملے کے خطرے کے پیشِ نظر ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ دلیپ سنگھ نے جواب دیا "آپ فکر نہ کریں۔ ہمارے جہاز پوری طرح مسلح ہیں"

تیسرے روز مستول پر سے دونوں جہازوں کے پہرہ داروں نے یکے بعد دیگرے افقِ شمالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دو جہازوں کی آمد کا پتہ دیا۔ اور جہاز ران پریشان ہو کر تختۂ جہاز پر کھڑے ہو گئے۔ دلیپ سنگھ کا جہاز آگے تھا۔ وہ اپنے جہاز کو روکنے کا حکم دے کر زبیر کا جہاز قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب دونوں جہاز ایک دوسرے سے بہت تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ تو دلیپ سنگھ نے کہا "ممکن ہے وہ جہاز بحری ڈاکوؤں کے نہ ہوں لیکن ہمیں مقابلے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ آپ اپنا جہاز مغرب کی طرف لے جائیں۔ مَیں اُن سے نپٹ لوں گا"

زبیر نے جواب دیا "نہیں ہم خطرے میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے"

دلیپ سنگھ نے کہا "مجھے آپ کی ہمت پر شبہ نہیں۔ لیکن ہماری سب سے پہلی ذمہ داری بچوں کی جان بچانا ہے"

زبیر نے جواب دیا "اگر وہ واقعی بحری ڈاکو ہیں تو ممکن ہے کہ مغرب کی طرف

سے بھی اُنھوں نے ہمارا راستہ روک رکھا ہو۔ اِس صُورت میں بھاگ نکلنے کی بجائے لڑنا کم خطرناک ہوگا، اور ہم سے یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم اپنے دوستوں کی جانیں خطرے میں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔"

"آپ کی مرضی۔ تاہم عورتوں کو حکم دیں کہ وُہ نیچے چلی جائیں۔"

دلیپ سنگھ یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے میں مصروف ہوگیا۔

زبیر نے خالد سے کہا "خالد تم عورتوں اور بچّوں کو نیچے لے جاؤ۔"

دونوں جہازوں کے ملاح کیل کانٹے سے لیس ہو کر دُور سے آنے والے جہازوں کو دیکھنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد دلیپ سنگھ ایک جہاز کا سیاہ جھنڈا پہچان کر چلایا "یہ بحری ڈاکوؤں کے جہاز ہیں۔ مقابلے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

زبیر نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا "بھائیو! یہ عورتیں اور بچے ہمارے پاس امانت ہیں۔ ہمیں انہیں سلامتی سے بصرہ پہنچانا ہے۔ اگر ہم پر اُن کی حفاظت کی ذمہ داری نہ ہوتی، تو ہمارا طریقِ جنگ اس طریقے سے مختلف ہوتا جو میں نے اب تجویز کیا ہے۔ میں ایک خطرناک مہم کے لئے تم میں سے دو رضاکار چاہتا ہوں۔"

اس پر سب سے پہلے خالد اور اس کے بعد تمام ملاحوں نے یکے بعد دیگرے اپنے نام پیش کئے۔ زبیر نے کہا "اس کام کے لئے دو بہترین تیراک درکار ہیں۔ میں یہ کام ابراہیم اور عمر کو سونپتا ہوں۔"

زبیر کی ہدایت پر دونوں جہازوں سے دو کشتیاں سمندر میں اُتاری گئیں۔ اور اُن کے ساتھ بادبان باندھے گئے۔ دلیپ سنگھ کے جہاز پر ہاتھیوں کے لئے

بہت سی خشک گھاس موجود تھی۔ ملاحوں نے اُس کے چند گٹھے اُتار کر کشتیوں پر لاد دیے۔ ابراہیم اور عمر ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں لے کر کشتیوں پر سوار ہو گئے۔ اس کے بعد زبیر اور اُس کے ساتھی ترکش اور کمانیں سنبھال کر حملہ آوروں کے جہازوں کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ اگلے جہاز کا رُخ دلیپ سنگھ کے جہاز سے زیادہ زبیر کے جہاز کی طرف تھا۔ عمر اور ابراہیم کی کشتیاں ایک لمبا چکّر کاٹ کر حملہ آور جہازوں کے عقب میں پہنچ چکی تھیں۔

زبیر ایک سرے سے دُوسرے سرے تک بھاگتا ہُوا اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ تیروں کا پہلا وار حملہ آوروں کی طرف سے ہُوا۔ اور ایک تیر سن سے زبیر کے سر کے قریب سے گزر گیا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے ایک نسوانی آواز سُنائی دی "آپ کسی محفوظ جگہ بیٹھ جائیے۔ ہم دشمن کے تیروں کی زد میں آ چکے ہیں۔"

زبیر نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ناہید تیر و کمان ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ آنکھوں کے سوا اُس کا باقی چہرہ نقاب میں چھُپا ہُوا تھا۔ زبیر نے کہا "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ جاؤ نیچے!"

ناہید نے اطمینان سے جواب دیا۔ "آپ میری فکر نہ کریں۔ میں تیر چلانا جانتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ کر ایک سپاہی کے قریب بیٹھ گئی۔

کچھ دیر تیروں کی لڑائی ہوتی رہی۔ لٹیرے زیادہ قریب پہنچ کر جلتے ہوئے تیر پھینکنے لگے۔ دوسری طرف سے زبیر کی ہدایت کے مطابق ابراہیم اور عمر نے اپنی کشتیاں سیدھی لُٹیروں کے جہازوں کی طرف چھوڑ دیں۔ اور قریب پہنچ کر

جلتی ہوئی مشعلوں سے گھاس کو آگ لگائی اور خود پانی میں کود گئے۔ لٹیرے جو ہاتھوں میں کمندیں لیے ہوئے اپنے حریف کے جہازوں پر کودنے کے لیے تیار کھڑے تھے بدحواس ہو کر کشتیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہوا کے ایک جھونکے نے کشتیوں سے آگ کے شعلوں کو جہازوں کے بادبانوں تک پہنچا دیا۔ دلیپ سنگھ کے مقابلہ پر لٹیروں کا جہاز ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔ اِس لیے اُس جہاز پر سے جنہوں نے چھلانگیں لگائیں، وہ دلیپ سنگھ کے ملّاحوں کے تیروں کا شکار بنے لیکن زبیر کے جہاز پر حملہ کرنے والے بالکل قریب آ چکے تھے۔ جب اُنہوں نے اپنا جہاز جلتا ہوا دیکھا تو کمندیں ڈال کر زبیر کے جہاز پر کودنے کی کوشش کرنے لگے۔ آگ کے خطرہ سے بچنے کے لیے زبیر نے لنگر اُٹھانے کا حکم دیا۔ لیکن اِتنی دیر میں آٹھ دس لٹیرے کمندیں ڈال کر زبیر کے جہاز پر کودنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ زبیر کے ساتھیوں نے اُنہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ لٹیروں کے جہاز سے ایک تیر آیا اور زبیر کے بائیں بازو میں پیوست ہو گیا۔ ناہید کی کمان سے ایک تیر نکلا اور ایک لٹیرے کے سینے میں جا لگا۔

زبیر نے "مرحبا" کہا۔ ناہید نے مڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ کمان نیچے پھینک کر بازو سے تیر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناہید نے جلدی سے کمان نیچے رکھ کر ایک ہاتھ سے زبیر کا بازو پکڑا، اور دوسرے ہاتھ سے تیر کھینچ کر نکالا۔ تیر کے نکلتے ہی زبیر کے بازو سے خون کی دھار بہ نکلی۔ ناہید نے اُس کی قمیص کی آستین اُوپر چڑھائی اور جھٹ سے اپنے چہرے کا نقاب

اُتار کر زخم پر باندھ دیا۔

زبیر کا جہاز کمندوں کی زد سے نکل چکا تھا اور جلتے ہوئے جہاز کے ملاح مایوس ہو کر پانی میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ زبیر نے دوبارہ کمان اُٹھاتے ہوئے کہا ”ناہید! اب تم عورتوں کے پاس جاؤ اور اُنہیں تسلّی دو۔ ہم خدا کے فضل سے فتح حاصل کر چکے ہیں۔“

ناہید نے چلتے چلتے رُک کر پوچھا ”آپ کو تکلیف تو نہیں؟“

”نہیں، یہ بہت معمولی زخم ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔“ یہ کہتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے زبیر کی نگاہیں غیر ارادی طور پر ناہید کے چہرے پر گڑ گئیں۔ حیا اور وقار اُس کے خدوخال کی دلکشی میں اضافہ کر رہا تھا۔ ناہید نے اچانک محسوس کیا کہ وہ بے نقاب ہے اور وہ تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی نیچے اُتر کر عورتوں کے پاس چلی گئی۔

جلتے ہوئے جہاز سے چند آدمی اُتر کر ایک کشتی پر سوار ہوئے، اور ایک آدمی جو ڈاکوؤں کا سردار معلوم ہوتا تھا سفید جھنڈا لہرانے لگا۔ زبیر نے تیراندازوں کو ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ عمر اور ابراہیم اپنا کام پورا کر کے جہاز کے قریب پہنچ چکے تھے۔ زبیر نے اپنے جہاز کو آگ کے خطرے سے محفوظ پا کر لنگر ڈالنے اور رسّیوں کی سیڑھی نیچے پھینکنے کا حکم دیا۔ عُمر اور ابراہیم جہاز پر چڑھ آئے۔ خالد نے زبیر کو دلیپ سنگھ کے ساتھیوں کی طرف متوجہ کیا۔ جو سمندر میں غوطے کھانے والے دشمنوں پر تیروں کی مشق کر رہے تھے۔ زبیر نے انہیں بھی ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ اور لٹیرے قدرے

مطمئن ہو کر سیڑھی کے ذریعے جہاز پر چڑھنے لگے۔ سب سے آخر لٹیروں کے سردار کی کشتی دونوں جہازوں کے درمیان آ کر رُکی - ایک قوی ہیکل اور معمّر آدمی جس کی داڑھی کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے، زخمی شیر کی طرح جہاز رانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کشتی میں زبیر کی نظر ایک نوجوان اور ایک لڑکی پر پڑی۔ دونوں شکل و صورت اور لباس کے اعتبار سے لٹیروں سے بہت مختلف تھے۔

زبیر نے قوی ہیکل اور بارعب آدمی کو ڈاکوؤں کا سردار سمجھ کر اُس کی طرف اشارہ کیا اور ملّاح کشتی کو کھیتے ہوئے جہاز کے قریب لے آئے، اور یکے بعد دیگرے رسّی کی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے جہاز پر پہنچے۔ لڑکی کے چہرے سے علالت اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ خوش وضع اور خوش پوش نوجوان اُس کا بازو پکڑ کر سہارا دے رہا تھا، اور وہ سنبھل سنبھل کر سیڑھی پر پاؤں رکھ رہی تھی۔

جہاز پر پہنچ کر نوجوان نے ایک اجنبی زبان میں کچھ کہا۔ اور لٹیروں کی طرف گھورنے لگا۔ زبیر نے اُس کی زبان پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی محسوس کیا کہ وہ لٹیروں کے مظالم کی شکایت اور اُس کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

زبیر نے اپنی استطاعت کے مطابق سندھ اور سراندیپ کی ملی جُلی زبان میں اُسے تسلّی دی۔ نوجوان اور لڑکی اُس کے دوستانہ لہجے سے متاثر ہو کر تشکر آمیز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ لڑکی نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اُس کی سہمی ہوئی آواز گلے میں اٹک گئی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر زبیر کی

طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی عمر چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ خوبصورت چہرہ دوپہر کے پھول کی طرح کُملایا ہُوا تھا۔ زبیر نے پھر ایک بار ان دونوں کو تسلّی دی۔ سب سے آخر ڈاکوؤں کا سردار جہاز پر پہنچا۔ اُس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسوؤں کی بجائے انتقام کی بجلیاں تھیں۔

تھوڑی دیر میں دلیپ سنگھ اپنے جہاز سے اُتر کر کشتی کے ذریعے زبیر کے جہاز پر پہنچ گیا۔ اُس نے آتے ہی ڈاکوؤں کے سردار کو مارنے کے لئے چابک اُٹھایا۔ لیکن زبیر نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو پکڑ لیا۔ دلیپ سنگھ نے زبیر کی قمیص کی آستین کو خون آلود دیکھ کر پُوچھا۔ "آپ زخمی ہیں؟"

زبیر نے بے پروائی سے جواب دیا" یہ بہت معمولی زخم ہے"

خوش پوش نوجوان نے کچھ کہہ کر دلیپ سنگھ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور دونوں ایک دُوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد دلیپ سنگھ نے ڈاکوؤں کے سردار سے چند باتیں کرنے کے بعد عربی زبان میں زبیر کے ساتھیوں سے کہا "کشتی میں ایک صندوق پڑا ہُوا ہے اُسے اُوپر لے آؤ"

ملاّحوں نے صندل کی لکڑی کے چھوٹے سے صندوق کو رسّے کے ساتھ باندھ کر اُوپر کھینچ لیا۔ دلیپ سنگھ نے ڈھکنا اُوپر اُٹھایا اور تمام ملاّح حیران ہو کر سونے موتیوں اور جواہرات سے بھرے ہوئے صندوق کو دیکھنے لگے۔

زبیر کے استفسار پر دلیپ سنگھ نے خوش پوش نوجوان سے چند سوالات اُور پُوچھے اور اُس نے اپنی آپ بیتی سُنائی۔

(۳)

نوجوان کا نام جے رام تھا۔ وہ کاٹھیاواڑ کے ایک عالی نسب راجپوت خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اوائل شباب میں اُسے شہرت اور ناموری کا شوق سرزمین سندھ تک لے گیا۔ برہمن آباد کے ایک میلے میں اُس نے تیر اندازی میں اپنے کمالات دکھا کر سندھ کے راجہ کو اپنا قدردان بنا لیا۔ راجہ نے اُسے اپنی فوج میں ایک معمولی عہدہ دے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ دو سال کی خدمت گزاری کے بعد جے رام نے دیبل کے حاکم کے نائب کی جگہ حاصل کر لی۔ دیبل میں آئے ہوئے اُسے ایک ہفتہ نہ ہُوا تھا کہ گھر سے اُسے اپنے باپ کی وفات اور ماں کی علالت کی خبر ملی۔ اور وُہ چند ماہ کی رخصت لے کر کاٹھیاواڑ پہنچا۔ گھر پہنچنے کے دس دن بعد اُس کی والدہ بھی چل بسی۔ گھر میں اب صرف اُس کی ایک چھوٹی بہن مایا دیوی تھی۔ جے رام نے رشتہ داروں کی نصیحتوں اور مایا دیوی کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر واپس سندھ جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ لیکن چار ماہ گھر میں قیام کرنے کے بعد اُسے اپنی پُرسکون زندگی تلخ محسوس ہونے لگی۔ اور ایک دن اُس نے کاٹھیاواڑ کے راجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ملازمت کی درخواست کی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سندھ کے راجہ نے اپنا حلقۂ اقتدار وسیع کرنے کے لئے پڑوس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر رکھی تھی۔ اور خود مختار سردار اور راجے اُسے اپنا طاقتور ہمسایہ تسلیم کرنے کے ثبوت میں اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اُس کی نذر کر رہے تھے۔ کاٹھیاواڑ کے راجہ کو اگرچہ

براہِ راست سندھ کے راجہ سے کوئی خطرہ نہ تھا تاہم وہ چند جواہرات کے عوض اُسے اپنا دوست بنانا غنیمت سمجھتا تھا۔

جے رام کو اپنے دربار میں کوئی عہدہ دینے کے بجائے اُس نے سندھ میں اُس کے اثر و رسوخ سے فائدہ اُٹھانا زیادہ مناسب خیال کیا۔ اور اُسے سونے جواہرات اور موتیوں کا ایک صندوق دے کر سندھ کے راجہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ جے رام کو یقین تھا کہ راجہ داہر اُسے واپس نہ آنے دے گا۔ اِس لئے اُس نے اپنی اکیلی بہن مایا دیوی کو گھر پر چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ مایا دیوی بھی اُس کے ساتھ جانے پر مصر تھی۔ اِس لئے یہ دونو اپنا گھر بار چچا زاد بھائی کے سپرد کر کے سندھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن کاٹھیاواڑ اور سندھ کے درمیان اُن کے جہاز کو بحری ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اُس کے ساتھی بہادری سے لڑے۔ لیکن ڈاکوؤں کے سامنے اُن کی پیش نہ گئی۔ ڈاکوؤں نے جواہرات کے صندوق پر قبضہ کر لیا۔ اور جے رام اور مایا دیوی کے سوا اُن کے باقی ساتھیوں کو سمندر کے کنارے لا کر آزاد کر دیا۔ ڈاکوؤں کا سردار یہ سمجھتا تھا کہ جے رام اور مایا دیوی راجہ کاٹھیاواڑ کے عزیز ہیں اور وہ اُن کی جان بچانے کے لئے ایک معقول رقم ادا کرنے پر آمادہ ہو جائے گا اِس لئے وہ کاٹھیاواڑ کے ساحل کے ایک غیر آباد حِصّے پر لنگر انداز ہو کر راجہ سے یہ سودا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُن کے ایک جاسوس نے انہیں سراندیپ کے جہازوں کی آمد کی خبر دی۔ اور اُنہوں نے کاٹھیاواڑ ٹھہرنے کی بجائے مالابار کا رُخ کیا۔

زبیر نے یہ قصہ سُن کر پھر ایک بار جے رام اور اُس کی بہن کو تسلی دی اور کہا "یہ لٹیرے جیسے ہمارے مجرم ہیں ویسے ہی آپ کے مجرم ہیں۔ مَیں نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ انہیں کیا سزا دی جائے۔ تاہم مَیں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے مُلک میں انہیں کیا سزا دی جاتی ہے؟"

جے رام نے جواب دیا "ایسے ظالم ڈاکوؤں کے لئے نہ ہمارے قانون میں اور نہ آپ کے قانون میں رحم کی کوئی گنجائش ہے۔ تاہم جب ان لوگوں سے آپ کا مقابلہ ہوا تھا۔ مجھے اور میری بہن کو جہاز کے ایک کونے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اور جہاز کو آگ لگ جانے کے بعد یہ لوگ ہمیں وہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اپنے لئے مَیں شاید ان سے رحم کی درخواست نہ کرتا لیکن اپنی بہن کے لئے مجھے عاجز ہونا پڑا۔ اور ان لوگوں نے ہمیں کشتی پر سوار کرنے سے پہلے یہ وعدہ لیا کہ مَیں آپ سے ان لوگوں کی جاں بخشی کے لئے سفارش کروں۔ لیکن میرا یہ مطلب نہیں کہ انہیں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ مَیں انہیں صرف موت کی سزا سے بچانا چاہتا ہوں لیکن یہ ضروری ہے کہ جب تک ان کے راہِ راست پر آجانے کا اطمینان نہ ہو انہیں قید میں رکھا جائے۔"

مایا دیوی علالت کی وجہ سے دیر تک کھڑی نہ رہ سکی۔ اُس نے اپنے بھائی سے کچھ کہا۔ اور پیشتر اس کے کہ وُہ کوئی جواب دیتا، دلیپ سنگھ نے کہا۔ "اوہو! ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ آپ کی بہن علیل ہیں۔ خالد بیٹا! انہیں اپنی بہن کے پاس لے جاؤ!"

خالد آگے بڑھا اور مایا دیوی اپنے بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ جے رام نے دلیپ سنگھ سے پوچھا۔ "اس جہاز پر عورتیں بھی ہیں؟"

"جی ہاں! آپ کی بہن کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ ہاں بیٹی جاؤ تم آرام کرو۔"

(۴)

جہازوں کی دوبارہ روانگی سے پہلے لٹیروں کے سردار کے سوا باقی تمام قیدیوں کو دلیپ سنگھ کے جہاز میں منتقل کیا گیا۔ زبیر نے دلیپ سنگھ سے تاکید کی کہ جب تک ان کی سزا کا فیصلہ نہ ہو ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی جائے۔ ڈاکوؤں کے سردار کو اس کے ساتھیوں کی نیک چلنی کی ضمانت کے طور پر زبیر نے اپنے جہاز پر ٹھہرا لیا۔ جے رام نے بھی اپنی بہن کی علالت کے پیش نظر زبیر کے جہاز پر رہنا پسند کیا۔

خالد نے مایا دیوی کو ناہید کے پاس پہنچا دیا۔ ناہید نے اسے ایک بستر پر لٹا دیا۔ اور عرب عورتیں اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ پہلی ملاقات میں میزبانوں اور مہمانوں کے درمیان فقط اشاروں سے ہمدردی اور تشکر کے جذبات کی ترجمانی ہوئی۔

دلیپ سنگھ نے اپنے جہاز پر جانے سے پہلے جے رام سے کہا "آپ کو شاید کھانے کی تکلیف ہو۔ میں ایک مدت مسلمانوں کے ساتھ رہ کر چھوت چھات کا قائل نہیں رہا۔ ہم سب ایک ہی دستر خوان پر کھا لیتے ہیں۔ میرے ساتھ جتنے آدمی ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو مسلمانوں کے ساتھ

نہ کھا چکا ہو۔ تاہم ایک اپنا آدمی جسے میں اس جہاز پر چھوڑ رہا ہوں، آپ دونو کے لئے کھانا تیار کرے گا۔ اور آپ کے میزبان آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو اپنے دسترخوان پر بیٹھنے کے لئے مجبور نہیں کریں گے"۔

دلیپ سنگھ نے چند باتیں زبیر کو سمجھائیں اور اُتر کر اپنے جہاز پر چلا گیا۔ اُس کے پہنچنے سے پہلے اُس کے ساتھی اپنے کند استروں سے پانچ سفید ریش لٹیروں کے سر اور ڈاڑھیاں، مونچھیں اور بھنوئیں مونڈ چکے تھے۔ ایک ڈاکو جو شکل وصورت سے زیادہ بزرگ معلوم ہوتا تھا، اُس کی صرف آدھی ڈاڑھی، ایک مونچھ اور آدھا سر صاف کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا۔

ناہید اور دوسری عرب عورتوں نے دل وجان سے مایا دیوی کی تیمارداری کی۔ موسمی بخار کے لئے ناہید سراندیپ سے چند جڑی بوٹیاں اپنے ساتھ لائی تھی، اُن کے استعمال سے مایا دیوی تین چار دن میں تندرست ہو گئی۔

زبیر نے اپنے بازو کے زخم کو معمولی سمجھ کر شروع شروع میں چنداں پروا نہ کی۔ لیکن مرطوب ہوا کے باعث زخم میں تیسرے دن پیپ پڑ گئی اور اُسے درد کی شدت اور بخار کی وجہ سے چند دن بستر پر لیٹنا پڑا۔

دلیپ سنگھ کئی بار اپنا جہاز چھوڑ کر اُس کی تیمارداری کے لئے آیا۔ علی، خالد اور ہاشم، ناہید اور دوسری عرب عورتوں کو ہر آن اُس کی حالت سے باخبر رکھتے۔ جے رام ہر وقت اُس کے پاس بیٹھا رہتا۔ مایا دیوی ایک عورت کی ذکاوت حس کی بدولت ناہید کے مغموم اور پریشان رہنے کی وجہ سمجھ چکی تھی۔ وہ اپنے بھائی کی موجودگی میں کبھی کبھی زبیر کو دیکھ آتی۔ اور واپس آکر

اشاروں اور عربی کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں جنہیں وُہ دن رات عرب عورتوں کی صحبت میں رہ کر یاد کر چکی تھی، ناہید کو تسلی دیتی۔

ایک شام زبیر کی حالت قدرے مخدوش تھی۔ دلیپ سنگھ آیا اور زخم پر مرہم پٹی کرنے کے بعد چلا گیا۔ رات کے وقت مطلع ابر آلود تھا اور ہوا تیز تھی۔ ملّاح اپنی اپنی جگہ پر متعین تھے۔ جے رام، خالد اور علی زبیر کی تیمارداری کر رہے تھے۔ عرب عورتیں عشاء کی نماز کے لئے اُٹھیں اور مایا دیوی اپنے بھائی سے زبیر کا حال پُوچھنے کے لئے چلی گئی۔ جب ناہید نماز سے فارغ ہو کر زبیر کی صحت کے لئے دُعا کر رہی تھی، خالد نے آ کر بتایا کہ زبیر بے ہوش ہے۔

ایک عمر رسیدہ عورت نے کہا "ہمارے تمام آدمی آندھی کی وجہ سے جہاز پر مصروف ہیں۔ ہمیں اُن کے پاس ضرور جانا چاہئے۔"

تمام عورتیں اُٹھ کر زبیر کے پاس پہنچیں۔ مایا دیوی نے انہیں دیکھ کر اپنے بھائی کی طرف اشارہ کیا اور وُہ اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ جے رام نے کئی راتیں آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ وُہ باہر نکلتے ہی جہاز کے ایک کونے میں لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔

آدھی رات کے وقت زبیر کا بخار قدرے کم ہُوا۔ اور ناہید اور مایا دیوی کے علاوہ باقی عورتیں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ خالد اور علی وہیں پر لیٹ کر سو گئے۔

رات کے تیسرے پہر زبیر نے آنکھیں کھولیں اور شمع کی روشنی میں مایا دیوی اور ناہید کو دیکھ کر پُوچھا "آپ یہاں؟ جائیں آرام کریں۔"

ناہید کا مُرجھایا ہوا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا اور اُس نے سوال کیا :- "اور آپ اب کیسے ہیں ؟"

"میں اب ٹھیک ہوں - مجھے پانی دیجئے"

مایا دیوی نے اُٹھ کر صُراحی سے پانی کا پیالہ بھرا اور ناہید کے ہاتھ میں دے دیا - ناہید نے ہچکچاتے ہوئے ایک ہاتھ سے زبیر کے سر کو سہارا دے کر اوپر اُٹھایا اور دُوسرے ہاتھ سے پانی کا پیالہ اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا -

زبیر نے پانی پی کر پھر تکیے پر سر رکھ دیا اور ناہید سے کہا :- "ان کے بھائی نے میرے لئے بہت تکلیف اُٹھائی - وُہ اب کہاں ہیں ؟"

"وہ باہر سو رہے ہیں"۔

"آپ بھی جا کر سوئیں - مجھے اب بالکل آرام ہے - دلیپ سنگھ کے نئے مرہم نے بہت فائدہ کیا ہے"۔

(۵)

چند دنوں کے بعد زبیر چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا - عربوں کا خُلق جے رام کو بہت متاثر کر چکا تھا - زبیر سے اُس کا اُنس انتہا درجے کی عقیدت اور محبت کی حد تک پہنچ چکا تھا - وُہ زبیر سے عرب کے تازہ حالات کے متعلق کافی واقفیت حاصل کر چکا تھا - عربوں کے نئے دین میں انسانی مساوات کے تخیل نے اُسے شروع شروع میں بہت پریشان کیا لیکن زبیر کی تبلیغ سے وُہ جلد ہی اس بات کا قائل ہو گیا کہ دُنیا بھر میں قیامِ امن کے لئے تمام اقوام کا کسی ایسے دین کو قبول کرنا ضروری ہے جو ہر انسان

کو مساوی حقوق دیتا ہو۔ جو تمام انسانوں کو رنگ و خون اور نسل سے نہیں بلکہ اعمال سے پہچانتا ہو۔ ابتدا میں اُس نے کھانے پینے کے معاملے میں مسلمانوں کی چھوت سے پرہیز کیا۔ لیکن چند دن زبیر کی صحبت میں رہ کر اُسے چھوت اور اچھوت کا امتیاز مضحکہ خیز نظر آنے لگا۔ اور ایک دن وُہ اپنی بہن سے مشورہ کیئے بغیر زبیر کے دسترخوان پر بیٹھ گیا۔

مایا دیوی میں اپنے بھائی سے بھی پہلے ایک ذہنی انقلاب آچکا تھا اور اس انقلاب کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اپنے بھائی کی طرح اسلام کی تعلیم سے واقف ہو چکی تھی بلکہ اس کی وجہ عربوں کا وہ اخلاق تھا جس نے ایک غیُور راجپوت لڑکی کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وُہ ایک اجنبی قوم کے انسانوں کے رحم پر ہے۔ مسلمان ملّاح اُسے دیکھتے اور آنکھیں جُھکا لیتے۔ پہلے ہی دن وہ یہ محسوس کرنے لگی کہ ان سب کی نگاہیں اُس کے بھائی کی نگاہوں سے مختلف نہیں۔

ناہید کی تیمارداری نے بھی اُسے بہت متاثر کیا تھا۔ ان سب سے زیادہ وہ خالد کے طرزِ عمل سے متاثر تھی۔ نہ جانے کیوں اُس کی نگاہیں اُسے دیکھنے اور کان اُس کی آواز کو سننے کے لئے بے قرار رہتے، اور جب وہ سامنے آتا اُسے آنکھ اُٹھانے کی جُرأت نہ ہوتی۔ وُہ بے پروائی سے مُنہ پھیر کر گزر جاتا، اور وُہ دیر تک اپنے دِل کی دھڑکنیں سُنتی رہتی۔ کبھی طرح طرح کے خیالات سے پریشان ہو کر وہ اپنے آپ کو کوستی۔

رات کے وقت وہ اپنے ہم عمر لڑکے سے مرعُوب ہونے کی بجائے

اُسے نفرت اور حقارت اور بے پروائی سے دیکھنے کا ارادہ لے کر سوتی۔ لیکن صبح کی اذان کے بعد جب عرب نماز کے لئے کھڑے ہوتے، وہ ان ارادوں کے باوجود اُٹھ کر تختۂ جہاز پر چلی جاتی، اور ایک طرف کھڑی ہو کر نیلگوں سمندر کی لہروں سے دِل بہلانے کی کوشش کرتی لیکن جلد ہی اُکتا کر مُنہ پھیر لیتی اور نمازیوں کی طرف دیکھتی۔ اور غیر شعوری طور پر اُس کی نگاہیں خالد پر مرکوز ہو جاتیں۔ خالد کی وجہ سے اُسے دُوسرے نمازیوں کا رکوعُ سجود پسند آتا۔ نماز کے بعد خالد کے ہاتھ بلند ہوتے دیکھ کر اُسے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنے کا طریقہ دلکش معلوم ہوتا۔

اسلام کے ساتھ اُس کی پہلی دلچسپی اس لئے تھی کہ یہ خالد کا دِین تھا۔ عربی زبان وہ اِس لئے سیکھنے کی کوشش کرتی تھی کہ یہ خالد کی زبان تھی۔

گنگو اور اُس کی سرگزشت

(۱)

ڈاکوؤں کے سردار کو پابہ زنجیر رکھا گیا تھا۔ دلیپ سنگھ کی ہدایت تھی کہ اُس پر کسی قسم کا اعتبار نہ کیا جائے۔ اُسے دونوں وقت کھانا پہنچانے کا کام علی کے سپرد تھا، اور علی کو ہر وقت یہ فکر رہتی کہ شاید اُس کا پیٹ نہیں بھرا اور ہر کھانے پر بوڑھے سردار کو علی کے اصرار پر ایک دو لقمے زیادہ ہی کھانا پڑتے۔

زبیر کا سلوک بھی اُس کی توقع کے خلاف تھا۔ زبیر دن میں ایک دو دفعہ ضرور اُس کے پاس آتا۔ پہلی بار اُس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی سندھی میں باتیں کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اُسے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ وہ عربی میں بے تکلفی سے بات چیت کر سکتا ہے۔

ایک دن اُس نے زبیر سے کہا، "موت کے انتظار میں جینا میرے لئے بہت صبر آزما ہے۔ اگر آپ مجھ پر رحم نہیں کرنا چاہتے تو میں چاہتا ہوں کہ مجھے جو سزا ملنی ہے جلد مل جائے۔"

زبیر نے جواب دیا، "مجھے تمہارے بڑھاپے پر ترس آتا ہے لیکن تمہیں اس وقت تک قید سے نہیں چھوڑا جا سکتا جب تک مجھے یہ یقین

نہ ہو کہ تم آزاد ہو کر پھر یہی پیشہ اختیار نہ کر لو گے"۔

اُس نے جواب دیا "میرے جہاز غرق ہو چکے ہیں اور اب میں بڑھاپے کے باقی دِن کسی جنگل میں چھپ کر گزارنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہوں"۔

"ڈاکو ہر جگہ خطرناک بن سکتا ہے۔ تم سمندر میں جہازوں کو لُوٹتے تھے خشکی پر لوگوں کے گھروں میں ڈاکے ڈالو گے۔ اگر میں تمہیں بصرہ لے جاؤں تو وہاں غالباً تمہارے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ اور اگر تمہارا فیصلہ جے رام پر چھوڑوں تو باقی عمر تمہیں جیل کی کوٹھڑی میں گزارنی پڑے گی"۔

ڈاکوؤں کے سردار نے جواب دیا "مَیں آپ کی حکومت کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ دیبل کی حکومت کو مجھے سزا دینے کا کوئی حق نہیں"۔

"وُہ کیوں؟"

"وُہ اِس لئے کہ مَیں گزشتہ چند برس جو کچھ سمندر میں اپنے جہاز پر سوار ہو کر کرتا رہا ہوں، وہی کچھ سندھ کا راجہ تخت پر بیٹھ کر کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُس کے اہل کار کمزوروں اور غریبوں کو لُوٹتے ہیں۔ میرے ساتھی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی بجائے صرف بڑے بڑے جہازوں کو لُوٹتے ہیں۔ ہمارا پیشہ ایک ہے۔ لیکن ہمارے نام مختلف ہیں۔ مَیں ایک ڈاکو ہوں اور وُہ ایک راجہ۔ اُس کی طرح اُس کا باپ بھی ایک راجہ تھا۔ لیکن میرا باپ میری طرح ایک ڈاکو نہ تھا۔ مَیں خود بھی ڈاکو نہ بنتا لیکن ظُلم نے مجھے ایسا بنا

دیا۔ خیر اِن باتوں کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ غالب ہیں اور میں مغلوب لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ مجھے سندھ کی حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے خود جو سزا چاہیں دے لیں۔"

زبیر نے کہا۔ "میں تمہاری سرگزشت سُننا چاہتا ہوں۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے قدرے تامّل کے بعد مختصر الفاظ میں اپنی سرگزشت یوں بیان کی:-

(۲)

"میرا نام گنگو ہے۔ میں دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اپنے باپ کی طرح میرا پیشہ بھی ماہی گیری تھا۔ بیس سال کی عمر میں میرے سر سے والدین کا سایہ اُٹھ گیا۔ ہمارے گاؤں میں ایک لڑکی تھی۔ اُس کا نام لاجونتی تھا اور تھی بھی وُہ لاجونتی۔ اُس کی آنکھیں ہرنی کی آنکھوں سے زیادہ دلفریب اور اُس کی آواز کوئل کی آواز سے زیادہ میٹھی تھی۔ لوگ اُسے جل پری کہا کرتے تھے۔ گاؤں میں کوئی ایسا نوجوان نہ تھا جو لاجو پر جان دینے کے لئے تیار نہ ہو۔ لیکن وُہ صرف مجھے چاہتی تھی۔ اُس کا باپ ایک سادہ دِل آدمی تھا۔ برسات میں ایک دفعہ دریا زوروں پر تھا اور اُس نے شرط لگائی کہ میں لاجو کی شادی اُس کے ساتھ کروں گا جو تیر کر دریا عبور کرے گا۔ ہمارے گاؤں میں اچھے اچھے تیراک تھے۔ لیکن برسات میں دریا کا بہاؤ دیکھ کر کسی کو پانی میں کُودنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں لاجو کے لئے جان تک قربان کرنے کو تیار تھا۔ میں نے یہ شرط پُوری کی اور چند دنوں

کے بعد میری اور اُس کی شادی ہوگئی۔

ہم دونوں خوش تھے۔ اور زیادہ وقت کشتی پر گزارتے تھے۔ میں مچھلیاں پکڑا کرتا تھا۔ وُہ کھانا پکایا کرتی تھی۔ رات کے وقت ہم گاتے اور ہنستے، ہنستے اور گاتے تاروں کی چھاؤں میں سو جاتے عجیب دن تھے وہ بھی!"

یہاں تک کہہ کر گنگو کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور دیر تک ہچکیاں لینے کے بعد اُس نے پھر اپنی داستان شروع کی:۔

"لیکن ایک دن ایسا آیا کہ مجھے لاجو سے جُدا ہونا پڑا ہمیشہ کے لئے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ایک نیچ ذات اور کمزور آدمی کے لئے ایک خوبصورت بیوی رکھنا پاپ ہے۔ ہمارے گاؤں سے ایک کوس کے فاصلے پر ہمارے علاقے کے سردار کا شہر تھا۔ ایک دن وہ چند سپاہیوں کے ساتھ دریا پر آیا اور مجھے پار لے جانے کے لئے کہا۔ کشتی پر سوار ہو کر وہ لاجو کو بُری طرح گھُور رہا تھا۔ اُس کے پُوچھنے پر مَیں نے اُسے بتایا کہ یہ میری بیوی ہے۔ اور وہ بولا "یہ کسی ماہی گیر کی لڑکی معلوم نہیں ہوتی۔ تم اسے کہاں سے لائے؟" مَیں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دُوسرے کنارے پر پہنچ کر اُس نے مجھے بتایا کہ مَیں شام تک واپس آجاؤں گا۔ تم اتنی دیر میرا انتظار کرو۔ لیکن وہ شام سے پہلے ہی واپس آگیا۔ اور مَیں نے اُسے دوسرے کنارے پہنچا دیا۔ وہ میرا نام پُوچھ کر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ ہمارے گاؤں کے ماہی گیروں کا شکار دیکھنے کے بہانے سے کبھی کبھی ہمارے گاؤں میں چلا آتا۔ گاؤں کے لوگ اُسے اپنے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتا دیکھ کر خوش ہوتے۔ لیکن لاجو نے ایک دن مجھے کہا کہ اس کی نیت درست

نہیں۔ وہ میری طرف بہت بری نظروں سے دیکھتا ہے۔

ایک شام لاجو حسب معمول کشتی پر کھانا پکا رہی تھی۔ وہ گھوڑے پر آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا "تمہارے پاس کوئی تازہ شکار ہو تو لاؤ۔" میں نے تھوڑی دیر پیشتر دو بڑی بڑی مچھلیاں پکڑی تھیں۔ وہ میں نے اُسے پیش کیں۔ اس نے مجھے مچھلیاں اٹھا کر اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ شہر دور نہ تھا اور میں نے لاجو سے کہا "میں کھانا تیار ہونے تک آ جاؤں گا۔"

میں اُس کے گھوڑے کے پیچھے چل رہا تھا کہ راستے میں جھاڑیوں کی آڑ سے دس آدمی نمودار ہوئے اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اُن کی گرفت سے آزاد ہونے کی جدوجہد کی۔ لیکن کسی نے میرے سر پر لاٹھی ماری اور میں تیورا کر گر پڑا۔ اُس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک تاریک کوٹھڑی میں پڑا تھا۔"

(۳)

دو دن میں بھوکا اور پیاسا جان کنی کی حالت میں وہاں پڑا رہا۔ تیسرے دن کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور لاجونتی کے ساتھ تین آدمی جن میں سے ایک کھانا اور پانی اُٹھائے ہوئے تھا اور دو کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں، کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ لاجو کا رنگ زرد تھا اور اُس کی آنکھیں دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنسوؤں کا تمام ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی مجھے بھوک اور پیاس بھول گئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر اُس کے ساتھ لپٹ جاؤں۔ لیکن میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ لاجو نے سپاہیوں

کی طرف دیکھا اور وہ تلواروں سے میری رسیاں کاٹ کر باہر نکل گئے۔

میں نے پوچھا: "لاجو! تم یہاں کیسے پہنچیں؟" اور وہ ہونٹ بھینچ کر اپنی چیخوں کو ضبط کرتے ہوئے میرے ساتھ لپٹ گئی۔ لیکن اچانک اُس نے خوف زدہ ہو کر مجھے چھوڑ دیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میرے چلے آنے سے تھوڑی دیر بعد چند آدمیوں نے کشتی پر حملہ کیا اور اُسے پکڑ کر سردار کے پاس لے آئے۔ اُسے میرا حال معلوم نہ تھا۔ اور وہ بے غیرتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دینا چاہتی تھی۔ لیکن سردار نے اُسے میری قید کا حال بتا کر یہ دھمکی دی کہ تو اگر اُس کے محل میں بے حیائی کی زندگی بسر کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوئی تو تیرا شوہر اس کوٹھڑی میں بھوکا اور پیاسا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔ اب وہ میرے پاس آئی تھی یہ بتانے کے لئے کہ گنگو تم آزاد ہو۔ تم جاؤ اور یہ سمجھو کہ تمہاری لاجو مر گئی۔ وہ اپنی عصمت سے میری آزادی کا سودا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے اُسے غلط سمجھا۔ میں نے یہ سمجھا کہ وہ ایک غریب ملاح کی کشتی چھوڑ کر محلوں میں رہنا چاہتی ہے۔ میں نے اُسے بُرا بھلا کہا۔ گالیاں دیں اور ان ظالم ہاتھوں سے چند تھپڑ بھی مارے۔ لیکن وہ پتھر کی مورتی کی طرح کھڑی یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اُس نے صرف یہ کہا: "گنگو! میں بے عزتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دوں گی۔ لیکن میں یہاں اس لئے آئی ہوں کہ مجھے تمہاری جان اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ بھگوان کے لئے تم جاؤ۔ یہ موقع نہ گنواؤ۔ ممکن ہے کہ تم آزاد ہو کر مجھے اس ظالم کے پنجے سے چھڑانے کی کوئی تدبیر سوچ سکو۔"

اُس کے آنسوؤں اور آہوں نے میری غلط فہمی دُور کر دی۔ مَیں نے اُسے پھر گلے لگا لیا۔ اور اُس کے ساتھ وعدہ کیا کہ مَیں جلد آؤں گا۔ مَیں اِس محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دُوں گا۔"

قید خانے کا دروازہ پھر کھُلا۔ سپاہیوں کی بجائے وُہ ظالم بھیڑیا اندر داخل ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں ننگی تلوار نہ ہوتی تو مَیں یقیناً اُس پر حملہ کر دیتا۔ اُس نے آتے ہی لاجو سے کہا۔" اب بتاؤ کیا فیصلہ کیا تم نے؟ اِس کی زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

لاجو نے جواب دیا۔" اگر مَیں آپ کی شرط مان لوں تو اِس بات کا کیا ثبوت کہ یہ زندہ اور سلامت شہر سے نکل جائیں گے؟"

اُس نے کہا۔" مَیں بچن دیتا ہوں۔"

لاجو آنسو بہاتی ہوئی اُس کے ساتھ چلی گئی اور مجھے چار سپاہی شہر سے باہر لے آئے۔ اُن کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں، اور مجھے سردار کے وعدے پر اعتبار نہ تھا۔ شہر سے باہر نکل کر جب ہم اُس جنگل کے قریب پہنچے جو دریا کے کنارے دُور دُور تک پھیلا ہُوا تھا۔ ایک شخص نے پیچھے سے اچانک مجھ پر وار کیا۔ مجھے پہلے ہی اس حملے کی توقع تھی اور مَیں نے ایک طرف کُود کر اپنے آپ کو بچا لیا۔ اس پر چاروں آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن میں بھاگنے میں اُن سے تیز تھا۔ مَیں جلد ہی جنگل میں پہنچ کر ایک جھاڑی کے نیچے چھپ گیا۔ وُہ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

شام ہو رہی تھی اور میں چھپتا چھپاتا دریا کے کنارے پہنچا۔ میری کشتی جل رہی تھی اور دریا کے کنارے وہ چاروں سپاہی کھڑے تھے۔ ان واقعات نے میرے جیسے امن پسند آدمی کو ایک بھیڑیا بنا دیا۔ میں گاؤں کی طرف بھاگا۔ میری آواز میں ایک اثر تھا، اور آن کی آن میں چند نوجوان لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کر میرے ساتھ نکل آئے۔ ہمیں دیکھ کر سپاہی سراسیمہ ہو کر بھاگے۔ ہم نے کسی کو بچ کر نکلنے کا راستہ نہ دیا۔ اور چاروں کو مار کر اُن کی لاشیں دریا میں پھینک دیں۔ آدھی رات تک میں نے ماہی گیروں کی بیس پچیس بستیوں سے کوئی دو سو جوان اکٹھے کر لئے اور تیسرے پہر سردار کے محل پر دھاوا بول دیا۔ شہر کے لوگ پہلے ہی اُس کے مظالم سے تنگ تھے۔ کوئی اس کی مدد کے لئے نہ نکلا۔ اُس کے چند سپاہیوں نے مقابلہ کیا۔ لیکن اکثر نے بھاگ کر لوگوں کے گھروں میں پناہ لی۔ ہم نے سردار کو پکڑ لیا۔ اور اُس سے لاجو کے متعلق پوچھا۔ وہ ہر سوال پر صرف یہ جواب دیتا تھا ”میں بے قصور ہوں۔ بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو۔“ میں نے مشعل دکھا کر اُسے زندہ جلا دینے کی دھمکی دی۔ تو وہ مجھے محل کی نچلی منزل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ فرش پر لاجو کی لاش دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ وہ ہاتھ باندھ کر یہ کہہ رہا تھا ”میں نے اسے نہیں مارا۔ اُس نے خود مکان کی چھت سے چھلانگ لگا دی تھی۔ تم سپاہیوں سے پوچھ سکتے ہو۔ بھگوان کے لئے مجھ پر دیا کرو۔“ میں نے جلتی ہوئی مشعل اُس کی آنکھوں میں ٹھونک دی، اور کلہاڑی کی پے در پے ضربوں سے اُس کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔

اس کے بعد میں ایک ڈاکو تھا۔ میرے دل میں کسی کے لئے رحم نہ تھا۔ میں نے کئی سرداروں کو لوٹا، اور جب راجہ کی فوجوں نے زمین پر ہمارے لئے جگہ تنگ کر دی۔ میں نے دریا کے راستے سمندر کا رُخ کیا۔ دیبل کی بندرگاہ سے ہم نے رات کے وقت دو جہاز چوری کئے۔ اُس کے بعد میں اب تک کئی جہاز لوٹ چکا ہوں۔ میں ہر اُس شخص کو اپنا دُشمن سمجھتا ہوں۔ جو راجوں اور سرداروں کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ مجھے ہر دولت مند انسان میں اُس سردار کی رُوح نظر آتی ہے۔ مجھے ہر اُونچے ایوان میں لاجونتی جیسی مظلوم لڑکی کی رُوحیں انتقام کے لئے پُکارتی سُنائی دیتی ہیں"۔

زبیر نے کہا۔" مجھے اُس لڑکی کی دردناک موت کا سخت افسوس ہے اور سردار سے جنگ کرنے میں بھی شاید تم حق بجانب سمجھے جا سکو۔ لیکن تم ایک انسان کے ظلم کا بدلہ دُوسرے انسان سے کیسے لے سکتے ہو؟ تم نے ہمارے جہاز پر حملہ کیا اور اس پر کوئی سردار سوار نہ تھا۔ اس پر چند یتیم بچے اور عورتیں تھیں"۔

گنگو نے جواب دیا۔" مجھے افسوس ہے۔ لیکن دُوسرے جہاز پر سراندیپ کے راجہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اور آپ اُس کے معاون تھے۔ تاہم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کے جہاز پر عورتیں اور بچے سوار ہیں۔ تو میں حملہ نہ کرتا چند ماہ ہوئے۔ میں نے اِسی سمندر میں آپ کے مُلک کا ایک اور جہاز دیکھا تھا۔ لیکن میں نے اُسے صرف اس لئے چھوڑ دیا کہ اُس پر مردوں کے علاوہ چند عورتیں بھی تھیں"۔

خالد یہ سُن کر چلّا اُٹھا ”کیا اُس پر سراندیپ کے چند ملّاح بھی تھے؟“

”ہاں!“

”وہ تو ابّا کا جہاز تھا - اور ابھی تک اُس کا کوئی پتہ نہیں - تم جھوٹ کہتے ہو - تم اُن کا جہاز غرق کر چکے ہو۔“

گنگو نے جواب دیا ”اگر میں اُس جہاز کو غرق کر چکا ہوتا - تو مجھے آپ کے سامنے اُس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔“

”اُس جہاز پر ہاتھی بھی تھے؟“

”ہاں۔“

”تمہیں اُس کے متعلق یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں غرق ہوا؟“

”نہیں - مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ جہاز دیبل تک صحیح سلامت پہنچ گیا تھا۔“

زبیر نے پُوچھا ”اس سمندر میں تمہارے سوا لٹیروں کا کوئی اَور گروہ بھی ہے؟“

”ہاں!“

”کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ دیبل کے حاکم نے وُہ جہاز لُوٹ لیا ہو؟“

”ہاں میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خشکی کے ڈاکو سمندر کے لٹیروں سے زیادہ بے رحم ہیں!“

(۸)

اس گفتگو کے بعد گنگو کے ساتھ زبیر کی دلچسپی بڑھ گئی - جے رام عجیب

کشمکش میں مبتلا تھا۔ گنگو کی سرگزشت نے زبیر کی طرح اُسے بھی متاثر کیا۔ لیکن ایک وفادار سپاہی کی طرح وہ راجہ کو تختہ چینی سے بلند سمجھتا تھا۔ وہ رعایا کے کسی فرد کا یہ حق تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ کہ وہ کبھی ذاتی رنجش کی بنا پر راجہ کے خلاف اعلانِ جنگ کردے۔ وہ راجاؤں کی تقدیس کے مقابلے میں رعیت کی کمتری کا قائل تھا۔ تاہم جب زبیر نے اُس سے پُر امن رہنے کا وعدہ لے کر اُس کی زنجیریں کھلوادیں تو اُس نے مزاحمت نہ کی۔

چند دن زبیر کی صحبت میں رہ کر گنگو نے اپنے خیالات میں ایک عجیب تبدیلی محسوس کی۔ زبیر نے چند ملاقاتوں میں روم وایران کے خلاف مسلمانوں کی ابتدائی جنگوں کا ذکر کرکے اُس پر یہ ثابت کردیا تھا کہ دُنیا میں صرف اسلام ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جو جبر واستبداد کی حکومتوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ گنگو ایک ڈاکو کی زندگی اختیار کرنے کے بعد سماج کے تمام مذہبی عقاید سے کنارہ کش ہوچکا تھا۔ اُس کے لئے دُنیا ایک وسیع جھیل تھی جس میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگلتی ہیں۔ وہ خود کو ایک چھوٹی مچھلی سمجھتے ہوئے ہر بڑی مچھلی کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے تیار تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ اُس کی ہمدردی کی پہلی وجہ یہ تھی کہ وہ روئے زمین کی بڑی مچھلیوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ ایک دن زبیر نے اُسے سمجھایا کہ تم ظلم کے خلاف جنگ کرنا چاہتے ہو لیکن تمہارے ہتھیار اپنے دشمن کے ہتھیاروں سے مختلف نہیں۔ اُنہوں نے تمہاری کشتی جلائی تھی اور تم اُن کے جہاز جلاتے ہو۔ دونوں کا اصُول ظلم ہے۔ جس طرح کئی بے گناہ اُن کے ظلم

کا شکار ہوتے ہیں - اسی طرح کئی بے گناہ تمہارے ظلم کا شکار ہوتے ہیں۔ تم خود یہ تسلیم کر چکے ہو کہ تم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ تم دونوں میں سے کسی کے پاس عدل، انصاف اور امن کے لئے کوئی قانون نہیں اور جب تک تم میں سے ایک کے پاس ایسا قانون نہیں تمہاری تلواریں آپس میں ٹکراتی رہیں گی - ایک تلوار کند ہو گی تو تم دوسری اٹھا لو گے - ایک کمان ٹوٹے گی تو تم دوسری بنا لو گے - لیکن ظلم کے مقابلہ میں حق و انصاف پر لڑنے والے انسان اپنے حریف کی تلوار کند ہی نہیں کرتے بلکہ اُسے ہمیشہ کے لئے چھین لیتے ہیں - ایران اور روم پر عربوں کی فتح دراصل نظامِ باطل پر نظامِ حق کی فتح تھی - ظلم پر انصاف کی فتح تھی - ایران، مصر اور شام کے وہ لوگ جو کل حق پرستوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے آج افریقہ اور ترکستان میں ظلم کی طاقتوں کو مٹانے کے لئے ہمارے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔"

گنگو نے متاثر ہو کر پوچھا "کیا میں بھی آپ لوگوں کا ساتھ دے سکتا ہوں؟"

زبیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ایک ڈاکو کی حیثیت سے نہیں - ہمارا کام بھٹکے ہوئے قافلوں کو لوٹنا نہیں بلکہ انہیں صحیح راستہ دکھانا ہے۔ وہ انسان جو خود ایک غلط مسلک پر کاربند ہے، ایک صحیح اصول کا علمبردار نہیں بن سکتا۔"

گنگو نے نادم سا ہو کر کہا "اگر میں آپ کو یقین دلاؤں کہ میں ایک لٹیرے کی زندگی سے توبہ کرتا ہوں تو آپ مجھ پر یقین کریں گے؟"

"میں خوشی سے تم پر اعتبار کروں گا۔"

"اور آپ مجھے آزاد بھی کردیں گے ؟"

زبیر نے جواب دیا " اگر تم توبہ کے لئے یہ شرط پیش کرو، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس لئے توبہ نہیں کر رہے کہ تم اپنے افعال پر نادم ہو اور اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہو بلکہ اس لئے کہ تم آزاد ہونا چاہتے ہو"

" لیکن میری توبہ سے آپ تو یہ خیال نہ کریں گے کہ میں بزدل ہوں"

"نہیں۔ توبہ کرنا بہت بڑی جرأت کا کام ہے"

"تو میں آپ سے ایک ڈاکو کا پیشہ ترک کرنے کا وعدہ کرتا ہوں"

"مجھے تم پر یقین ہے۔ اور اگر تم اپنے ساتھیوں کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار رہو تو میں تم سب کو آزاد کر دوں گا اور جس جگہ کہو تمہیں اتار دوں گا"

گنگو نے جواب دیا " میرے ساتھیوں نے صرف میری وجہ سے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جو میری راہنمائی کے بغیر ایسی جرأت نہیں کر سکتے۔ اگر آپ انہیں سندھ کے کسی غیر آباد حصے پر اُتار دیں تو وہ پھر ماہی گیروں کا پیشہ اختیار کر لیں گے۔ وہ مدت سے میرے ساتھ ہیں اور انہیں کوئی پہچانے گا بھی نہیں۔ لیکن اُن میں چار آدمی خودسر ہیں۔ اُن کے متعلق میں آپ کو یقین نہیں دلا سکتا۔ مجھے خود اپنے اُوپر اعتماد نہیں۔ اگر آپ نے مجھے آزاد کر دیا، تو ممکن ہے کہ کسی ظالم سردار کو دیکھ کر میں صبر نہ کر سکوں اور پھر اُسی ظلم پر اُتر آؤں۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں تو ممکن ہے کہ آپ کے مُلک میں رہ کر میں بھی آپ جیسا انسان بن جاؤں۔ وہ چار آدمی جن کا میں نے ذکر کیا ہے اگر میری طرح اس جہاز پر ہوتے، تو

مجھے یقین ہے کہ آپ کی باتیں انہیں بھی متاثر کریں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے ساتھیوں سے مِل لُوں۔"

(۵)

اگلے دن یہ جہاز ایک ٹاپُو کے کنارے لنگر انداز ہوئے۔ زبیر گنگو کو ساتھ لے کر دلیپ سنگھ کے جہاز پر چلا گیا۔ گنگو نے اپنے ساتھیوں کے سامنے سندھی زبان میں ایک مختصر سی تقریر کی۔ رہائی کا مژدہ سُن کر قیدیوں کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے۔ لیکن جب گنگو نے یہ بتایا کہ وُہ لُوٹ مار سے توبہ کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے اُن کا ساتھ چھوڑ چکا ہے تو بعضوں کی خوشی غم میں تبدیل ہوگئی۔ گنگو نے یکے بعد دیگرے سب سے قسمیں لیں۔ لیکن تین آدمی جن میں سے ایک وہ بھی تھا جس کے آدھے سر، ڈاڑھی اور مونچھوں پر دلیپ سنگھ کے ساتھی اپنے استروں کی دھار کی آزمائش کر چکے تھے۔ مذبذب سے ہو کر ایک دُوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

گنگو نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا۔" کالو، واسو اور موتی تم کچھ عرصہ میرے ساتھ رہو گے۔"

اس کے بعد اُس نے زبیر سے مخاطب ہو کر کہا۔" میں اُن کے پُرامن رہنے کی ضمانت دیتا ہوں۔" زبیر نے دلیپ سنگھ سے چند باتیں کرنے کے بعد ملاحوں کو قیدیوں کی زنجیریں کھول دینے کا حُکم دیا۔

کالُو، واسو، موتی اور گنگو زبیر کے ساتھ دوسرے جہاز پر چلے آئے۔ واسو کا عجیب و غریب حلیہ دیکھ کر تمام عرب اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ علی نے

بے اختیار ایک قہقہہ لگایا۔ اور عورتوں تک یہ خبر پہنچانے کے لئے بھاگا اور جب واپس آیا تو اُس کے ساتھ ہاشم کے علاوہ چند اور بچے بھی تھے۔ تمام حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگے۔ ہاشم نے آگے بڑھ کر معصومانہ انداز میں پوچھا۔ "تمہارے چہرے کے بائیں طرف بال نہیں اُگتے؟"

تمام عرب ہنس پڑے۔ علی کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ گنگو نے ہنستے ہوئے ہاشم کو گود میں اُٹھا لیا۔

شام کے وقت خالد نے زبیر سے کہا۔ "ناہید کا خیال ہے کہ گنگو کو ابا جان کے جہاز کا ضرور علم ہو گا۔ وہ بذاتِ خود گنگو سے چند سوالات پوچھنے پر اصرار کر رہی ہے۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں ہمیں گنگو کی باتوں پر اعتبار کرنا چاہئے۔"

خالد نے کہا۔ "لیکن ناہید یہ کہتی ہے کہ اگر اُسے علم نہ بھی ہو، تو بھی وہ پتہ لگانے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ کل انہیں کوئی خواب آیا تھا اور وہ یہ کہتی ہیں کہ ابا جان زندہ ہیں۔"

"پوچھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن بہتر یہ ہو گا کہ وہ گنگو پر کوئی شک شبہ ظاہر نہ کریں۔ جاؤ اپنی بہن کو لے آؤ۔ میں گنگو کو بلاتا ہوں۔"

دلیپ سنگھ نے گنگو کو بلا لیا، اور ناہید کے ساتھ مایا دیوی بھی آ گئی۔ ناہید کے چہرے پر ایک سیاہ نقاب تھی۔ اُس نے مایا دیوی کے کان میں کچھ کہا۔ اور مایا دیوی کے اثبات میں سر ہلانے پر اپنا ہار اُتار کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔

مایا دیوی نے ہار گنگو کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے چند دن ہوئے ان کے باپ کے جہاز کا ذکر کیا تھا۔ اگر آپ ان کے باپ کا پتہ لگا سکیں تو یہ آپ کا انعام ہے"۔

گنگو نے رنج و ندامت سے آبدیدہ ہو کر یکے بعد دیگرے خالد اور زبیر کی طرف دیکھا اور پھر ناہید سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بیٹی! میں اتنا گرا ہوا نہ تھا!"

ناہید نے اُس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر کہا۔ "آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ مجھے آپ پر شک نہیں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ ہماری مدد کریں"

"اس کے لئے مجھے یہ ہار دینے کی ضرورت نہ تھی۔ میں زبیر کے احسان کا بدلہ نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی لٹیرا اُس جہاز کو لوٹتا تو مجھے ضرور معلوم ہو جاتا لیکن مجھے شک ہے کہ وہ جہاز دیبل کی بندرگاہ کے آس پاس شہر کے حاکم نے لوٹا ہے"۔

ناہید نے کہا۔ "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میرا باپ زندہ ہے"۔

گنگو نے جواب دیا۔ "اگر وہ زندہ ہے تو سندھ کے کسی ایسے قید خانے میں ہو گا جہاں سے لوگ موت سے پہلے باہر نہیں نکلتے۔ لیکن میں اُس کا سراغ لگانے کا ذمہ لیتا ہوں۔ اگر اُس کا پتہ مل گیا تو میں مکران کے حاکم کے پاس اطلاع بھیج دوں گا"۔

یہ کہہ کر وہ زبیر سے مخاطب ہوا۔ "آپ مجھے دیبل کی بندرگاہ پر اُتار دیں اور جے رام اگر میری مدد کرے تو میں بہت جلد اُس کا پتہ لگا سکوں گا"۔

مایا دیوی نے کہا۔ "میں اپنے بھائی کی طرف سے تمہاری مدد کا وعدہ

کرتی ہوں۔ دیبل کا حاکم اُن کا دوست ہے اور وہ اُن سے کوئی بات نہیں چھپائے گا"

گنگو نے کہا: "حاکم کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ اور دیبل کے حاکم کو میں اچھی طرح جانتا ہوں" یہ کہہ کر وہ زبیر سے مخاطب ہوا "آپ دیبل کی بندرگاہ پر ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

زبیر نے جواب دیا "میرا ارادہ تو نہ تھا۔ لیکن جے رام کے مجبور کرنے پر میں ایک دو دن وہاں ٹھہرنے کا ارادہ کر چکا ہوں"

گنگو نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ سندھ کے راجہ اور دیبل کے حاکم پر جے رام کا کتنا اثر ہے۔ ورنہ میں آپ کو سندھ کے ساحل کے قریب سے بھی گزرنے کا مشورہ نہ دیتا"

زبیر نے جواب دیا "ہمارے ساتھ سندھ والوں کے تعلقات اِس قدر بُرے نہیں۔ پچھلے دنوں ابوالحسن کے متعلق پُوچھنے کے لئے والیٔ مکران وہاں گیا تھا۔ راجہ اُس کے ساتھ غرور سے ضرور پیش آیا۔ لیکن اُس پر کوئی دست درازی نہیں کی۔"

گنگو نے جواب دیا "اُس کا جہاز خالی ہوگا۔ لیکن آپ کے جہاز پر ہاتھی ہیں اور وہ اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لئے ہاتھیوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے ساتھ عورتیں ہیں جن کے لئے اُس کے دِل میں کوئی عزت نہیں"

دیبل

گنگو، کالو، واسو اور موتی کے علاوہ باقی تمام قیدی دیبل سے چند کوس دُور ایک غیر آباد مقام پر اُتار دیئے گئے۔ گنگو ابو الحسن کا سُراغ لگانے کا بیڑا اُٹھا چکا تھا۔ اس لئے اُس نے ایک گجراتی تاجر کے بھیس میں اپنے باقی تین ساتھیوں کے ہمراہ دیبل کی بندرگاہ پر اُترنے کا فیصلہ کیا۔ جے رام اس مہم میں گنگو کی مدد کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ تاہم اُس نے زبیر کو بار بار یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ حکومتِ سندھ ایسا نہیں کر سکتی۔ اور اگر ابو الحسن کا جہاز دیبل کے آس پاس لُوٹا گیا ہے تو دیبل کے حاکم اور راجہ کو یقیناً اس کی خبر نہیں ہو گی۔

زبیر نے جواب دیا۔ "مجھے خود یہ شبہ نہیں۔ لیکن میں ناہید کی تشویش دُور کرنا چاہتا ہوں۔"

شام سے کچھ دیر پہلے یہ جہاز دیبل کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے بابا دیوی نے تمام عرب عورتوں کو اپنے گھر لے جانے پر اصرار کیا۔ جے رام نے تمام ملاحوں کو دعوت دی۔ لیکن گنگو نے دلیپ سنگھ کے کان میں کچھ کہا۔ اور اُس نے

جے رام کو مشورہ دیا: "آپ کئی ماہ کے بعد دیبل واپس جا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کی جائے قیام پر کسی اَور کا قبضہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دیبل کا حاکم آپ کو شہر میں جانے کی اجازت دینے میں کوئی عذر پیش کرے۔"

جے رام نے جواب دیا: "اُسے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ وہ خود آپ کا میزبان بننے پر اصرار کرے گا۔ اگر آپ میری مدد نہ کرتے تو کاٹھیاواڑ کے بیش قیمت تحائف راجہ کے پاس نہ پہنچ سکتے۔ اب تو راجہ پر بھی آپ کا حق ہے۔"

زبیر نے جواب دیا: "آپ شہر کے گورنر سے مل آئیں۔ پھر ہمیں آپ کے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

مایا دیوی نے کہا: "بھیا! آپ جائیں۔ اگر آپ کے مکان پر کوئی اَور قابض ہُوا تو یہ بہت بُری بات ہو گی۔ آپ مہمانوں کو ٹھہرانے کا انتظام کر آئیں۔ میں اتنی دیر بہن ناہید کے پاس ٹھہروں گی۔"

جے رام نے بندرگاہ سے ایک آدمی بُلا کر اُسے تحائف کا صندوق اُٹھانے کا حکم دیا۔ اور سیدھا دیبل کے گورنر پرتاب رائے کے محل میں چلا گیا۔ پرتاب رائے نے کاٹھیاواڑ کے تحائف کے ذکر کے سوا اُس کی باقی سرگزشت بے توجہی سے سُنی۔ لیکن جب اُس نے یہ بتایا کہ اُسے ڈاکوؤں سے بچا کر یہاں پہنچانے والے سراندیپ کے جہاز ہیں تو اُس نے چونک کر سوال کیا: "کیا یہ جہاز وہی تو نہیں جن پر سراندیپ کے راجہ نے عربوں کو ہاتھی بھیجے ہیں؟"

"ہاں! لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہُوا؟"

"یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ اِس پر عرب

بچے اور عورتیں بھی ہیں؟"

"ہاں!"

"یہ جہاز بحری ڈاکوؤں کے دو جہازوں کو ڈبو چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اچھی طرح مسلح ہیں۔ وہ بندرگاہ سے روانہ تو نہیں ہو گئے؟"

"نہیں۔ میں اُنہیں اپنے پاس ایک دو دن مہمان رکھنا چاہتا ہوں اُنہوں نے مجھ پر بہت احسان کئے ہیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنے آیا تھا کہ آپ کو اُن کے شہر میں ٹھیرنے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"اعتراض؛ نہیں۔ وہ باقی تمام عمر ہمارے مہمان رہیں گے۔ میں مہاراج سے اُن کے جہاز لوٹنے اور اُنہیں گرفتار کرنے کی اجازت حاصل کر چکا ہوں"

اگر اس محل پر بجلی گر پڑتی تو بھی شاید جے رام اس قدر بدحواس نہ ہوتا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے ایک بے جان مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر اُس نے سنبھل کر کہا "آپ مذاق کرتے ہیں۔"

پرتاب رائے نے ذرا تلخ لہجے میں جواب دیا "میں بچوں کے ساتھ مذاق کرنے کا عادی نہیں۔ ہمیں سندھی تاجروں سے ان جہازوں کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی، اور مہاراج کا یہی حکم ہے کہ ان جہازوں کو چھین لیا جائے۔ مہاراج تحائف کا یہ صندوق دیکھنے سے زیادہ اِس بات پر خوش ہوں گے کہ آپ مال و متاع سے بھرے ہوئے دو جہاز یہاں لے آئے ہیں۔"

جے رام نے چلّا کر کہا "نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ میرے مہمان ہیں۔ وہ میرے دوست اور میرے محسن ہیں۔"

پرتاب رائے نے ڈانٹ کر کہا ”ہوش سے بات کرو۔ تمہیں معلوم نہیں تم کہاں کھڑے ہو؟“

لیکن جے رام نے کہا ”یہ انسانیت کے خلاف ہے۔ تم ایک ایسی قوم کی دشمنی مول لو گے جو سندھ جیسی کئی سلطنتیں پاؤں تلے روند چکی ہے مہاراج کو اس قسم کا مشورہ دینے والے نے اُن کے ساتھ اچھا نہیں کیا میں جانتا ہوں۔ مہمان کی رکھشا ایک راجپوت کا دھرم ہے۔“

”راجہ کے باغی ہو کر تم کہیں نہیں جا سکتے۔“ یہ کہتے ہوئے پرتاب رائے نے پہرہ داروں کو آواز دی۔ اور آن کی آن میں چار سپاہیوں نے ننگی تلواروں سے اُس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

جے رام کو اپنی تلوار بے نیام کرنے کا موقع نہ ملا۔ پرتاب رائے نے کہا۔ ”تمہیں کچھ دیر میری قید میں رہنا پڑے گا۔ بندرگاہ سے واپس آ کر میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ کل تمہیں مہاراج کی طرف روانہ کر دیا جائے گا۔ اگر تم اپنے مہمانوں کی جان بخشی کروا سکو تو میں اُنہیں رہا کر دوں گا۔ لیکن تمہاری خوشی کے لئے میں راجہ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔“

سپاہیوں نے جے رام کو محل کی ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ جے رام دروازے کو دھکے دینے، دروازے سے سر پٹخنے اور شور مچانے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اُسے اپنی بہن کا خیال آیا اور وہ پھر اُٹھ کر دروازے پر ٹکریں مارنے لگا۔ اُس نے تلوار نکالی لیکن مضبوط کواڑ پر چند ضربیں لگانے کے بعد وہ بھی ٹوٹ گئی۔ اُس نے ٹوٹے ہوئے پھل کی نوک اُٹھا کر اپنے سینے

میں گھونپنے کا ارادہ کیا۔ لیکن کسی خیال نے اُس کا ہاتھ روک لیا اور وہ اُٹھ کر بے قراری سے کوٹھڑی میں ٹہلنے لگا۔ پھر اُسے ایک خیال آیا اور اُس نے پہریداروں کو آوازیں دیں۔ اُنہیں طرح طرح کے لالچ دیئے لیکن کسی نے اُس کے حال پر توجہ نہ دی۔ اُس نے اُنہیں راجہ کے پاس شکایت کرنے کی دھمکیاں دیں۔ لیکن جواب میں پہرہ داروں کے قہقہے سُنائی دیئے۔

(۲)

جے رام کے شہر جانے سے کچھ دیر بعد گنگو اور اُس کے تین ساتھی شام کے دھندلکے میں زبیر سے رخصت ہو کر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر اور بندرگاہ میں کوئی دو کوس کا فاصلہ تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اُنہیں پندرہ بیس سوار اور اُن کے پیچھے قریباً ڈیڑھ سو پیدل سپاہی بندرگاہ کا رُخ کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ گنگو کا ماتھا ٹھنکا اور وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ سوار اور پیدل گزر گئے تو گنگو نے اپنے ساتھیوں سے کہا "شہر کا سردار مسلح سپاہی لے کر بندرگاہ کی طرف جا رہا ہے۔ اُن کی رفتار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نیت ٹھیک نہیں۔ ہمیں واپس جانا چاہیئے"۔

کالو نے کہا "اگر وہ واقعی کسی بُری نیت سے جا رہے ہیں تو ہم لوٹ کر کیا کر سکتے ہیں؟ انہیں تو جہازوں کے لنگر اُٹھانے اور بادبان کھولنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ ہمیں اپنی فکر کرنی چاہیئے"۔

گنگو نے کہا "اگر تم میرا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ لیکن میں ضرور جاؤں گا۔ اور رامو، موتی تم بھی اگر چاہو تو جا سکتے ہو"۔

اُن دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "نہیں۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

کالو نادم سا ہو کر بولا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ لیکن ہم کر کیا سکتے ہیں؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "یہ ہم وہاں پہنچ کر دیکھیں گے۔"

موتی نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ جے رام نے اپنے محسنوں کو دھوکا دیا ہے۔"

گنگو نے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اُس کی نیت بُری ہوتی تو اپنی بہن کو وہاں کیوں چھوڑ جاتا؟"

واسو نے کہا۔ "یہ سمجھنا مشکل نہیں۔ وہ اپنی بہن کو اِس لئے اُن کے پاس چھوڑ گیا تھا کہ وُہ اُس کے جانے کے بعد بندرگاہ پر ٹھیرنے کا ارادہ تبدیل نہ کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی بھی اس سازش میں شریک تھی۔ دیکھنے میں کتنی بھولی بھالی ہے وُہ۔ جہاز پر وُہ اُس عرب لڑکی کو اپنی بہن کہا کرتی تھی۔"

گنگو نے کہا۔ "اور جے رام خالد کو چھوٹا بھائی کہا کرتا تھا اور جب زبیر بیمار تھا وُہ دن رات اُس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ جھُوٹا، مکار، دغا باز! کاش وہ میرے ہاتھ پڑ جائے۔ لیکن وُہ لڑکی ـــ کالو وُہ ہمارے ہاتھ سے نہ جائے۔ اُسے پکڑ کر ہم بہت سے کام نکال سکتے ہیں۔ چلو جلدی کرو۔ یہ باتوں کا وقت نہیں۔"

گنگو اور اُس کے ساتھی پوری رفتار سے بندرگاہ کی طرف بھاگنے لگے۔

(۳)

عرب ملّاح جہاز پر نمازِ مغرب ادا کرنے کے بعد دُعا کر رہے تھے، کہ

دلیپ سنگھ نے اپنے جہاز سے اُن کے جہاز پر پہنچ کر اُنہیں بندرگاہ کی طرف متوجّہ کیا۔ زبیر اور اُس کے ساتھی ساحل پر مسلّح سپاہی جمع ہوتے دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ چار آدمی ایک کشتی میں سوار ہو کر جہاز پر پہنچے اور اُن میں سے ایک نے سندھی زبان میں کہا۔ "دیبل کے حاکم سردار پرتاب رائے آپ لوگوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ وہ اِن جہازوں کے افسرانِ اعلےٰ سے مِلنا چاہتے ہیں۔"

دلیپ سنگھ نے پرتاب رائے کے پیام رساں سے پُوچھا۔ "لیکن جے رام کہاں ہے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "وہ مہاراج پرتاب رائے سے مِل کر آپ لوگوں کی دعوت کا انتظام کرنے کے لئے اپنی قیام گاہ پر چلے گئے ہیں۔ مہاراج خود آپ کے استقبال کے لئے آئے ہیں۔"

دلیپ سنگھ نے زبیر سے عربی میں کہا۔ "یہ ضرور کوئی فریب ہے لیکن ہمارے لئے جانے کے سِوا کوئی چارہ نہیں۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "میں خود حیران ہوں کہ دیبل کا حکمران اتنے سپاہی ساتھ لے کر کیوں آیا ہے۔ لیکن مجھے جے رام سے فریب کی توقع نہیں۔ اُس کی بہن اِس جہاز پر ہے۔"

ایلچی نے پھر پُوچھا۔ "میں مہاراج کے پاس کیا جواب لے جاؤں؟"

زبیر نے کہا۔ "ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔"

زبیر اور دلیپ سنگھ کشتی میں سوار ہو کر ساحل پر پہنچے۔ دلیپ سنگھ پرتاب رائے کے سامنے جھک کر آداب بجالایا۔ لیکن زبیر کی گردن میں خم نہ آنے پر پرتاب رائے

نے کہا۔ "تو تم عرب کے باشندے ہو۔ تم میں سے کسی کو بڑوں کا ادب کرنا نہیں آتا؟"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "اُن کے مذہب میں انسان کے آگے جھکنا پاپ ہے۔"

پرتاب رائے نے جواب دیا۔ "ہمارے پاس رہ کر اسے انسانوں کے سامنے جھکنا بھی آجائے گا۔"

دلیپ سنگھ نے پوچھا۔ "آپ کا مطلب؟"

پرتاب رائے نے جواب دیا۔ "کچھ نہیں، تمہارے جہازوں پر کیا ہے؟"

دلیپ سنگھ نے کہا۔ "جے رام نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ آپ ہم سے کیوں پوچھتے ہیں؟"

"جے رام نے جو کچھ بتایا ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ جہاز یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

"جہاز یہاں سے نہیں جا سکتے۔ وہ کیوں؟"

"یہ راجہ کا حکم ہے۔"

دلیپ سنگھ نے چاروں طرف دیکھا۔ زبیر اور اُس کے گرد مسلح سپاہیوں کا گھیرا تنگ ہو چکا تھا۔ اُس نے عربی زبان میں زبیر کو صورتِ حالات سے آگاہ کیا اور زبیر کے سمجھانے پر وہ پرتاب رائے سے مخاطب ہوا:۔

"یہ سندھ کے نادار ملاحوں کی کشتیاں نہیں جن پر آپ دست درازی کر سکیں۔ یہ عربوں کے جہاز ہیں۔ اِن پر اُس قوم کی بہو بیٹیاں سوار ہیں، جو سرکشوں اور باغیوں کے مقابلے میں آندھی کی طرح اُٹھتی ہے اور بادل کی

طرح چھا جاتی ہے۔ جو آسمان سے بجلیاں گرتی دیکھ کر نہیں ڈرتے، وہ ان کی تلوار سے پناہ مانگتے ہیں۔"

پرتاب رائے نے غضب ناک ہو کر تلوار نکال لی۔ دلیپ سنگھ اور زبیر نے تلواریں کھینچنے کی کوشش کی۔ لیکن کئی ننگی تلواروں اور چمکتے ہوئے نیزوں نے اُن کے ہاتھ روک لئے۔ پرتاب رائے نے کہا: "تم سندھی معلوم ہوتے ہو لیکن تمہاری رگوں میں کسی بُزدل، غدار اور کمینے آدمی کا خون ہے۔"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا "دُنیا میں سب سے بڑی غداری اور کمینگی اپنے مہمان کو دھوکا دینا ہے اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ تم۔۔۔"

دلیپ سنگھ کا فقرہ پُورا نہ ہُوا تھا کہ پرتاب رائے کی تلوار کی نوک اس کے سینے میں اُتر گئی اور وہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ زبیر نے جُھک کر اُسے ہاتھوں کا سہارا دیا۔ اُس نے ایک جھرجھری لے کر زبیر کی طرف دیکھا اور کہا "زبیر! تمہارے ساتھ میرا سفر ختم ہُوا۔ مَیں دل پر ایک بھاری بوجھ لے کر جا رہا ہوں۔ مَیں جہالت کی گود میں پلا۔ ابوالحسن نے مجھے انسان بنایا اور تم نے میرے دل میں اسلام کے لئے ایک تڑپ پیدا کی۔ لیکن نہ معلوم کیوں میں اب تک اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنے سے جھجکتا رہا۔ مَیں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر نماز پڑھ چکا ہوں، روزے رکھ چکا ہوں۔ لیکن اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے سے جھجکتا رہا۔ اب مَیں ارادہ کر رہا تھا کہ بصرہ پہنچ کر کلمۂ توحید پڑھوں۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ میرے لئے دُعا کرنا۔ مجھے بھول نہ جانا۔ مجھے ناہید کا افسوس ہے۔ خدا اُسے بے رحم دشمن کے ہاتھوں سے بچائے — ہاں۔۔۔

مجھے ...... بھول نہ جانا۔ میرے لئے دُعا کرنا۔"

دلیپ سنگھ نے پھر ایک جھرجھری لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند بار کلمۂ توحید دُہرایا۔ اُس کی آواز خفیف اور مبہم ہوتی گئی۔ ہونٹ کپکپائے بھنچے اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ بصرہ کے مسافر کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کسی ایسی منزل کو دیکھ رہی تھیں جس کے مسافر واپس نہیں آتے۔ دلیپ سنگھ دائمی نیند کی گود میں جا چکا تھا۔ زبیر نے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہا اور دلیپ سنگھ کا سر زمین پر رکھ کر حقارت سے پرتاب رائے کی طرف دیکھنے لگا۔

سپاہی کشتیوں پر سوار ہو کر تیر برساتے ہوئے جہازوں کا رُخ کر رہے تھے اور جہازوں سے تیروں کا جواب تیروں میں آ رہا تھا۔ زبیر کے لئے فرار کی تمام راہیں بند تھیں۔ پرتاب رائے کے اشارے سے آٹھ دس سپاہی اُس پر پل پڑے اور اُسے رسیوں میں کس کر زمین پر ڈال دیا۔ زبیر حسرت سے اپنے جہازوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

(۴)

جہاز پر ناہید کے علاوہ دوسری عرب عورتیں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ لڑ رہی تھیں۔ ہاشم دیر تک دوسرے بچوں کے ساتھ ایک کونے میں چھپ کر نہ بیٹھ سکا وہ اُوپر آکر خالد کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اور پوچھنے لگا۔ "ہمیں کتنی بار بحری ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنا پڑے گا؟"

خالد نے کمان میں تیر چڑھاتے ہوئے مُڑ کر دیکھا۔ ہاشم کے قریب مایا دیوی حیران و ششدر کھڑی تھی۔ اُس نے کہا "مایا دیوی! تم ہاشم کو

نیچے لے جاؤ۔"

مایا دیوی ہاشم کو اُٹھا رہی تھی کہ ایک سنسناتا ہُوا تیر آیا اور ہاشم کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ مایا دیوی نے بھاگ کر اُسے ایک کونے میں لٹا دیا اور تیر نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہاشم ایک ہلکی سی آہ اور معمولی سی کپکپاہٹ کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔ مایا دیوی ہچکیاں لیتے ہوئے اُٹھی۔ لیکن پیچھے سے ایک مضبوط ہاتھ کی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گئی۔

"کون؟ گنگو!" اُس نے چاند کی دھیمی روشنی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے پُوچھا۔

"ہاں میں ہوں۔ کالو! اُٹھا لو اسے اگر شور مچائے تو گلا گھونٹ دینا۔"

کالو مایا دیوی کو اُٹھا کر جہاز کی پچھلی طرف رسّی کی ایک سیڑھی سے اُتر کر ایک کشتی پر سوار ہو گیا۔

گنگو نے آگے بڑھ کر خالد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اب مقابلہ کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اُن کی تعداد ہم سے بہت زیادہ ہے اور عقب سے بھی دو جہاز ہم پر حملہ کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ میری کشتی جہاز کے پیچھے کھڑی ہے۔ میں تمہیں اور ناہید کو بچا سکتا ہوں۔"

خالد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ہم اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

"لیکن تم نہیں جانتے کہ وہ لوگ تمہاری بہن کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔"

"لیکن میں جہاز کی تمام عورتوں کو اپنی بہنیں سمجھتا ہوں، اور اب جے رام

کی دغا بازی سے مجھے کسی پر اعتماد نہیں رہا۔"

ایک تیر ناہید کو لگا اور وہ پسلی پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ خالد نے آگے بڑھ کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اُس نے کہا "میں ٹھیک ہوں خالد! تم میری فکر نہ کرو۔"

خالد نے اُس کے اصرار کے باوجود اُسے اُٹھا کر ہاشم کے قریب بٹھا دیا۔ ہاشم کی لاش دیکھ کر ناہید کو اپنا زخم بھُول گیا۔ اُس نے ہاشم کو جھنجھوڑا۔ آوازیں دیں اور انتہائی کرب کی حالت میں بولی "ہاشم تم اُوپر کیوں آئے؟"

گنگو نے بے خبری کی حالت میں ناہید کی پسلی سے تیر نکال کر پھینک دیا اور واسو سے کہا "اسے اُٹھا لو!"

واسو ناہید کو اُٹھانے کے لئے جھکا۔ لیکن خالد نے آگے بڑھ کر اُسے پیچھے دھکیل دیا اور کہا "تم، جے رام اور یہ سپاہی مختلف راستوں سے آئے تھے لیکن تم سب کا مقصد ایک ہے۔ جاؤ ہم تمہیں ایک دفعہ معاف کر چکے ہیں۔"

گنگو نے کہا "بیٹا! اگر باتوں کے لئے وقت ہوتا تو میں تمہارا شک دُور کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن ہم پر دُشمن کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے اور اگر ہم نے چند اور لمحات ضائع کر دیئے تو بھاگنے کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔ افسوس میں تمہیں سوچنے کی مہلت بھی نہیں دے سکتا۔ بیٹی! مجھے معاف کرنا!"

یہ کہتے ہوئے گنگو نے اچانک ایک چھوٹا سا ڈنڈا خالد کے سر پر دے مارا۔ خالد لڑکھڑایا۔ لیکن گنگو نے اُٹھا کر اسے کندھے پر رکھ لیا۔ واسو نے ناہید کو اُٹھا

لیا۔ اور گنگو نے موتی سے کہا۔ "تم یہ کمانیں اُٹھا لو۔ یہ ہمیں کام دیں گی"۔
حملہ آور کمندیں ڈال کر جہازوں پر سوار ہو رہے تھے اور تیروں کی لڑائی تلواروں کی لڑائی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس ہنگامے میں کسی کو ناہید، خالد اور مایا دیوی کے اغوا کئے جانے کا پتہ نہ چلا۔ جب تک یہ لوگ کشتی پر سوار ہوئے چند کشتیاں عقب سے بھی جہازوں کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ گنگو اور اُس کے ساتھیوں نے سندھی زبان میں ہاؤ ہُو کر کے حملہ آوروں کو شک نہ ہونے دیا۔ اور بچتے بچاتے جہازوں سے ایک طرف نکل گئے۔
گنگو کے کہنے پر مایا دیوی نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر ناہید کے زخم پر پٹی باندھ دی۔ خالد کو اپنے ساتھ دیکھ کر اب اُسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ گنگو پانی سے کپڑا بھگو بھگو کر خالد کے ماتھے پر رکھ رہا تھا، اور مایا کو وہ شخص جو چند لمحے پیشتر ایک بدترین دشمن کی صورت میں نمودار ہوا تھا، ایک غم گسار نظر آ رہا تھا۔
کشتی خطرے کی زد سے دور آ چکی تھی اور مایا گنگو سے ہم کلام نہ ہونے کا ارادہ کرنے کے باوجود بار بار یہ پوچھ رہی تھی۔ "اسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ یہ کیسے بے ہوش ہوا؟"
ناہید انتہائی رنج و ملال کی وجہ سے کسی سے ہم کلام نہ ہوئی۔ وہ تشویش کی حالت میں اپنے بھائی کی طرف دیکھتی۔ اور جب گنگو یہ کہتا۔ "بیٹی! تم فکر نہ کرو تمہارے بھائی کو ابھی ہوش آ جائے گا۔ مَیں تمہارا دشمن نہیں۔ مَیں سمندر کے دیوتا کی قسم کھاتا ہوں۔" ناہید خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

پھر وہ مایا دیوی سے مخاطب ہُوا "مایا! تم ایک اچھوت لڑکی ہو۔ راجپوت جھوٹی قسم نہیں کھاتے۔ میں تم سے پُوچھتا ہوں، کیا تمہیں یہ شک تھا کہ تمہارا بھائی ان لوگوں کو دھوکا دے گا؟"

"نہیں نہیں، میرا بھائی ایسا نہیں میں بھگوان کی قسم کھاتی ہوں"۔

"اور اگر یہ ثابت ہو گیا تو؟"

"تو میں ..... میں کوئیں میں چھلانگ لگا دوں گی۔ آگ میں جل جاؤں گی۔ اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ ڈالوں گی۔ بھگوان کے لئے ایسا نہ کہو" مایا دیوی کی ہچکیوں نے ناہید کو متاثر کیا اور اُس نے کہا۔ "مایا! تم اِن باتوں کی پروا نہ کرو۔ مجھے تم پر یقین ہے۔ اور اگر تمہارے بھائی نے ہمارے ساتھ دھوکا بھی کیا ہو تو اس میں تمہارا کیا قصور؟"

"میں پھر کہتی ہوں میرا بھائی ایسا نہیں۔ اس کی رگوں میں ایک راجپوت کا خون ہے۔ وہ اس قدر احسان فراموش نہیں ہو سکتا"۔

ناہید نے کہا "اس وقت ہمارا دُشمن وہ ہے جس نے ہمیں بردستی جہاز پر سے اُتارا ہے جو ہمیں کسی نامعلوم مقام پر لے جا رہا ہے"۔

گنگو نے کہا "بیٹی! کاش میں تمام بچوں اور عورتوں کو اپنے ساتھ لا سکتا۔ لیکن اس کشتی پر صرف اتنی سواریوں کی جگہ تھی۔ تم نوجوان ہو اور میں تمہیں ایک بے رحم دُشمن کے ہاتھوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ اور مایا دیوی! تم شاید باقی سب کو بچا سکو۔ میں تمہاری آزادی کے بدلے میں باقی لوگوں کو آزاد کروانا چاہتا ہوں"۔

خالد نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں اور حیران ہو کر سب کی طرف دیکھا۔ گزشتہ واقعات یاد آتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور دُکھتے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "ہمارا جہاز کہاں ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ گنگو! گنگو!! ظالم، دغاباز، فریبی، تم نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ وہ کیا کہیں گے؟ تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟"

گنگو نے ٹھنڈے دِل سے جواب دیا "خالد! یہ میری عمر میں پہلا موقع ہے کہ مجھے کسی کی گالی پر غصہ نہیں آیا۔ تم مجھے جو جی میں آئے کہو۔ لیکن مَیں نے بُرا نہیں کیا۔ مَیں صرف مایا کو لینے آیا تھا۔ لیکن تمہاری بہن کو زخمی دیکھ کر مَیں یہ گوارا نہ کر سکا کہ اُسے دشمن کے رحم پر چھوڑ دوں۔"

خالد نے حقارت سے مایا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اب سمجھا۔ جے رام نے ایک طرف سے ہم پر حملہ کرنے کے لئے سپاہی بھیج دیئے۔ اور دوسری طرف سے تمہیں مایا دیوی کو لینے کے لئے بھیج دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لٹیروں کے سردار تم نہ تھے جے رام تھا۔"

"تم درست کہتے ہو لیکن مَیں توبہ کر چکا ہوں اور جے رام نے توبہ نہیں کی۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی بہن کی خبر سننے کے بعد توبہ کرے۔"

"تو تم ہمیں اس کے پاس نہیں لے جا رہے ہو؟"

"تم دیکھ سکتے ہو بندرگاہ کس طرف ہے اور ہم کس طرف جا رہے ہیں؟"

"تو تم ہمیں کہاں لے جاؤ گے؟"

"کسی ایسی جگہ جہاں راجہ کے سپاہی نہ پہنچ سکیں۔"

خالد نے کہا۔ "اگر تمہاری نیت بری نہیں تو ہمیں اپنے ساتھیوں کے پاس چھوڑ آؤ۔"

گنگو نے کہا۔ "تمہارے ساتھی تھوڑی دیر میں دیبل کے قید خانے میں ہوں گے۔ تم قید ہونے کی بجائے قید سے باہر رہ کر اُن کی زیادہ مدد کر سکتے ہو۔"

خالد نے قدرے پُر اُمید ہو کر پوچھا۔ "تم سچ مچ اُن کی مدد کرنا چاہتے ہو؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "بیٹا! مجھے تمہارے ساتھ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر میں تمہارا دشمن ہوتا تو یقیناً اس قدر ٹھنڈے دل سے گالیاں نہ سُنتا۔"

اگلے دن یہ کشتی دریائے سندھ کے دہانے پر پہنچ گئی۔ گنگو کو اپنے ساتھی مچھلیاں پکڑتے ہوئے مل گئے۔

قیدی

(۱)

اگلے دن کوٹھڑی کا دروازہ کھُلا اور پہریدار نے جے رام کو ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور کہا "آپ کو سردار پرتاب رائے بُلاتے ہیں"۔

جے رام پہریدار کے طرزِ عمل میں اس تبدیلی پر حیران تھا اور چُپکے سے اُس کے ساتھ ہو لیا۔ پرتاب رائے اپنے دیوان خانے کے برآمدے میں آبنوس کی ایک کُرسی پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس کے سامنے چاندی کے ایک طشت میں سراندیپ کے راجہ کے وہ تحائف پڑے ہوئے تھے جو گزشتہ شام عربوں کے جہاز سے لُوٹے گئے تھے۔

اُس نے جے رام کو دیکھتے ہی جواہرات کے انبار کی طرف اشارہ کیا اور کہا "جے رام! مہاراج سراندیپ کے تحائف دیکھ کر کاٹھیاواڑ کے راجہ کے تحائف کی نسبت زیادہ خوش ہوں گے۔ اُن میں ایک ایک ہیرا تمہارے صندوق کے سارے مال سے زیادہ قیمتی ہے۔"

جے رام نے اس پر قہر آلود نگاہ ڈالی اور اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

پرتاب رائے نے کہا "لیکن تمہارا چہرہ زرد اور تمہاری آنکھیں

سُرخ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تم رات بھر نہیں سوئے۔ کوٹھڑی میں بہت گرمی ہوگی۔ بندرگاہ سے واپس آکر مجھے تمہارا خیال نہ آیا۔ ورنہ تمہیں اتنی دیر وہاں رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے مہاراج کی خدمت میں ایلچی بھیج دیا ہے۔ چند دن تک قیدیوں کے متعلق اُن کا حکم آجائے گا۔"

جے رام نے کہا۔ "تو آپ نے انہیں قید کر لیا؟"

"ہاں! میں نے تمہیں کل بھی یہ بتایا تھا کہ یہ راجہ کا حکم ہے۔"

"آپ نے انہیں لڑ کر قید کیا یا میزبان بن کر؟"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "تم ابھی بچے ہو۔ لڑائی میں سب کچھ جائز ہے۔"

"میری بہن کہاں ہے؟"

"کون؟"

"میری بہن!"

"وہ کہاں تھی؟"

"آپ مجھے بنانے کی کوشش نہ کریں۔ ایک راجپوت کی عزت پر ہاتھ ڈالنا اِس قدر آسان نہیں جس قدر آپ سمجھتے ہیں۔ میں پہلے آپ کے راجہ کا ملازم تھا، اور اب میں کاٹھیاواڑ کے راجہ کے سفیر کی حیثیت میں یہاں آیا ہوں۔ اگر آپ نے میری بہن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا، تو یاد رکھئے کاٹھیاواڑ سے لے کر راجپوتانے تک آگ کی دیوار ---- کھڑی کر دوں گا، اور مہاراج اپنے ہزاروں سپاہیوں کی جانیں ضائع کرنے کی بجائے دیبل کے ایک مغرور حاکم کو ہمارے حوالے کر دینا زیادہ مناسب

سمجھیں گے۔ رہے عرب وہ میرے مہمان تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ میری وجہ سے اس مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ ممکن ہے کہ اُن کے متعلق میری پُکار ہندوستان کے کسی گوشے میں نہ سُنی جائے۔ لیکن اُن کے بازو بہت لمبے ہیں۔ وہ جب چاہیں گے آپ کا گلا دبوچ لیں گے۔"

پرتاب رائے کو معلوم تھا کہ بعض اوقات راجہ کے غلط احکام بجالانے کا خمیازہ اہل کاروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ حاکم خطرے کے وقت اپنا قصور اہل کاروں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ عربوں کے متعلق وہ اپنے راجہ کی طرح مطمئن تھا۔ لیکن وہ کاٹھیاواڑ کے سفیر کی بہن کی ذمہ داری لینے کو تیار نہ تھا اُس نے کہا۔ "جے رام اب مجھے تمہاری دھمکیوں کی پروا نہیں لیکن تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے تمہاری بہن کے متعلق کوئی علم نہیں۔"

"آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ میں اُس جہاز پر عرب عورتوں کے پاس چھوڑ آیا تھا۔"

"عورتیں جو جہاز پر تھیں وہ سب ہماری قید میں ہیں۔ اگر تمہاری بہن اُن میں ہے تو میں ابھی تمہارے ساتھ چل کر اس سے معافی مانگتا ہوں۔ چلو۔"

بہن کو تلاش کرنے کی خواہش جے رام کے تمام ارادوں پر غالب آگئی اور وہ پرتاب رائے کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں اُس نے پوچھا "عرب ملّاحوں کے ساتھ آپ نے کیا سلوک کیا؟"

پرتاب رائے نے جواب دیا "وہ سب آخری وقت تک لڑتے رہے عورتوں اور بچوں کے علاوہ ہم صرف پانچ آدمیوں کو زندہ گرفتار کرنے میں

کامیاب ہوئے ہیں۔ دُوسرے جہاز پر سراندیپ کے ملاّحوں نے معمولی مزاحمت کی۔ لیکن جلد ہی ہتھیار ڈال دیئے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بیک وقت سراندیپ اور عرب کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔"

"مَیں نے صرف راجہ کے احکام کی تعمیل کی ہے اور جب تک میں اس عہدے پر ہوں، مَیں ایسے احکام کی تعمیل کرتا رہوں گا۔ میرے خط کے جواب میں راجہ نے اگر تمہیں بُلا بھیجا اور تم نے اُن سے قیدیوں کو رہا کرنے کی اجازت حاصل کر لی تو مجھے خوشی ہو گی۔ مَیں خواہ مخواہ کی ذمہ داری سے بچ جاؤں گا۔"

محل سے نکل کر چند قدم کے فاصلے پر جے رام اور پرتاب رائے قید خانے کی چار دیواری میں داخل ہوئے۔ پہرہ داروں نے پرتاب رائے کا اشارہ پا کر عربوں کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ عورتوں نے اپنے چہرے ڈھانپ لئے۔ عرب ملاّحوں نے جے رام کو دیکھتے ہی مُنہ پھیر لئے۔ زبیر ایک کونے میں دیوار کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے نفرت اور حقارت سے جے رام کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھیوں کی طرح مُنہ پھیر لیا۔

جے رام نے پرتاب رائے کی طرف دیکھا اور کہا "میری بہن یہاں نہیں، وہ کہاں ہے؟"

پرتاب رائے نے ایک پہرے دار کو آواز دے کر اندر بُلایا۔ اور اُس سے پوچھا۔ "کیا تمام عورتیں اسی کمرے میں ہیں یا سراندیپ کے ملاّحوں

کے کمرے میں بھی کوئی ہے؟"

"نہیں مہاراج! تمام عورتیں یہیں ہیں۔"

جے رام نے بدحواس سا ہو کر زبیر کی طرف دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی عربی میں کہا۔ "زبیر! میری طرف اِس طرح نہ دیکھو۔ مَیں بے قصور ہوں۔ تمہیں معلوم ہے میری بہن کہاں ہے؟"

زبیر کے مُنہ سے اچانک ایک بھوکے شیر کی گرج سے ملتی جلتی آواز نکلی۔ "تم میری توقع سے کہیں زیادہ ذلیل ثابت ہوئے ہو۔ تم جھوٹ سے حقیقت پر پردے نہیں ڈال سکتے۔ لیکن یاد رکھو، اگر ناہید کا بال بھی بیکا ہُوا تو خدا کی زمین پر تمہیں کوئی ایسا خطّہ نہیں ملے گا جو ہمارے انتقام سے پناہ دے سکے۔ ناہید کو اُڑانے کے لئے تم نے اپنی بہن کو جہاز پر چھوڑا تھا۔ تمہاری تدبیر کامیاب تھی۔ تم نے اپنے اُس حلیف کو ہمارا میزبان بنا کر بھیجا اور مجھے جہاز سے بُلوا لیا۔ اور خود پیچھے سے جہاز پر پہنچ کر نہ معلوم کس بہانے سے ناہید کو کہیں لے گئے۔ لیکن اگر صُلح اور جنگ کے لئے تُم لوگوں کے اصُول یہی ہیں تو یاد رکھو کہ تمہارے راجہ کے دِن گنے جا چکے ہیں۔"

پرتاب رائے نے اچانک سپاہی کے ہاتھ سے کوڑا چھین کر زبیر کے مُنہ پر دے مارا اور دوسری ضرب کے لئے تیار تھا کہ جے رام نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پرتاب رائے نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم راجہ کی توہین برداشت کر سکتے ہو مَیں نہیں کر سکتا۔"

جے رام نے کہا۔ "مَیں تم سے آخری بار پُوچھتا ہوں کہ میری بہن اور

اُس عرب لڑکی کو تم نے کہاں چھپایا ہے ؟"

اِس سوال نے پرتاب کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ اور وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔" کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے حملے کے وقت اُسے انتقامی جذبے کے ماتحت جہاز سے نیچے پھینک دیا گیا ہو؟"

جے رام نے جواب دیا " یہ لوگ دشمنی میں شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ میری بہن کے ساتھ عرب لڑکی کا غائب ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اِس سازش کی تہ میں کسی تمہارے جیسے کمینے آدمی کا دماغ کام کر رہا ہے۔"

زبیر نے پھر جے رام سے مخاطب ہو کر کہا۔" تم ان باتوں سے مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ ناہید، خالد اور تمہاری بہن بیک وقت جہاز سے غائب ہوئے ہیں۔ اور وہ یقیناً تمہاری قید میں ہیں۔ مجھے تم سے کسی نیکی کی توقع نہیں۔ لیکن ہم اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ ہمیں سندھ کے راجہ کے سامنے پیش کیا جائے، اور جب تک وہ ہمارا فیصلہ نہیں کرتا، ناہید اور خالد کو ہمارے ساتھ رکھا جائے"۔

پرتاب رائے نے چونک کر کہا " مَیں اب سمجھا جے رام اگر اُن لڑکیوں کے ساتھ جہاز پر سے کوئی آدمی بھی غائب ہوا ہے تو یہ معاملہ صاف ہے، کل رات بندرگاہ سے ایک سرکاری کشتی غائب ہو گئی ہے لیکن وہ زیادہ دُور نہیں جا سکتے۔ تم میرے ساتھ آؤ"۔

پرتاب رائے اور جے رام قید خانے سے باہر نکل کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور انہیں سرپٹ دوڑاتے ہوئے بندرگاہ پر پہنچے۔ بندرگاہ

کے پہرہ داروں نے شام کے وقت کشتی غائب ہو جانے کے متعلق پرتاب رائے کے بیان کی تصدیق کی۔ اور مایا دیوی کے متعلق جے رام کی تشویش بڑھنے لگی۔ پرتاب رائے نے چند کشتیاں اور جہاز شمال اور مغرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ دیکھ بھال کے لئے روانہ کر دیئے اور جے رام کو تسلی دی کہ وہ زیادہ دور نہیں جا سکتے۔ .... جے رام پرتاب رائے کے ساتھ واپس شہر چلا آیا۔

سہ پہر تک اپنے مکان میں مایا کے متعلق کوئی خبر نہ پاکر اُس نے پھر بندرگاہ پر جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن پرتاب رائے کا سپاہی آیا اور اُسے اپنے ساتھ اُس کے محل میں لے گیا۔

(۲)

پرتاب رائے کے محل کے پائیں باغ میں زبیر اور علی ناریل کے دو درختوں کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے۔ پرتاب رائے اُس کے چند سپاہی اور دو جلاد ہاتھ میں کوڑے لئے اُن کے پاس کھڑے تھے۔ علی اور زبیر کی جھکی ہوئی گردنیں اور عُریاں سینوں پر ضربوں کے نشانات بہ ظاہر کر رہے تھے کہ اُنہیں ناقابلِ برداشت جسمانی اذیت پہنچائی جا چکی ہے۔ ایک سپاہی نے جے رام کی آمد کی اطلاع دی اور پرتاب رائے کا اشارہ پاکر جلاد زبیر اور علی پر کوڑے برسانے لگے۔ زبیر ایک چٹان کی طرح کھڑا تھا لیکن علی کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی اور کوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ اُس کے مُنہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

باہر کے دروازے میں پاؤں رکھتے ہی علی کی چیخ پکار نے جے رام کو متوجہ کیا۔ اور اس نے بھاگ کر دونوں جلاّدوں کو یکے بعد دیگرے پیچھے دھکیل دیا۔ اور پرتاب رائے کی طرف متوجہ ہو کر کہا "یہ ظلم ہے۔ یہ پاپ ہے۔ آپ نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ آپ نے ان کا فیصلہ راجہ پر چھوڑ دیا ہے۔"

پرتاب رائے نے علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "یہ لڑکا سپاہیوں نے شہر سے تلاش کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہاری بہن کے ساتھ ہی جہاز پر سے روپوش ہوا تھا اور اس کے باقی ساتھی شہر کے آس پاس کہیں چھپے ہوئے ہیں۔"

جے رام نے آگے بڑھ کر علی سے پوچھا "تم کہاں تھے؟ میری بہن کہاں ہے؟"

علی نے سراپا التجا بن کر اس کی طرف دیکھا اور پھر گردن جھکا لی۔ جے رام نے کہا "اگر تمہیں مایا دیوی کے متعلق کچھ معلوم ہے تو بتا دو۔ میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔"

علی نے دوبارہ گردن اٹھائی اور چلا چلا کر کہنا شروع کیا "مجھے معلوم نہیں۔ مَیں سچ کہتا ہوں۔ مجھے اُن کے متعلق معلوم نہیں۔ مَیں نے جہاز پر سے کودنے سے پہلے اُنہیں تلاش کیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیسے غائب ہوئے۔"

جے رام نے پوچھا "تم شہر میں کیسے پہنچے؟"

"مَیں جہاز سے کُود کر سمندر کے کنارے ایک کشتی میں چھُپ گیا تھا۔ آج میں شہر پہنچا اور سپاہی مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے۔ تم سب ظالم ہو۔ مَیں نے تمہارا کوئی قصُور نہیں کیا!"

جے رام نے زبیر کی طرف دیکھا لیکن حیرانی، غصہ، ندامت اور افسوس کے جذبات کے ہیجان میں وہ اُس سے مخاطب ہونے کے لئے موزوں الفاظ تلاش نہ کر سکا۔ اُس کی آنکھیں ایک بار اُٹھیں اور جُھک گئیں۔ ہونٹ کپکپائے اور ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔ اُس نے پرتاب رائے کی طرف متوجہ ہو کر کہا "آپ انہیں چھوڑ دیں۔ مجھے اِن پر کوئی شبہ نہیں"۔

پرتاب رائے نے کہا "میں انہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر تمہاری بہن جہاز پر تھی تو ان کو یقیناً یہ علم ہو گا کہ وہ کہاں ہے۔ تم شاید اب تک مجھے مجرم خیال کرتے ہو اور میں ان لوگوں کی زبان سے تمہیں یقین دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تمہاری بہن کو ان لوگوں نے چھُپا رکھا ہے۔ اور اگر وُہ زندہ نہیں تو اُنہوں نے جہاز پر حملہ ہونے سے پہلے اُسے سمندر میں پھینک دیا ہو گا۔ اب یا انہیں اپنے جُرم کا اقبال کرنا پڑے گا اور یا تم کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمہاری بہن جہاز پر تھی ہی نہیں۔ اور تم نے مجھے مرعوب کرنے کے لئے یہ بہانہ تلاش کیا تھا"

پرتاب رائے نے پھر جلادوں کو اشارہ کیا اور وُہ زبیر اور علی پر پھر کوڑے برسانے لگے۔ جے رام چلایا "ٹھہرو، ٹھہرو، یہ بے قصور ہیں یہ ظلم ہے۔ انہیں چھوڑ دو" لیکن اُس کی چیخ پکار بے اثر ثابت ہوئی

اُس نے آگے بڑھ کر ایک جلاد کے مُنہ پر گھونسا رسید کیا۔ لیکن پرتاب رائے کے اشارے سے چند سپاہیوں نے اُسے پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ سپاہیوں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے جد وجہد کر رہا تھا۔ علی چیخیں مارنے کی بجائے نیم بیہوشی کی حالت میں آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ زبیر ہر کوڑے کی ضرب کے بعد جے رام کی طرف دیکھتا اور پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ بالآخر علی کے کراہنے کی آواز بند ہو گئی اور گردن اُٹھانے اور آنکھیں کھولنے کے لئے زبیر کی طاقت جواب دے گئی۔

پرتاب رائے نے ایک سپاہی کو گرم لوہا لانے کا حکم دیا۔ جے رام پھر چلایا۔ "پرتاب تم ظالم ہو، کمینے ہو۔ مجھے جو سزا چاہو دے لو۔ لیکن ان پر رحم کرو!"

پرتاب رائے نے گرج کر کہا۔ "مجھے تمہاری بدزبانی کی پروا نہیں۔ میں تمہارا فیصلہ مہاراج پر چھوڑوں گا۔ لیکن اس وقت ان کی جان میرے قبضے میں ہے۔ میں ان کی آنکھیں نکلوا دوں گا، ان کی بوٹیاں نوچ ڈالوں گا۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ زندہ بھی رہیں اور تم مہاراج کے پاس جا کر اپنی بہن کے اغوا کئے جانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ڈالو۔ اگر تمہاری بہن جہاز پر سے غائب ہوئی ہے تو میں ضرور اُس کا پتہ لگاؤں گا۔ اس کے لئے مجھے اگر ان تمام بچوں اور عورتوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا پڑا تو بھی دریغ نہیں کروں گا۔"

سپاہی نے لوہے کی گرم سلاخ پرتاب رائے کے ہاتھ میں دے دی اور وُہ زبیر کی طرف بڑھا۔ جے رام نے بلند آواز میں کہا۔ "نہیں نہیں

ٹھیرو! میری بہن جہاز پر نہ تھی۔ مَیں اکیلا آیا تھا۔ مَیں فقط اُن کی جان بچانا چاہتا تھا۔"

پرتاب رائے نے جواب دیا "لیکن مجھے کیونکر یقین آئے کہ تم راجہ کے سامنے ایسی کہانیاں بیان کر کے اُسے میرے خلاف نہیں بھڑکاؤ گے؟"

"پرتاب میں وعدہ کرتا ہوں۔ ایک راجپوت کا وعدہ۔ مجھ پر اعتبار کرو۔"

"تمہیں یہ گواہی بھی دینی پڑے گی کہ جہاز پر سے کوئی عرب لڑکی بھی غائب نہیں ہوئی۔"

"اگر تم انہیں چھوڑ دو تو میں یہ وعدہ کرنے کے لئے بھی تیار ہوں۔"

"انہیں چھوڑنا یا نہ چھوڑنا صرف راجہ کا کام ہے میں صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ ان کے ساتھ آئندہ کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ تمہیں راجہ کے سامنے یہ ماننا پڑے گا کہ تم نے ان لوگوں کو چھڑانے کی نیت سے مجھ پر دباؤ ڈالا اور اپنی بہن کو ایک بہانہ بنایا تھا۔"

جے رام نے شکست خوردہ سا ہو کر جواب دیا۔ "میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔"

پرتاب رائے نے لوہے کی سلاخ پھینکتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے خواہ مخواہ پریشان کیا۔"

(۳)

زبیر نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں۔ وُہ علی کے قریب قید خانے میں پڑا ہوا تھا۔ جے رام ٹھنڈے پانی کی بالٹی سے رومال بھگو بھگو کر اُس کے

زخموں پر ٹکور کر رہا تھا۔ ایک عورت علی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ زبیر ہوش میں آتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جے رام نے پانی کا کٹورا بھر کر اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ زبیر کے دل میں ایک لمحہ کے لئے پھر ایک بار غصہ اور حقارت کے جذبات بیدار ہوئے لیکن جے رام کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُس نے پانی کے چند گھونٹ پی لئے۔ جے رام نے فقط اتنا کہا ”زبیر مجھے افسوس ہے“ اور اُس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ زبیر نے اپنے چہرے پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا ”جے رام! تم میرے لئے ایک معمّا ہو۔ تم نے دیبل کے حکمران سے ساز باز کر کے ہمیں اس حالت تک پہنچایا۔ اس کے بعد تم میرے لئے جلّادوں سے بنرد آزما ہوئے۔ اب تم آنسو بھی بہا رہے ہو آخر ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟“

جے رام کے ہونٹوں سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔

”زبیر مجھ پر اعتبار کرو۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ تم نے میری جان بچائی تھی اور ایک راجپوت احسان فراموش نہیں ہو سکتا۔ دیبل کے سردار نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ تمہارے جہازوں پر حملہ کرنے سے پہلے مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ تم مجھ سے بدظن ہو۔ مجھے دغاباز سمجھتے ہو۔ لیکن میں بے قصور ہوں۔ اور اگر بھگوان نے موقع دیا تو میں یہ ثابت کر سکوں گا۔“

زبیر نے کہا ”اگر تم اس سازش میں شریک نہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ ناہید اور خالد کہاں ہیں؟“

جے رام نے جواب دیا ”اگر تم مایا کے متعلق کچھ نہیں جانتے تو میں خالد

اور ناہید کے متعلق کیا بتا سکتا ہوں ۔۔۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ساری رات کوٹھڑی میں بند رہا ۔ تم جہاز پر تھے ۔ بندرگاہ سے ایک کشتی بھی اُس رات غائب ہو چکی ہے ۔ اگر تم نے لڑائی سے پہلے انہیں کہیں بھیج دیا ہے تو بھگوان کے لئے مجھ سے نہ چھپاؤ ۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے انہیں پرتاب رائے کے ظالم ہاتھوں سے بچانے کی نیت سے کہیں بھیجا ہو گا ۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ مایا زندہ ہے اور کسی محفوظ جگہ پر ہے ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا ۔ میں پرتاب رائے کو یقین دلا چکا ہوں کہ میری بہن میرے ساتھ نہ تھی ۔ ورنہ وہ آج تمہیں نہ چھوڑتا ۔"

زبیر نے جواب دیا ۔" کاش میں تم پر اعتبار کر سکتا ۔ تم دونوں ناہید کو چھپا کر مایا کی ذمہ داری ہمارے سر اس لئے تھوپ رہے ہو کہ ہم راجہ سے ناہید اور خالد کے متعلق سوال نہ کر سکیں ۔"

جے رام نے کہا ۔" زبیر مجھ پر اعتبار کرو ۔ مجھے تم سے جھوٹ بولنے میں کوئی فائدہ نہیں ۔ اگر تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو مایا اور ناہید کے متعلق کوئی علم نہیں تو یہ پرتاب رائے کی شرارت ہے ۔ آج وہ میرے سامنے تم دونوں کو اس لئے سزا دے رہا تھا کہ میں آئندہ مایا اور ناہید کا نام نہ لوں ۔ میں یہ وعدہ کر چکا ہوں اور تم نہیں جانتے کہ ایک راجپوت بھائی کے لئے اپنی بہن کے متعلق اس قسم کا وعدہ کرنا کس قدر صبر آزما ہے ۔"

زبیر نے جواب دیا ۔" تمہاری مہربانی کا شکریہ ۔ اس وقت ہم پر تمہاری تلواروں کا پہرہ ہے ۔ ہمارے لئے تمہارے جھوٹ اور سچ سے کوئی فرق نہیں

پڑتا۔ مَیں سچ بولنے کا انعام دے سکتا ہوں نہ جھوٹ بولنے کی سزا۔ مَیں صرف یہ جانتا ہوں کہ ہم تمہاری وجہ سے اِس مصیبت میں گرفتار ہوئے اور جب تک مَیں ناہید کو نہیں دیکھتا مجھے نہ تم پر اعتبار آسکتا ہے اور نہ دیبل کے حکمران پر۔ اگر مستقبل کے حالات نے یہ ثابت کردیا کہ تم اِس معاملے میں بے قصور تھے تو مَیں تم سے اِس بدگمانی کے لیے معذرت کرلوں گا۔ اگر دیبل کا حاکم قصوروار ہے تو تمہاری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہماری آواز راجہ کے کانوں تک پہنچ جائے۔ مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو خالد، ناہید اور تمہاری بہن کے متعلق کوئی علم نہیں۔ دُوسرے جہاز سے سراندیپ کے ملاحوں نے ہمارے جہاز کے چند آدمیوں کو ایک کشتی پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ کشتی جنوب کی طرف غائب ہوگئی تھی۔ اگر انہیں اس کشتی پر اغوا کیا گیا ہے تو معاملہ صاف ہے کشتی ہمارے جہازوں سے نہیں بلکہ بندرگاہ سے غائب ہوئی ہے۔ اور اس بات کا علم بندرگاہ والوں کو ہونا چاہیئے کہ وہاں سے کشتی کون لایا؟"

جے رام نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "پرتاب کمینہ، مکار، ظالم، بزدل! ــ زبیر بھگوان کے لئے میری خطا معاف کردو۔ مَیں نے تم پر شک کیا۔ مَیں نادم ہوں۔"

زبیر کو ان الفاظ سے زیادہ جے رام کی پُرنم آنکھوں نے متاثر کیا۔ اور اُس نے جے رام کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "جے رام! تم جاؤ۔ انہیں تلاش کرو۔ پرتاب رائے ظالم بھی ہے اور مکار بھی۔ اُسے اپنے دل

کا حال نہ بتانا۔ ورنہ تم اپنی بہن کو تلاش نہ کر سکو گے اور مہاراجہ ہی کے کانوں تک یہ خبر پہنچ سکے گی۔"

جے رام اُٹھ کر قید خانے کی کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ پہرہ داروں نے دروازہ بند کر دیا۔ چند قدم دُور جانے کے بعد جے رام نے واپس آ کر ایک پہرہ دار کو سراندیپ کے ملّاحوں کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولنے کے لئے حکم دیا۔

اِن لوگوں سے چند سوالات پُوچھنے کے بعد جب وہ باہر نکلا، تو اس کے دِل پر ایک بھاری بوجھ تھا۔ سراندیپ کے ملّاح زبیر کے بیان کی حرف بہ حرف تصدیق کر چکے تھے اور اُسے افسوس تھا کہ اُسے زبیر کی باتوں پر شک کیوں گزرا۔"

بابا کی پریشانی

(۱)

تین ہفتوں کے بعد ناہید ایک اُجڑے ہوئے قلعے کے ایک کمرے میں بستر پر لیٹی تھی۔ برہمن آباد سے بیس کوس کے فاصلے پر ایک گھنے جنگل میں یہ قلعہ کبھی زمانے میں گنگو اور اُس کے ساتھیوں کی قیام گاہ تھی۔ چند دنوں سے گنگو اور اُس کے ساتھی پھر ان پرانے کھنڈروں کو آباد کر چکے تھے۔

ناہید کے زخم اور بخار ۔۔۔ سے گنگو کو سخت تشویش تھی، اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے ناہید کے شفایاب ہونے تک ایک ایسی جگہ کو اپنی قیامگاہ بنایا تھا جو گردوپیش کے خطرات سے محفوظ تھی۔ گنگو لوٹ مار کی قسم کھا چکا تھا۔ اُسے ایک خاص مقصد کے لئے اپنے ساتھیوں کے لئے گھوڑوں اور دوسرے سازوسامان کی ضرورت تھی۔ جہاز غرق ہو جانے کے بعد اُس کے پاس صرف چار بیش قیمت ہیرے رہ گئے تھے جنہیں وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ وہ ایک گجراتی تاجر کا بھیس بدل کر برہمن آباد پہنچا۔ وہاں پر صرف دو ہیرے بیچنے سے اُسے اس قدر رقم مل گئی جو اُس کے

تمام ساتھیوں کو گھوڑے، تلواریں اور کھانے پینے کا سامان مہیا کرنے کے لئے کافی ثابت ہوئی۔

گنگو کو دیبل کے آس پاس اگر کوئی اس قسم کی پناہ گاہ مل جاتی تو وہ یقیناً اُسے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بناتا۔ لیکن وہاں کوئی پناہ گاہ نہ ہونے کے علاوہ گنگو کو یہ بھی یقین تھا کہ قیدیوں کو برہمن آباد یا اُرور میں راجہ کے سامنے ضرور پیش کیا جائے گا۔ چند دنوں سے گنگو کے ساتھی دیبل اور برہمن آباد کے درمیان تمام راستوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ گنگو کی نیت کے متعلق خالد کے تمام شکوک رفع ہو چکے تھے لیکن مایا دیوی کو وہ ابھی تک مارِ آستین خیال کرتا تھا۔ مایا دیوی دن رات ناہید کی تیمارداری کر کے گنگو کو کسی حد تک اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے چکی تھی اور ناہید کے شبہات دُور کر چکی تھی لیکن خالد پر اُس کی کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اُس کے لئے گویا وہ تھی ہی نہیں سو تیمارداری کے لئے ناہید کے پاس بیٹھتا۔ وہ اُس کے سامنے ناہید کے زخم پر مرہم پٹی کرتی۔ اُسے دوائی کھلاتی، اُس کا سر دباتی۔ اور خالد کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اپنے ارادوں کے خلاف کئی بار یہ الفاظ دُہراتی "آپ کی بہن کی طبیعت اب ٹھیک ہے۔ زخم جلد ہی اچھا ہو جائے گا۔ . . . . بہن ناہید اب تندرست ہیں، آپ پریشان نہ ہوں . . . . خدا آپ کی مدد کرے گا۔" لیکن خالد سے کوئی جواب نہ پا کر وہ یہ محسوس کرتی کہ خالد کی آنکھیں اور کان اس کے لئے بند ہو چکے ہیں۔ دریائے سندھ کے دہانے سے اس مقام تک کشتی کے طویل سفر میں بھی خالد کی یہی حالت تھی۔ دریا میں

وہی پانی تھا جسے وہ سمندر میں دیکھ چکی تھی۔ ہر صبح وہی سورج نمودار ہوتا، اور شام کے وقت انہی چاند اور ستاروں کی محفل سجتی تھی۔ لیکن خالد کے طرزِ عمل میں تبدیلی کے بعد اُس کے لئے کائنات کی تمام رنگینیاں پھیکی پڑ چکی تھیں۔ اگر خالد اُس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دے سکتا۔ اگر وہ فقط ایک بار پوچھ لیتا کہ مایا تم کیسی ہو۔ اگر اُس کے ہاتھ مایا کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو پونچھنے کے لئے معمولی سی آمادگی ظاہر کرتے تو بھائی کی جُدائی کے احساس کے باوجود وہ اِس بات پر خوش ہوتی کہ قدرت نے دیبل سے اُن کے راستے جُدا نہیں کئے۔ وہ جہاز پر سفر کے دوران میں اکثر یہ سوچا کرتی تھی کہ کاش خالد کے ساتھ اُس کا سفر ختم نہ ہو۔ کاش کوئی طوفان جہاز کا رُخ بدل دے اور وہ خالد کے ساتھ کسی ایسے جزیرے میں پہنچ جائے جہاں صاف اور شفاف پانی کی ندیاں بہتی ہوں۔ آبشاریں محبت کے گیت گاتی ہوں۔ سدا بہار درخت لہلہاتے ہوں۔ پھول مہکتے ہوں۔ گہری جھیلوں میں کنول کے پھول کھلتے ہوں۔ دیبل کی بندرگاہ کی پہلی جھلک دیکھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے اُس کے سپنوں کی رنگین دُنیا درہم برہم ہوئی لیکن جب قدرت نے اُنہیں جہاز کی بجائے ایک کشتی پر سوار کر دیا مایا دیوی پھر سپنوں کی ایک نئی دُنیا آباد کرنے لگی۔ لیکن دیبل کے حادثہ نے ایک جیتے جاگتے نوجوان کو ایک پتھر کا مجسمہ بنا دیا تھا۔ محبت اور وفا کی دیوی کی ملتجی اور متمنی نگاہوں کے جواب میں خالد کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔

ان لوگوں میں صرف ناہید ایسی تھی، جسے یہ یقین تھا کہ دیبل کے حادثے سے مایا دیوی کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک عورت کی ذکاوت جس سے مایا کی ذہنی کشمکش کا اندازہ کر چکی تھی، اُسے جب بھی موقع ملتا، وہ خالد کے سامنے مایا کی پاکیزگی، اُس کی معصومیت اور اُس کی حیا کا ذکر چھیڑ دیتی۔ خالد گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتا اور وہ کہتی "خالد! تمہارا دل بہت سخت ہے۔ تم دیکھتے نہیں اُس کا سُرخ و سفید چہرہ دوپہر کے پھُول کی طرح مُرجھا گیا ہے۔ اُس کا بھائی بُرا سہی لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ معصوم ہے۔ وہ تمہیں اپنی آخری پناہ خیال کرتی ہے۔ تم اُسے تسلی دے سکتے ہو۔ وہ اب یہاں تک کہہ چکی ہے کہ اگر اُس کا بھائی سچ مُچ اِس سازش میں شریک تھا تو وہ اُس کے پاس جانے سے مرنا بہتر سمجھتی ہے۔"

اور وہ جواب دیتا "مَیں دوپہر کے وقت چراغ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مَیں جو کچھ دیکھ چکا ہوں۔ اُس کے بعد اِس لڑکی کے متعلق اپنی رائے بدلنا میرے بس کی بات نہیں۔"

(۲)

چند دن اِس قلعے میں رہنے کے بعد ناہید چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی۔ لیکن تیر کا زخم ابھی تک مندمل نہ ہوا تھا۔ خالد کبھی کبھی سواروں کی کسی ٹولی کے ساتھ گشت کے لئے چلا جاتا۔

ایک شام مختلف اطراف سے سپاہیوں کی تمام ٹولیاں واپس آگئیں لیکن خالد اور اُس کے چار ساتھی واپس نہ آئے۔ ناہید نمازِ مغرب کے بعد

اپنے بھائی کی خیریت کے لئے دُعا کر رہی تھی۔ گنگو اپنے چند ساتھیوں کو خالد کی تلاش میں روانہ کر کے ایک اُونچے درخت پر چڑھ کر اُس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ مایا قلعے سے باہر نکل کر گھنے درختوں میں سے اِدھر اُدھر جھانک رہی تھی تھوڑی دیر کے بعد اُسے دُور سے گھوڑوں کی ٹاپ سُنائی دی۔ اُس کا دِل دھڑکنے لگا اور وہ تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اُس کا دامن ایک کانٹے دار جھاڑی سے اُلجھ گیا۔ وہ کانٹوں کو الگ کر رہی تھی کہ جھاڑیوں کے عقب سے خالد اور دوسرے سوار نمودار ہوئے۔ خالد نے گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔ "میری بہن کیسی ہے؟"

کانوں کے راستے یہ الفاظ مایا کے دِل تک اُتر گئے۔ وہ خالد کی طرف دیکھنے لگی۔ خاردار جھاڑی کی چند شاخیں جو اُس نے بڑی مشکل سے اپنے دامن سے جُدا کی تھیں، اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر پھر اُس کے دامن میں اُلجھ گئیں۔

خالد نے پھر کہا: "بتاؤ میری بہن ٹھیک ہے نا؟"

مایا نے چونک کر جواب دیا "وہ بالکل ٹھیک ہیں آپ نے بہت دیر لگائی؟"

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں ۔۔۔ ۔۔۔ کچھ نہیں" یہ کہہ کر مایا پھر اپنے دامن کو کانٹوں سے چھڑانے لگی۔ لیکن اُس کی نگاہیں خالد پر گڑی تھیں۔ خالد گھوڑے سے اُترا اور اُس کے ساتھی دزدیدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور مُسکراتے ہوئے آگے نکل گئے۔ خالد شاخوں کو ایک ایک کر کے اُس کے دامن

سے الگ کرنے لگا۔ مایا کا تنفس تیز ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو اُمڈنے لگے۔ اُس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ خالد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

خالد نے ایک شاخ اُس کے دامن سے الگ کرتے ہوئے کہا "اسے پکڑ لو"۔ اُس نے جلدی سے شاخ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک تیز کانٹا اُس کی اُنگلی میں پیوست ہو گیا۔ اور شاخ اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر پھر اُس کے دامن میں اُلجھ گئی۔ مایا کانٹے کی تکلیف کے باوجود مُسکرائی۔ تشکر کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مُسکراہٹ نے اُس کا چہرہ شبنم آلود پھُول سے کہیں زیادہ دلفریب بنا دیا۔ خالد نے اُس کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔ "لاؤ میں نکال دُوں"۔

مایا نے کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ خالد کانٹا نکال کر پھر جھاڑی کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے پُوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئیں؟"

مایا نے جواب دیا۔ "قلعے میں گرمی تھی اور میں ذرا ہوا خوری کے لئے نکل آئی تھی"۔ لیکن اُس کا دِل کہہ رہا تھا۔ "کیا سچ مچ تم میرے یہاں آنے کی وجہ نہیں سمجھ سکے؟ کاش میں تمام عمر کانٹوں میں اُلجھی رہوں، اور تم نکالتے رہو"۔

خالد نے جواب دیا۔ "لیکن اِس وقت درختوں کے نیچے تو زیادہ حبس ہے"۔

مایا نے پریشان سی ہو کر خالد کی طرف دیکھا۔ لیکن کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "میں دریا کی طرف جا رہی تھی"۔

دریا تو دوسری طرف ہے۔"

"مَیں بھی اُسی طرف جا رہی تھی۔ لیکن ــــ"

"لیکن کیا؟"

"گھوڑوں کی ٹاپ سن کر اس طرف لَوٹ آئی۔ آج آپ نے بہت دیر کی۔ مَیں ۔ ۔ ۔ ۔ مَیں بہت پریشان تھی۔"

"مَیں تمہاری پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اگر مَیں زبیر اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح قید میں ہوتا تو تمہیں بہت اطمینان ہوتا۔ لیکن مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مَیں اب بھی قید میں ہوں۔ مَیں تمہارے بھائی کی طرح اپنی بہن کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

مایا کے دِل پر ایک چرکا لگا۔ وُہ دیر تک بے حِس و حرکت کھڑی رہی۔ اُس نے خلافِ معمول خالد کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور اُس کی چمکتی ہوئی پتلیوں پر پھر ایک بار پانی کے دُھندلے نقاب چھا گئے۔ یہ نقاب اُبھر کر چھلکتے ہوئے آنسوؤں میں تبدیل ہو گئے۔ پلکیں انہیں زیادہ سہارا نہ دے سکیں۔ دو چمکتے ہوئے موتی رخساروں پر ہلکی ہلکی لکیریں چھوڑتے ہوئے ہونٹوں پر آ رُکے۔ مایا نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا۔

"چلو اب دیر ہو رہی ہے۔" خالد کی آواز سُن کر مایا نے چونک کر چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اُس کا دامن کانٹوں سے الگ ہو چکا تھا اور خالد گھوڑے کی باگ پکڑ کر جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ وُہ بولی:۔

آپ چلیئے۔ مَیں خود آجاؤں گی۔ لیکن مَیں آپ سے آخری بار صرف ایک

بات کہنا چاہتی ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔ اگر میرا بھائی اِس سازش میں شریک تھا تو بھی یہ انصاف نہیں کہ اُس کے پاپ کی سزا مجھے ملے۔"

خالد نے جواب دیا۔ "میں تمہیں سزا نہیں دینا چاہتا۔ تمہیں بہت جلد تمہارے بھائی کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ تمہارا بھائی بھی تم سے دُور نہیں۔ وہ یہاں سے چار کوس دُور دریا کے کنارے ایک ٹیلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے وہ راجہ سے انعام حاصل کرنے کے لئے قیدیوں کو برہمن آباد لے کر جا رہا ہے۔ اُس کے ساتھ دیبل کا حکمران بھی ہے۔ کل تک وہ برہمن آباد پہنچ جائیں گے۔ شاید آج رات ہی تمہارے بھائی کے پاس ہمارا پیغام پہنچ جائے اور اگر اُس نے قیدیوں کو چھوڑنا منظور کر لیا تو تمہیں اُس کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ میں شروع سے اس بات کا حامی نہ تھا کہ تمہیں یہاں رکھا جائے۔ ہمارا اخلاق ہمیں یہ اجازت نہیں دیتا کہ ہم ایک بے بس عورت پر ہاتھ اُٹھائیں۔ تم اطمینان رکھو۔"

"آپ کو کس نے بتایا کہ میرا بھائی قیدیوں کو لے جا رہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ پرتاب رائے کے ساتھ وہ بھی ایک قیدی کی حیثیت میں جا رہا ہو؟"

"میں آج خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ وہ ایک مُشکی گھوڑے پر سوار تھا اور قیدی بیل گاڑیوں پر بھی پابہ زنجیر تھے۔ چلو اب دیر ہو رہی ہے۔ گنگو میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"آپ جائیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

(۳۳)

خالد گھوڑے کی باگ پکڑ کر پیدل چلتا ہوا قلعے کے دروازے تک پہنچا۔ گنگو باہر اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا "خالد! مایا کو کہاں چھوڑ آئے؟"

خالد نے بے پروائی سے جواب دیا "وہ آرہی ہے"۔

"رات ہو رہی ہے۔ تم اُسے ساتھ کیوں نہ لے آئے؟"

"آپ سے آئیں۔ وہ کہتی تھی تم جاؤ میں ابھی آتی ہوں"۔

گنگو نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ عورت بھی عجیب مخلوق ہے۔ وہ چھپ چھپ کر تمہاری راہ دیکھ سکتی ہے۔ تمہارے لئے کانٹوں میں اُلجھ سکتی ہے لیکن تم ذرا اُس کی طرف مائل ہوئے اور وہ وحشی ہرنی کی طرح کترا کر بھاگی"۔

خالد نے جواب دیا "میرے دل میں شاعری کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اب آپ بتائیں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ آپ دیبل کے قافلے کی خبر سُن چکے ہوں گے؟"

"ہاں سُن چکا ہوں۔ اُن کے ساتھ دو سو مسلح سپاہی ہیں۔ ہم مُٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ اُن پر حملہ نہیں کر سکتے۔ میں جے رام کو یہاں لانے کی تجویز سوچ چکا ہوں"۔

"دیکھا اُس لڑکی کی باتوں میں آکر ناہید جے رام کے متعلق اپنے خیالات بدل چکی تھی۔ اور آپ بھی متاثر ہو رہے تھے"۔

گنگو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا " بیٹا! تم مجھ سے زیادہ متاثر تھے۔ بہر حال مجھے اب یقین ہو چکا ہے کہ مایا معصوم ہے ۔"

" اور اس کے باوجود آپ جے رام کو مایا کے قتل کی دھمکی دینا چاہتے ہیں ۔"

" تمہارے ساتھیوں کو آزاد کرانے کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ۔"

" لیکن اگر جے رام نے اپنے راجہ کی خوشی پر اپنی بہن کو قربان کر دیا تو ؟"

" مجھے ایسی اُمید نہیں ۔ لیکن اگر جے رام اس قدر ذلیل ثابت ہُوا تو مایا جیسی لڑکی کو ایسے ظالم بھائی کے ہاتھوں سے بچانا ہمارا فرض ہے۔ وہ خود بھی جے رام کی بجائے تمہاری پناہ کو ترجیح دے گی ۔ چند دنوں تک تمہاری بہن سفر کے قابل ہو جائے گی اور ہم تمہیں مکران کی حُدود کے اندر پہنچا دیں گے ۔"

" لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کو مصیبت میں چھوڑ کر چلے جائیں ۔"

" تم وہاں جا کر اُن کی زیادہ مدد کر سکو گے ۔ عربوں کے علاوہ سراندیپ کے ملاحوں کو بھی قید میں رکھے جانے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تمہارے جہاز کے لُوٹے جانے کی خبر سندھ سے باہر نہ نکلے ۔ اگر یہ خبر وہاں تک پہنچ گئی تو تمہاری قوم اسے خاموشی سے برداشت نہیں کرے گی ۔ لیکن تم اُس وقت تک نہیں جا سکتے ، جب تک کہ ناہید تندرست نہیں ہوتی ۔ اگر جے رام ہمارے قابو میں آگیا تو یہ ممکن ہے کہ ہم کم از کم زبیر کو آزاد کرانے

میں کامیاب ہو جائیں ۔"

"اگر یہ ہو سکے تو بہت اچھا ہو گا۔ مَیں عرب میں کسی کو نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ بصرہ اور دمشق میں میری آواز پر کوئی توجہ دے۔ لیکن زبیر وہاں ہزاروں آدمیوں کو جانتا ہے۔ ہاں آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آج رات میرے ذمہ کیا کام ہے ؟"

گنگو نے جواب دیا "تم آرام کرو۔ لیکن مایا دیوی ابھی تک نہیں آئی۔ شاید وُہ دوسرے راستے قلعے میں پہنچ گئی ہو۔"

"مَیں ابھی پتہ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر خالد بھاگتا ہُوا قلعے میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے واپس آکر گنگو کو اطلاع دی کہ وُہ اندر نہیں پہنچی۔

گنگو نے پُوچھا۔ "تم اُسے کتنی دُور چھوڑ آئے تھے ؟"

"اِن جھاڑیوں سے پیچھے کوئی سو قدم کے فاصلے پر۔"

"تم نے اُس کے ساتھ کوئی سخت کلامی تو نہیں کی ؟"

"لیکن اُسے میری ہر بات پر آنسو بہانے کی عادت ہو چکی ہے ہاں مَیں ایک غلطی کر چکا ہُوں۔"

"وہ کیا ؟"

"مَیں نے اُسے بتا دیا تھا کہ اُس کا بھائی یہاں سے چار کوس پرے کہیں ہے۔"

"رات کے وقت اِس جنگل کو عبُور کرنا ایک عورت کا کام نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے گنگو نے اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بلایا۔ اور جنگل میں مایا کو تلاش کرنے کا حکم دے کر خالد سے کہا۔ "میرے خیال میں وہ ابھی تک اُس خاردار جھاڑی سے باتیں کر رہی ہوگی۔ تم اُس طرف جاؤ۔ میں دریا کی طرف جاتا ہوں۔ مجھے اُس پر شک تو نہیں، لیکن مایوسی کی حالت میں عورت توقع کے خلاف بھی بہت کچھ کر گزرتی ہے۔ میں جاتا ہوں کہیں دریا کے کنارے ہماری کشتی اُس کی تباہی کا باعث نہ ہو۔"

(۴)

خالد کے جانے کے بعد مایا کچھ دیر اُس خاردار جھاڑی کے قریب کھڑی رہی۔ وہ کانٹے جو اُس کا دامن کھینچ کر خالد کے ہاتھوں تک لے گئے تھے، اُس کے لئے جھکتے ہوئے پھولوں سے کم نہ تھے۔ وہ اُن چند لمحات کا تصور کر رہی تھی، جب خالد اُس سے اِس قدر قریب تھا، اُس کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے، وہ یکے بعد دیگرے زہر اور شہد کے گھونٹ اپنے حلق سے اُتار رہی تھی۔ اُس کا دل خالد کے متعلق متضاد خیالات کی رزم گاہ تھا۔ وہ کبھی اُسے قہر و غضب کا پیکرِ مجسّم اور کبھی ایثار و محبت کا دیوتا خیال کرتی۔ تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہنے کے بعد وہ اپنے دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس کرنے لگی اور کانٹے دار جھاڑی کی ایک شاخ توڑ کر چاند کی روشنی میں درختوں اور جھاڑیوں سے بچتی ہوئی دریا کی طرف چل دی۔

دریا کے کنارے ایک کشتی کھڑی تھی۔ وہ کشتی جس نے انہیں سمندر

سے یہاں تک پہنچایا تھا۔ جس پر سفر کرتے ہوئے اُس نے پہروں آسمان کے ستاروں سے باتیں کی تھیں۔ اُس نے کشتی کے ایک سرے پر بیٹھ کر نیچے پاؤں لٹکا دیئے۔ پانی کی لہریں اُس کے پاؤں کو چھُو رہی تھیں۔ آس پاس جنگل میں گیدڑوں اور بھیڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مایا نے اپنے دل سے سوال کیا۔ "اگر کوئی بھیڑیا اس طرف آ جائے تو؟" اور پھر خود ہی جواب دیا۔ "اگر بھیڑیا آ جائے تو مَیں بھاگنے کی کوشش نہ کروں گی مَیں کشتی سے اُتر کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاؤں گی اور پھر جب وہ صبح کے وقت میری لاش دیکھے گا تو اُس کی کیا حالت ہو گی؛ وہ کہے گا، مایا تم اِدھر کیوں آئیں۔ مَیں تمہارے ساتھ مذاق کرتا تھا۔ مَیں جانتا تھا تم بے قصور ہو۔ مایا مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی۔ نہیں نہیں۔ وہ شاید یہ نہ کہے۔ وُہ کہے گا یہ دیوانی تھی۔ یہ پگلی تھی۔ ہاں مَیں سچ مچ پگلی ہوں۔ اُس کے دِل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں۔ وہ میرا دامن کانٹوں سے چھُڑا رہا تھا اور مَیں سمجھ رہی تھی کہ مجھے دُنیا کی بادشاہت مِل گئی لیکن میں دریا کے کنارے ریت کے گھروندے بنا رہی تھی۔ اُس کا دِل پتھر کا ہے۔ وہ ظالم ہے۔ اُسے کسی پر اعتبار نہیں، اور ہو بھی کیونکر۔ میرے بھائی نے ان لوگوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔ کاش وُہ میرا بھائی نہ ہوتا۔ کاش اُس نے جہاز ہی پر مجھے بتا دیا ہوتا کہ وہ اُن کے ساتھ یہ دھوکا کرنے والا ہے اور وہ چھُپ چھُپ کر خالد کو نہ دیکھتی۔ اب وہ مجھے بھائی کے پاس بھیجنے والے ہیں۔ لیکن اگر اس کا انجام یہی تھا تو قدرت نے مجھے اُس کے

جہاز پر کیوں پہنچایا؟ اور پھر جب ہم دیبل سے جُدا ہونے والے تھے، قدرت ہمیں یہاں کیوں لے آئی؟ مَیں اب تک اُس کی نفرت کے باوجود اُسے محبت کی نگاہوں سے کیوں دیکھتی رہی۔ مَیں نے مایوسی کی آندھیوں میں کھڑی ہو کر اُمید کے چراغ کیوں جلائے؟ ـــ ہاں میں مجبور تھی.... یہ میرے بس کی بات نہ تھی.... مَیں اب بھی بے بس ہوں.... میرا کوئی نہیں.... میرا کوئی نہیں.... مَیں اپنے بھگوان کو پکار چکی ہوں۔ اُس خدا کو پکار چکی ہوں جس کی وہ دن میں پانچ بار عبادت کرتا ہے۔ لیکن میرے لئے آنسوؤں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں۔ آنسو اور آہیں۔ کاش میں پیدا نہ ہوتی۔ کاش سمندر کی لہریں مجھ پر ترس نہ کھاتیں۔"

مایا سر کو ہاتھوں کا سہارا دیے کر دیر تک ہچکیاں لیتی رہی۔ کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے "مایا" کہہ کر پکارا۔ اور اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ گنگو اُس کے قریب کھڑا تھا۔ اُس نے کہا۔ "بیٹی تم ڈر گئیں۔ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"تم رو رہی ہو۔ کیا ہُوا؟"

مایا خاموش رہی۔ گنگو نے پھر پُوچھا۔ اِس وقت ایسی سنسان جگہ پر تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ سُنو چاروں طرف سے بھیڑیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ چلو میرے ساتھ۔"

مایا نے کہا۔ "مَیں آپ سے ایک بات پُوچھنا چاہتی ہوں۔"

"وُہ کیا؟"

"آپ سچ مچ مجھے میرے بھائی کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟"

گنگو نے جواب دیا "میں اپنا فیصلہ بتانے سے پہلے تمہارا فیصلہ سُننا چاہتا ہوں۔"

"بھگوان کے لئے مجھے اُس کے پاس نہ بھیجئے۔"

"لیکن کیوں؟"

"میں ایسے بھائی کے پاس نہیں جانا چاہتی جس نے میری ماں کے دُودھ کی لاج نہیں رکھی"۔

"یہ تم دل سے کہہ رہی ہو یا مجھے بنانے کے لئے؟"

"کاش! آپ میرا دل دیکھ سکتے۔"

"لیکن جے رام سے نفرت کی وجہ؟"

"میں خالد سے اُس کے متعلق سُن چکی ہوں۔ اور اب مجھے اُس کی دغابازی کے متعلق کوئی شبہ نہیں رہا۔"

"لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم تمہیں تمہارے بھائی کے حوالے کر کے زبیر کے ساتھیوں کو آزاد کروا سکیں؟"

"اگر جے رام ایک دفعہ دھوکا کر چکا ہے۔ تو وُہ دوبارہ موقع ملنے پر بھی ایسا ہی کرے گا۔ اُسے کسی صورت بھی یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ میں آپ کے پاس ہوں۔ ورنہ وہ راجہ کے سپاہیوں کو ساتھ لے کر جنگل کا کونہ کونہ چھان مارے گا۔ ناہید اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوئی۔ آپ کے

لئے اُس کی حفاظت بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"بیٹی تم اطمینان رکھو۔ جے رام کو تمہیں میرے قبضہ میں دیکھ کر سب مکاریاں بھول جائیں گی۔ اگر بعد میں اُسکی طرف سے کوئی خدشہ بھی پیش آیا۔ تو ناہید کے لئے میں ایک اور محفوظ جگہ تلاش کر چکا ہوں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اُس نے قیدی آپ کے حوالے کر دیئے تو آپ مجھے اُس کے سپرد کر دیں گے؟"

"بیٹی! وہ تمہارا بھائی ہے۔ تم اُس کے پاس جانے سے کیوں ڈرتی ہو؟"

"میرا دُنیا میں کوئی نہیں۔ بھائی نے مجھے اپنے مقصد پر قربان کرنا چاہا اور میں آپ کے قبضے میں آ گئی۔ اب آپ مجھے بیٹی کہہ کر اپنے مقصد کے لئے پھر اُس کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔ اپنے بھائی کی طرح آپ کا فیصلہ بھی میرے لئے تقدیر کا حکم ہو گا۔ کاش! میری تقدیر میرے ہاتھ میں ہوتی۔ کاش! مجھے اس دُنیا میں اپنا راستہ تلاش کرنے کا حق ہوتا۔ لیکن میری پسند اور ناپسند کے کوئی معنی نہیں۔ میں اس طوفان میں ایک تنکا ہوں جسے ہوا کا ہر جھونکا جس طرف چاہے اُڑا کر لے جا سکتا ہے۔ میرا ہونا، نہ ہونا، برابر ہے۔"

گنگو نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "اگر یہ معاملہ تمہاری پسند پر چھوڑ دیا جائے تو تم کیا کرو گی؟"

مایا نے قدرے پُر اُمید ہو کر جواب دیا۔ "میں آپ کی قید کو آزادی پر ترجیح دوں گی۔"

"وہ کیوں ؟"

"مَیں ناہید کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی"۔

"مایا! مَیں ایک سوال پوچھتا ہوں۔ سچ کہو تمہیں خالد کے ساتھ محبّت ہے ؟"

مایا نے آنکھیں جھکا لیں۔

اُس نے پھر کہا۔ "مایا! میرے سوال کا جواب دو"

وُہ بولی۔ "لیکن آپ یہ کیوں پُوچھتے ہیں ؟"

"اِس لئے کہ شاید اس سوال کا جواب پُوچھ کر مَیں تمہارے لئے کوئی بہتر فیصلہ کر سکوں"۔

"مجھے معلوم نہیں۔ لیکن مَیں صرف یہ جانتی ہوں کہ مَیں اُن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی"۔

"تم یہ بھی جانتی ہو کہ تمہارے متعلق اُس کے شکوک ابھی تک رفع نہیں ہوئے۔ اُس کا دل سمندر کی چٹانوں سے زیادہ سخت ہے۔ مَیں تمہیں بیٹی کہہ چُکا ہوں۔ آج سے تمہارا سُکھ میرا سُکھ اور تمہارا دُکھ میرا دُکھ ہوگا۔ مَیں یہ نہیں چاہتا کہ تم کسی دن اُسے اپنا بنا لینے کی اُمید پر سب کچھ قربان کردو۔ ممکن ہے اُسے تمام عمر تمہاری نیک نیتی کا یقین نہ آئے اپنے متعلق اُس کے خیالات بدلنے کے لئے تمہیں بہت بڑی قربانی کرنی پڑے گی"۔

"مَیں ہر قربانی کے لئے تیار ہوں۔ لیکن مجھ سے ہمیشہ کی جُدائی

برداشت نہیں ہو سکتی۔"

"تمہیں بھائی کا خیال تو نہیں ستائے گا؟"

"راجہ کے ٹکڑے کھانے کے بعد وہ میرا بھائی نہیں رہا۔ مجھے اُس سے کوئی ہمدردی نہیں۔"

گنگو نے کہا۔ "میں اُسے ایک طریقے سے یہاں لانا چاہتا ہوں اُس کی صورت دیکھ کر تمہارا دل پسیج تو نہ جائے گا۔۔۔؟ اُس نے اپنے محسنوں سے دغا کیا ہے۔ اگر اُس کی سزا تم پر چھوڑ دی جائے۔ تو تم اُس کے ساتھ کیا سلوک کرو گی؟"

"وہی جو ایک دغا باز فریبی اور بزدل کے ساتھ ہونا چاہئیے۔"

گنگو نے کہا۔ "مایا! مجھے سوچ کر جواب دو۔ یہ ایک کڑا امتحان ہے۔ ممکن ہے کہ میں تمہارے بھائی کو تمہارے سامنے کھڑا کر کے تمہارے ہاتھ میں انصاف کی تلوار دے دوں۔"

"میں سوچ چکی ہوں۔ میں اُسے رحم کا مستحق نہیں سمجھتی۔"

گنگو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن جھاڑیوں کے پیچھے سے خالد کی آواز آئی۔ "مایا! مایا!! تم کہاں ہو؟"

گنگو نے مایا سے کہا۔ "تم کشتی میں چھپ جاؤ۔ اور جب تک میں نہ بلاؤں باہر نہ آنا۔"

مایا نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ گنگو کشتی سے اُتر کر دریا کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ خالد نے پھر آواز دی۔ اور اُس نے کہا۔

"خالد میں اِدھر ہوں۔"

(۵)

خالد نے جھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہو کر پوچھا "مایا نہیں ملی؟ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

گنگو نے اپنے لہجے کو مغموم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مایا چلی گئی۔ آہ بیچاری!"

خالد نے بدحواس ہو کر پوچھا "کہاں چلی گئی۔ کیا ہوا؟"

"خالد تم نے بہت بُرا کیا۔ کاش تم اُس کا دِل نہ توڑتے"۔

"آخر کیا ہوا۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ؟"

"اب چھپانے سے فائدہ؟ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ کاش وہ تُم جیسے سنگدل انسان سے محبت نہ کرتی!"

خالد نے بیتاب ہو کر گنگو کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا "خدا کے لئے مجھے پریشان نہ کرو۔ صاف صاف کہو کیا ہوا؟"

"مایا چل بسی۔ مَیں یہاں پہنچا تو وہ دریا کے کنارے کھڑی تھی۔ مَیں نے اُسے آواز دی۔ اور اُس نے مجھے جواب دینے کی بجائے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ مَیں نے جلدی جلدی کپڑے اُتارے۔ لیکن اتنی دیر میں اُسے پانی کی لہر کنارے سے بہت دُور لے گئی۔ جب مَیں پانی میں کُودنے لگا وہ لہروں کی آغوش میں چھپ چکی تھی۔"

خالد نے چلّا کر کہا "مایا ڈوب رہی تھی اور تم اطمینان سے کنارے

پر کھڑے کپڑے اُتار رہے تھے۔ بے رحم! ظالم!! ڈاکو!!! مَیں سمجھتا تھا کہ تم انسان بن چکے ہو۔"

گنگو نے کہا "مَیں کپڑوں سمیت چھلانگ لگا دیتا تو خود ڈوب جاتا۔"

"تو تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ڈوبنے سے دُنیا میں کوئی کمی آجاتی؟"

"تو اس کے مرنے سے دنیا میں کونسی کمی آگئی ہے؟ بھائی سے اُس کا دِل ٹوٹ چکا تھا۔ تمہارے طرزِ عمل سے وہ مایوس ہو چکی تھی۔ اچھا ہُوا وُہ گھُل گھُل کر مرنے کی بجائے دریا میں ڈوب کر مر گئی۔ ہاں جب مَیں کپڑے اُتار رہا تھا اور لہریں اُسے دھکیل کر منجدھار کی طرف لے جا رہی تھیں، وُہ چلّا چلّا کر کہہ رہی تھی۔ گنگو مجھے بچانے کی کوشش بے سُود ہے۔ خالد کو میرا سلام کہنا۔ مَیں اُس کی محبت سے مایوس ہو کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔"

خالد دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ گنگو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "خالد چلو۔ اب افسوس سے کیا حاصل۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔"

خالد نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا "تم جاؤ۔"

گنگو نے کہا "آج رات ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔ چلو۔"

خالد نے سخت لہجے میں کہا۔ "گنگو خدا کے لئے جاؤ۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دو۔"

وُہ بولا "خالد مجھے معلوم نہ تھا کہ مایا کی موت کا تمہیں اِس قدر صدمہ ہوگا۔ ورنہ مَیں اپنی جان پر کھیل کر بھی اُسے بچانے کی کوشش کرتا۔"

خالد نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "اُس کی موت کا صدمہ؟ گنگو

تمہارے پہلو میں ایک انسان کا دل نہیں۔ یہ حادثہ میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ اُس کی موت کا باعث میں ہوں اور میں مرتے دم تک اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گا۔"

"لیکن تم تو مجھ سے کئی بار یہ کہہ چکے تھے کہ مایا کو اُس کے بھائی کے پاس بھیج دو۔ اگر تمہیں اُس سے جُدا ہونے کا افسوس نہ تھا تو اُس کی موت کا اس قدر رنج کیوں ہے؟"

"گنگو خدا کے لئے میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو۔ میں نے اُسے سمجھنے میں غلطی کی اور یہ سزا میری قوتِ برداشت سے زیادہ ہے۔"

"خالد چھوڑو ان باتوں کو، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ ایک بار پھر زندہ ہو جائے تو بھی تمہارا غرور تمہیں اُس کی محبت کا جواب دینے کی اجازت نہ دے گا۔ تم اُس کے ساتھ اُسی طرح پیش آؤ گے۔ چلو۔ ایک دو دن میں تم اُسے بھول جاؤ گے۔"

خالد جواب دیئے بغیر ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا، اور دریا کی لہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے درد بھری آواز میں کہا۔ "مایا! مایا!! تم نے کیا کیا؟"

گنگو نے پھر کہا۔" خالد تمہیں اب ایک مرد کے حوصلے سے کام لینا چاہیئے۔"

"گنگو تم جاؤ۔ میں ابھی آجاؤں گا۔"

"اچھا۔ تمہاری مرضی۔" گنگو یہ کہہ کر چل دیا۔ لیکن قلعے کا رُخ کرنے کی

بجائے جھاڑیوں میں چھپتا ہوا کشتی کے قریب ایک درخت کی آڑ میں جا کھڑا ہوا۔ اُس نے آہستہ سے آواز دی "مایا! اب نکل آؤ"

مایا کا دِل دھڑک رہا تھا۔ وہ خالد اور گنگو کی باتیں سُن چکی تھی۔ وہ اُس موت کو جو اُسے خالد کے دِل سے اِس قدر قریب لا سکتی تھی، ہزار زندگیوں پر ترجیح دینے کے لئے تیار تھی۔ وُہ خالد کی آہیں سُن رہی تھی، اور اُسے خدشہ تھا کہ اس مذاق کے بعد خالد اُس سے ہمیشہ کے لئے بدظن ہو جائے گا۔ اُس نے اپنے دِل میں سوچا۔ کاش مَیں سچ مچ دریا میں کود گئی ہوتی! اور آن کی آن میں یہ خیال ایک خوفناک ارادے میں تبدیل ہو گیا۔

گنگو نے پھر آہستہ سے آواز دی۔ مایا کے لئے سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقع نہ تھا۔ اُس نے اچانک اُٹھ کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔

گنگو "مایا! مایا!!" کہتا ہوا بھاگا۔ خالد بدحواس ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور دونو بیک وقت دریا میں کود پڑے۔ گنگو کہہ رہا تھا "خالد پکڑو یہ مایا ہے۔ مایا ٹھہرو! آگے پانی بہت خطرناک ہے" لیکن وُہ تیر کر تیز دھارے میں جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

خالد تیزی سے پانی کو چیرتا ہوا اُس کے قریب پہنچا۔ مایا نے غوطہ لگا دیا۔ لیکن ایک اچھی خاصی تیراک کے لئے اپنے آپ کو پانی کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ممکن نہ تھا۔ اُس نے جلد ہی اپنا سر پانی سے باہر نکال لیا، اور پھر منجدھار کی طرف جانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن خالد نے اُسے بازو سے پکڑ لیا۔ اِتنی دیر میں گنگو بھی پہنچ گیا۔ اور دونو مایا کو سہارا دے کر

کنارے کی طرف تیرنے لگے۔

کنارے پر پہنچ کر گنگو نے کہا: "خالد اب مجھے اس لڑکی پر کوئی اعتبار نہیں رہا۔ اسے تمہاری بے رُخی نے پاگل بنا دیا ہے"۔ اور پھر مایا سے مخاطب ہو کر پوچھا: "مایا! تم نے دریا میں چھلانگ کیوں لگائی؟"

اُس نے اطمینان سے جواب دیا: "آپ نے اِن کے ساتھ یہ مذاق کیوں کیا تھا؟"

گنگو نے خالد سے کہا: "بھئی مجھے معاف کرنا۔ میں نے تمہیں چھیڑنے کے لئے اُسے کشتی میں چھپا دیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ سچ مچ ایسا کر دکھائے گی۔ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور میں خوش ہوں"۔

خالد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی آنکھوں میں صرف آنسو تھے۔ محبت، خوشی اور تشکر کے آنسو!"

گنگو نے پُوچھا: "اب مایا کے متعلق تمہارا کیا فیصلہ ہے؟"

اس نے جواب دیا: "مایا کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کا کسی کو حق نہیں وہ اپنے متعلق خود فیصلہ کر سکتی ہے"۔

بہن اور بھائی

(۱)

علی الصباح اس قلعہ سے چار کوس کے فاصلے پر دریا کے کنارے پرتاپ رائے کے سپاہی سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ جے رام دریا میں نہا کر کپڑے بدل رہا تھا کہ پاس ہی ایک جھاڑی کے عقب سے ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور اس کے پاؤں کے نزدیک زمین میں پیوست ہو گیا۔ تیر کے ساتھ ایک سفید رومال بندھا ہوا تھا۔ جے رام نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد زمین سے تیر نکالا اور اُس کے ساتھ بندھا ہوا رومال کھول کر دیکھنے لگا۔ جس پر کوئلے کے ساتھ یہ چند حروف لکھے ہوئے تھے۔

"جے رام! مَیں تمہیں کس نام سے پکاروں۔ تم کو بھائی کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اگر میری جان بچانا چاہتے ہو، تو گنگو کے ساتھ چلے آؤ ورنہ میری خیر نہیں۔"

تمہاری بدنصیب بہن

"مایا"

جے رام نے بھاگتے ہوئے جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر آواز دی "گنگو! گنگو!! تم کہاں ہو؟"

گنگو نے آہستہ سے جواب دیا "مَیں یہاں ہوں اس طرف"۔

جے رام جھاڑیوں میں سے گزر کر اُس کے قریب پہنچا۔ گنگو گھوڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جے رام نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی، اور بے قرار سا ہو کر پُوچھا "گنگو، مایا کہاں ہے؟ وہ کس حال میں ہے، وہ تمہارے پاس کیسے پہنچی؟"

گنگو نے جواب دیا "مایا زندہ ہے اور مَیں تمہیں اُس کے پاس لے جا سکتا ہوں۔ کہو تم میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو؟"

"ہاں؛ مَیں مایا کے لئے سات سمندر عبور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بھگوان کے لئے بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

"وہ یہاں سے زیادہ دُور نہیں۔ تم میرے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ"۔

"اگر زیادہ دُور ہو تو مَیں اپنا گھوڑا لے آؤں؟"

"تم اپنا گھوڑا لا سکتے ہو۔ لیکن اگر تم نے پھر کوئی چالاکی کی تو یاد رکھو، مایا کو کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ مَیں یہاں تمہارا انتظار کرتا ہوں"۔

"مَیں ابھی آتا ہوں"۔ جے رام یہ کہہ کر ٹیلے کی طرف بھاگا۔ گنگو احتیاط کے طور پر اس جگہ سے ہٹ کر گھنے درختوں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جے رام نے جھاڑی کے قریب پہنچ کر گھوڑا روکا، اور گنگو کو وہاں نہ پا کر آواز دی۔ گنگو نے مطمئن ہو کر اُسے اپنے پاس بُلا لیا۔

گنگو کے ساتھ چلنے سے پہلے جے رام نے اُس سے کئی سوالات پوچھے لیکن گنگو نے صرف یہ جواب دیا کہ مایا کے پاس پہنچ کر تمہیں سب حال معلوم ہو جائے گا۔ جنگل میں تھوڑی دُور چلنے کے بعد گنگو کے دس اور مسلح ساتھی جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جے رام کو گنگو کی نیت پر شبہ ہُوا۔ اور اُس نے باگ کھینچ کر گھوڑے کو روکتے ہوئے پُوچھا۔ ”گنگو! یہ کیا؟“ لیکن اس سے پہلے کہ گنگو کوئی جواب دیتا، اُس کے ساتھیوں نے جے رام کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور ایک نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ چھین لی۔ گنگو کی توقع کے خلاف جے رام نے کوئی مدافعت نہ کی، اور جب اُس کے ساتھیوں نے اُس کے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی تو اس نے خود ہی اپنی تلوار، کمان اور ترکش اُتار کر اُن کے حوالے کر دیئے

کمر کے پٹکے میں ایک چھوٹا سا خنجر لٹک رہا تھا۔ گنگو کے ایک ساتھی نے وہ بھی اُتارنا چاہا۔ لیکن اُس نے اشارے سے منع کیا۔

جے رام نے کہا: ”تمہیں معلوم ہے کہ مَیں مایا کا پیغام سُننے کے بعد بھاگ نہیں سکتا!“

گنگو نے جواب دیا، ”تم بھاگنے کی کوشش بھی کرو، تو کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس جنگل میں جگہ جگہ تیرانداز چھپے ہوئے ہیں!“

”لیکن گنگو مَیں نے تمہارے ساتھ کوئی وعدہ خلافی نہیں کی۔ تم جہاں کہو مَیں چلنے کے لئے تیار ہوں!“

”جو شخص زبیر جیسے محسن کے ساتھ دغا کر سکتا ہے، مجھے اُس کی

کسی بات پر اعتبار نہیں آسکتا۔ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ آنکھیں بند کر کے میرے ساتھ چلتے رہو۔"

قلعہ چھ کوس سے زیادہ دور نہ تھا۔ لیکن گنگو نے مصلحتاً طویل اور دشوار گزار راستہ اختیار کیا۔ قلعے کے سامنے پہنچ کر سوار گھوڑوں سے اُترے۔ جے رام کو خالد قلعے سے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اُس کی طرف ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا۔ "خالد! خالد!! تم بھی یہاں ہو تمھاری بہن کہاں ہے؟"

خالد نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی بجائے کترا کر گنگو کے پاس آکھڑا ہوا۔ جے رام کے دل پر چرکا لگا۔ اُس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ وہ ہاتھ جو خالد کے استقبال کے لئے اُٹھے تھے، جھکتے جھکتے پہلوؤں سے آلگے۔ اُس نے بے چارگی اور بے بسی کی حالت میں چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں پھر ایک بار خالد کے چہرے پر جم گئیں۔ خالد نے منہ پھیر لیا۔

جے رام نے پُرسوز آواز میں کہا۔ "خالد مجھے معلوم نہیں۔ میں تم سب کی نظروں میں اس قدر حقیر کیوں ہو گیا ہوں۔ میں بے قصور ہوں۔ میرے ساتھ اس طرح پیش نہ آؤ۔ مایا کہاں ہے؟"

(۳)

پیچھے سے آواز آئی۔ "میں یہاں ہوں!" جے رام نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ مایا چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ "مایا! مایا!! میری بہن! میری ننھی بہن!!" وہ یہ کہہ کر مایا کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے ہٹتے ہوئے چلائی۔ "ظالم!

کمینے، دغاباز، مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ تم نے ایک راجپوت باپ کے خون اور ایک راجپوت ماں کے دُودھ کی لاج نہیں رکھی۔ تم میرے کچھ نہیں لگتے۔ تمہارا دامن اپنے محسنوں کے خون سے داغدار ہے!"

اگر کوئی جے رام کا سینہ خنجر سے چھلنی کر ڈالتا، تو بھی شاید اُسے اس قدر تکلیف نہ ہوتی۔ اُس کے دِل میں غصّے کی آگ کے شعلے بھڑکے اور غم کے آنسوؤں سے بجھ گئے۔ اُس نے پھر ایک بار چاروں طرف دیکھا۔ گنگو کے چہرے پر ایک حقارت آمیز تبسّم دیکھ کر اُس کا منجمد خون کھولنے لگا۔ وُہ اپنے ہاتھوں کی مُٹھیاں بھینچتا اور ہونٹ چباتا ہُوا اُس کی طرف بڑھا۔ "ذلیل ڈاکو! ان سب باتوں کے ذمہ دار تم ہو۔ تم نے ان سب کو میرے خلاف کیا ہے"

پیشتر اس کے کہ گنگو کے ہاتھ مداخلت کے لئے اُٹھتے، جے رام نے اچانک دو مُکّے اُس کے مُنہ پر دے مارے۔ گنگو اپنے گال سہلاتا ہُوا پیچھے ہٹا۔ خالد نے ..... آگے بڑھتے ہوئے ایک مُکّا جے رام کے مُنہ پر مارا۔ جے رام نے خالد کے ہاتھ کی ضرب مُنہ سے زیادہ اپنے دل پر محسوس کی اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "خالد! تُم ......؟"

گنگو کے ساتھیوں کی تلواریں نیاموں سے باہر آ چکی تھیں لیکن اُس نے اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے منع کیا، اور جے رام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب بتاؤ تم اپنی بہن کی جان بچانے کے لئے زبیر کے ساتھیوں کو قید سے چھڑانے کے لئے تیار ہو؟"

جے رام نے زخم خوردہ سا ہو کر جواب دیا۔ "تو کیا تم بھی زبیر کی طرح

یہ سمجھتے ہو کہ مَیں پرتاپ رائے کی سازش میں شریک تھا؟"

گنگو نے جواب دیا "نہیں بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پرتاپ رائے تمہاری سازش میں شریک تھا۔ تم نے اُسے سراندیپ کے ہاتھیوں اور جواہرات کا لالچ دے کر جہاز لُوٹنے کے لئے آمادہ کیا۔"

"بھگوان جانتا ہے کہ مَیں بے قصور ہوں۔"

گنگو نے جواب دیا "بھگوان اس سے زیادہ جانتا ہے۔ اس وقت ہمارا کام تمہاری بے گناہی پر بحث کرنا نہیں۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں، کہ تم اپنی بہن کے لئے اُن بے گناہ قیدیوں کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو یا نہیں؟"

جے رام نے جواب دیا۔ "کاش انہیں چھوڑنا میرے بس میں ہوتا۔ وہ اِس وقت دو سَو سپاہیوں کے پہرے میں برہمن آباد جا رہے ہیں۔ اور مَیں اکیلا اُن کے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔"

"تو تم ہمیں یہ بتانا چاہتے ہو کہ تمہارے اپنے سپاہی تمہارا کہا نہیں مانتے؟"

"کاش! وہ میرے سپاہی ہوتے۔ قیدیوں پر پرتاب رائے کا پہرہ اس قدر سنگین ہے کہ مَیں اُن کے ساتھ بات چیت بھی نہیں کرسکتا۔ اُسے یقین ہوچکا ہے کہ مَیں اُن کا طرفدار ہوں۔"

گنگو نے اپنے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "تمہاری طرفداری کا شکریہ۔ اب میرے سوال کا جواب دو۔ تم انہیں چھڑانے کے لئے تیار ہو یا نہیں؟"

"بھگوان کے لئے مجھ پر اعتبار کرو۔ جب تک اُن کا معاملہ راجہ کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا میں بے بس ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ راجہ انہیں قید میں رکھ کر عربوں سے لڑائی مُول لینے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

گنگو نے کہا "پرتاب رائے تمہارا دوست ہے۔ اگر اُس کے پاس تمہارا خط پہنچ جائے کہ تم ہماری قید میں ہو تو کیا پھر بھی وہ اُنہیں رہا نہیں کرے گا؟ تم یہ خط لکھ دو اور ہم اُسے برہمن آباد پہنچنے سے پہلے تمہارا یہ خط پہنچا دیں گے۔"

جے رام نے جواب دیا "وہ لومڑی سے زیادہ مکار اور بھیڑیئے سے زیادہ ظالم ہے۔ مجھے اپنی سرگزشت بیان کرنے کا موقع دو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ بھگوان کے لئے میری بات مانو۔ پرتاپ رائے کو میری جان بچانے سے زیادہ خالد اور اگر ناہید بھی یہاں ہے، تو ان دونوں کی تلاش ـــــ ہو گی۔ جس طرح مجھے اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ تم یہاں کیسے پہنچے، اُسی طرح تم میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ دیبل کا واقعہ کس طرح پیش آیا۔" گنگو اور اس کے ساتھیوں کو متوجہ دیکھ کر جے رام نے بندرگاہ سے رخصت ہونے سے لے کر قید خانے میں زبیر سے ملاقات تک کے تمام واقعات بیان کئے اور اختتام پر گنگو اور خالد کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر اب بھی تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں آتا تو میں ہر سزا خوشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

گنگو بولا۔ "تو اب تم راجہ کے پاس قیدیوں کی سفارش کے لئے

جا رہے ہو؟"

"آپ کو اب بھی یقین نہیں آیا؟"

"اپنی بہن سے پوچھ لو۔ اگر اُسے تمہاری باتوں پر اعتبار آگیا ہو تو ہم بھی تم پر اعتبار کرنے کے لئے تیار ہیں۔" یہ کہہ کر گنگو مایا سے مخاطب ہُوا۔ "ہم تمہارے بھائی کا فیصلہ تم پر چھوڑتے ہیں!"

جے رام مایا کی طرف متوجہ ہُوا۔ مایا کے لئے یہ گھڑی صبر آزما تھی۔ بھائی کی سرگزشت سننے کے بعد اُس کے دِل میں ایک ردِّ عمل شروع ہو چکا تھا۔ تاہم وُہ اُس کے متعلق اپنے خیالات فوراً بدلنے کے لئے تیار نہ تھی۔ ضمیر کی ایک آواز اگر یہ کہہ رہی تھی کہ مایا تجھے اپنے بھائی پر اعتبار کرنا چاہیئے، تو دوسری آواز کہہ رہی تھی کہ نہیں وہ صرف تمہیں ساتھ لے جانے کے لئے بہانے بنا رہا ہے۔ اِس ذہنی کشمکش کے دَوران میں اُسے گنگو کے یہ الفاظ یاد آئے "اُس کی صُورت دیکھ کر تمہارا دِل تو پسیج نہ جائے گا ممکن ہے کہ مَیں تمہارے ہاتھ میں انصاف کی تلوار دے دُوں۔" مایا نے گنگو کی طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں "مَیں انصاف کی تلوار تمہارے ہاتھ میں دے چکا ہوں۔ اب تم اپنا وعدہ یاد کرو۔"

جے رام نے مایا کے تذبذب سے پریشان ہو کر کہا "مایا! تمہیں بھی اب مجھ پر اعتبار نہیں آتا؟"

اُس نے جواب دیا "اس بات کا کیا ثبوت کہ تم نے ان لوگوں کے انتقام کے خوف سے یہ قصہ نہیں سُنایا؟"

جے رام نے درد بھری آواز میں کہا "مایا! تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں بزدل ہوں۔ میں موت کے خوف سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ بھگوان کے لئے مجھے دوسروں کے سامنے شرمسار نہ کرو۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔ لیکن اگر تمہیں مجھ پر یقین نہیں آتا۔ یہ میرا خنجر لو۔ میرا دل چیر کر دیکھو کہ میرا لہو ابھی تک سرخ ہے یا سفید ہو چکا ہے۔" یہ کہتے ہوئے جے رام نے اپنا خنجر مایا کے ہاتھ میں دے دیا، اور اپنا سینہ اس کے سامنے تان کر بولا "مایا! تمہیں باپ کے سفید بالوں کی قسم! اپنی ماں کے دودھ کی قسم! اگر میں مجرم ہوں تو یہ خیال نہ کرو کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ میں یہ جاننے کے بعد زندہ نہیں رہنا چاہتا کہ میری بہن بھی مجھے بزدل خیال کرتی ہے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سلا دو۔ تمہاری رگوں میں اگر ایک راجپوت کا خون ہے تو اپنے بھائی کے ساتھ رعایت نہ کرو۔"

مایا نے جذبات کی شدت میں غیر شعوری طور پر اپنا ہاتھ جس میں خنجر تھا بلند کیا۔ جے رام کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ خالد نے کپکپی لی۔ مایا نے عزم و ہمت کے اس پیکر کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ خالد چلایا "مایا! تمہارا بھائی معصوم ہے۔" مایا کے کانپتے ہوئے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور وہ بے اختیار جے رام سے لپٹ کر ہچکیاں لینے لگی۔ "بھیا! بھیا!! مجھے معاف کر دو!"

جے رام اس کے سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بار بار یہ کہہ رہا تھا۔ "میری بہن! میری ننھی مایا!!"

بہن اور بھائی ایک دُوسرے سے علیحدہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ خالد نے جے رام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "جے رام مجھے معاف کرنا، مجھے تم پر شک نہیں کرنا چاہئے تھا"۔

جے رام نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں بھی شاید یہی کرتا"۔

خالد نے مسکراتے ہوئے کہا: "میں نے ہنگامی جوش میں آپ کے مُنہ پر ایک مُکّا رسید کر دیا تھا۔ اب آپ یہ قرض وصُول کر سکتے ہیں"۔

جے رام نے جواب دیا۔ "نہیں اب یہ قصّہ نہ چھیڑو، ورنہ تمہیں ایک مُکّا مار کر مجھے گنگو سے دو وصُول کرنے پڑیں گے"۔

(۳)

گنگو اپنی زندگی میں کبھی اس قدر پریشان نہیں ہُوا تھا۔ وہ سر جُھکائے کھڑا تھا۔ جے رام نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "گنگو اگر تم خلوص دل سے زبیر اور اس کے ساتھیوں کو چھڑانا چاہتے ہو، تو یہ معاملہ چند دن کے لئے مجھ پر چھوڑ دو۔ مجھے اُمید ہے کہ راجہ صحیح خطرات سے باخبر ہو کر اُنہیں قید میں رکھنے کی جرأت نہیں کرے گا، اور اگر اُس نے میری بات نہ سُنی، تو میں تمہارے پاس چلا آؤں گا، اور ہم کوئی اَور تدبیر سوچیں گے لیکن خالد کی بہن کہاں ہے؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ جہاز پر زخمی ہو گئی تھی"۔

"اب کیسی ہے وہ؟"

اس سوال کے جواب میں خالد بولا "اب وہ پہلے سے اچھی ہے۔ لیکن زخم ابھی تک مندمل نہیں ہُوا۔ مَیں مایا دیوی کا شکرگزار ہوں۔ انہوں نے اس کی تیمارداری میں بہت تکلیف اُٹھائی ہے۔"

گنگو نے کہا۔ "جے رام! اگر پرتاپ رائے نے راجہ کے حکم سے جہاز لُوٹے ہیں، تو مجھے یقین نہیں کہ وہ قیدیوں کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوگا۔ میرے خیال میں وُہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ یہ خبر سندھ سے باہر نہ نکلے برہمن آباد میں ایسے قید خانے ہیں جہاں سے صرف موت کی صُورت میں انسان باہر نکلتے ہیں۔ اِس صُورت میں اس خبر کو مکران یا بصرے تک پہنچانا ضروری ہے۔ اگر اُن کی حکومت نے مداخلت کی تو راجہ یقیناً قیدیوں کو چھوڑ دے گا۔"

جے رام نے کہا۔ "اگر خالد جانا چاہے تو مَیں اسے سرحد کے پار پہنچا دینے کا ذمّہ لیتا ہوں۔"

گنگو نے جواب دیا۔ "خالد کو مَیں بھی سرحد کے پار پہنچا سکتا ہوں۔ لیکن جب تک اس کی بہن تندرست نہیں ہوتی۔ اُس کے لئے جانا ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ عربوں کی فوجیں اِس وقت ترکستان اور افریقہ میں لڑ رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ سپاہیوں کی قلّت کے پیشِ نظر سندھ کے ساتھ بگاڑ پسند نہ کریں۔ خالد کا خیال ہے کہ اگر زبیر کسی طرح رہا ہو جائے، تو یہ مہم اُس کے لئے بہت آسان ہوگی۔ وہ بصرہ اور دمشق کے ہر با اثر

آدمی تو جانتا ہے۔"

جے رام نے کہا "اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی زبیر کو قید سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

مایا نے کہا "بھیا! تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ زبیر کی رہائی کی کوشش ضرور کرو۔"

"مایا! تمہاری سفارش کے بغیر بھی میرا یہ فرض ہے" یہ کہہ کر جے رام گنگو سے مخاطب ہوا "اب اگر آپ کی اجازت ہو تو میں مایا سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

گنگو کا اشارہ پا کر اس کے ساتھی وہاں سے کھسک گئے۔ گنگو نے ایک طرف ہو کر خالد سے کہا "تم ناہید کے پاس جاؤ اور اگر وہ قیدیوں کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتی ہو تو پوچھ آؤ۔"

خالد اندر داخل ہوا تو ناہید دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی۔ اس نے کہا "ناہید تمہیں خدا افاقہ ہوتا ہے تو تم چلنے پھرنے لگتی ہو۔ تمہیں بستر پر لیٹنا چاہیے۔"

ناہید نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا "تم نے بیچارے جے رام پر بہت سختی کی۔ اب مایا کے متعلق تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

خالد نے جواب دیا "مایا کے متعلق ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ وہ بہن بھائی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ غالباً وہ اس کے ساتھ چلی جائے گی۔ جے رام نے زبیر کو قید سے چھڑانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ رہا ہوتے ہی مکران

کے راستے بصرہ پہنچ کر ہماری سرگزشت سنائے گا۔ عورتوں اور بچوں کے رہا ہونے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ ہماری حکومت اس معاملے میں مداخلت کرے۔"

ناہید نے کہا "میں یہ باتیں سن چکی ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ جس طرح ابا کے معاملے میں حکومت سندھ نے مکران کے گورنر کو ٹال دیا تھا اسی طرح یہ معاملہ بھی رفع دفع ہو جائے گا۔ میں نے سنا ہے کہ بصرہ کا حاکم بہت جابر ہے لیکن سندھ کی طرف متوجہ نہ ہونے کے لئے اس کے پاس معقول بہانہ ہے کہ عرب کی تمام افواج ایشیا اور افریقہ میں برسرِ پیکار ہیں۔"

خالد نے پریشان ہو کر کہا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا لیکن میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں، وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔"

ناہید نے کہا۔ "میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ میں بصرہ کے حاکم کو خط لکھتی ہوں۔ اگر جے رام زبیر کو رہا کروا سکے تو اسے کہو یہ خط اس کے حوالے کر دے۔ اگر بالفرض میرا خط حاکم بصرہ کو متاثر نہ کر سکا تو بصرہ کے عوام اس سے ضرور متاثر ہوں گے۔ میں خواب میں مسلمانوں کو قید خانے کے دروازے توڑتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے اپنے خواب کے صحیح ہونے پر یقین ہے۔"

"تو تم اندر جا کر یہ خط لکھو۔ لیکن کس چیز پر لکھو گی؟ ہاں یہ لو میرا رومال"

خالد نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ناہید کو رومال دیا۔ اور واپس مڑتے ہوئے کہا۔ "تم خط لکھو۔ میں اتنی دیر جے رام کو روکتا ہوں۔"

باہر مایا اپنے بھائی کو آپ بیتی سنا رہی تھی۔ اختتام پر جے رام

نے پوچھا "مایا تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں"۔

"نہیں" اُس نے جواب دیا۔ "گنگو مجھے اپنی بیٹی سمجھتا ہے۔ ناہید مجھے اپنی چھوٹی بہن خیال کرتی ہے"۔

جے رام نے کہا "مایا! مَیں تمہیں ایک بہت بڑی خبر سُنانا چاہتا ہوں"۔

مایا نے گھبرا کر پوچھا "وہ کیا؟"

"بات یہ ہے کہ مَیں تمہیں اس وقت اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ مَیں نے تمہارے غائب ہونے کی ذمہ داری پرتاب رائے پر تھوپی تھی۔ لیکن جب اُس نے زبیر اور علی کو اذیت دینا شروع کی تو مجھے اُن کی جانیں بچانے کے لئے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ تم میرے ساتھ نہ تھیں۔ اب اگر مَیں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں تو مجھے ناہید اور خالد کا پتہ بتانے پر مجبور کیا جائے گا۔ مَیں بذاتِ خود راجہ کی سختی سے نہیں ڈرتا۔ لیکن پرتاب رائے کو شک ہو جائے گا اور وہ ناہید اور خالد کی تلاش شروع کر دے گا۔ مَیں یہ نہیں چاہتا کہ تمہیں دیکھ کر انہیں خالد اور ناہید کے روپوش ہونے کا شک ہو۔ اگر تم چند دِن اور یہاں رہنا گوارا کرو تو پرتاب رائے غالباً تین چار روز تک واپس دیبل چلا جائے گا۔ اُس کے بعد مَیں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا"۔

مایا نے اطمینان سے جواب دیا "بھیا! آپ میری فکر نہ کریں۔ مَیں یہاں ہر طرح خوش ہوں اور جب تک ناہید تندرست نہیں ہوتی۔ مَیں اُسے چھوڑ کر جانا پسند بھی نہ کروں گی"۔

گنگو اور خالد کچھ فاصلے پر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جے رام

نے اُنھیں آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اشارے سے اپنے پاس بُلا لیا۔ جب وہ قریب پہنچے تو اُس نے کہا: "آپ کو کہیں یہ شک نہ ہو جائے کہ مَیں پھر کوئی سازش کر رہا ہوں۔ مایا کہتی ہے کہ وہ ناہید کے تندرست ہونے تک یہیں رہنا چاہتی ہے اور مَیں بھی بعض مصلحتوں کی بنا پر اُسے یہاں چھوڑنا چاہتا ہوں۔ مَیں چند دن تک اُسے لے جاؤں گا۔ ممکن ہے، کہ مجھے بھی زبیر کے ساتھ فرار ہونا پڑے اور مَیں ہمیشہ کے لئے آپ کے ساتھ آ جاؤں۔ اب مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ممکن ہے کہ راجہ پرتاب رائے کے شہر میں پہنچتے ہی ہمیں ملاقات کے لئے بُلا لے۔ میرا غیر حاضر ہونا ٹھیک نہیں۔"

خالد نے کہا: "آپ ذرا ٹھہریئے۔ ناہید ایک خط لکھ رہی ہے آپ یہ خط زبیر کو آزاد کروانے کے بعد اُس کے حوالے کر دیں۔"

"تو جلدی سے وہ خط لے آؤ۔ مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ برہمن آباد کے قریب پہنچ چکے ہوں گے۔"

گنگو نے کہا: "آپ فکر نہ کریں۔ ہم اُن سے پہلے آپ کو ایک آسان راستے سے برہمن آباد پہنچا دیں گے۔"

جے رام نے کہا: "مَیں فقط آپ کا ایک ساتھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ برہمن آباد میں اُسے کوئی نہ پہچانتا ہو۔ اگر کوئی نازک وقت آیا تو مَیں اُسے آپ کے پاس اطلاع دینے کے لئے روانہ کر دوں گا۔"

گنگو نے کہا: "آپ واسو کو لے جائیں"

دوپہر کے وقت جے رام واسو کی رہنمائی میں جنگل عبور کر رہا تھا۔

دوست اور دشمن

برہمن آباد سے ایک کوس کے فاصلے پر جے رام کو اپنا قافلہ دکھائی دیا۔ اُس نے واسو کے ساتھ قافلے میں شریک ہونا خلافِ مصلحت سمجھتے ہوئے اپنا راستہ تبدیل کر دیا۔ اور دُوسرے دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ برہمن آباد میں نرائن داس نامی ایک نوجوان اُس کا پرانا دوست تھا۔ جے رام نے واسو کو اُس کے گھر میں ٹھہرا کر شاہی مہمان خانے کا رُخ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پرتاب رائے سپاہیوں اور قیدیوں سمیت وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے جے رام کو دیکھتے ہی کہا۔ "میرے ساتھ تم نے شکار کا بہانہ کیوں کیا۔ تم نے صاف یہ کیوں نہ بتایا کہ تم مجھ سے پہلے مہاراج سے مِلنا چاہتے تھے۔ اب بتاؤ، تمہاری بہن کی کہانی سننے کے بعد مہاراج نے کیا کہا؟"

"مَیں ابھی تک مہاراج سے نہیں مِلا اور نہ میری یہ نیت ہی تھی۔"

پرتاب رائے نے مطمئن ہو کر کہا۔ "جے رام! میرا خیال ہے کہ اپنی بہن کے غائب ہو جانے کے متعلق تم نے جھُوٹ نہیں کہا تھا۔ مَیں عربوں کے علاوہ سراندیپ کے قیدیوں سے بھی پُوچھ چکا ہوں۔ وہ سب تمہارے

پہلے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ اگر اُنہوں نے راجہ سے یہ شکایت کی کہ تمہاری بہن کے علاوہ ایک مسلمان لڑکی بھی جہاز پر سے غائب ہوئی ہے تو ممکن ہے کہ راجہ مجھے اِس بات کا ذمہ دار ٹھہرائیے؟"

"مَیں راجہ کے سامنے بھی یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ میری بہن جہاز پر نہ تھی اور مسلمان لڑکی کے غائب ہو جانے کا واقعہ بھی صحیح نہیں۔"

"لیکن وہ جہاز پر سے غائب ہوئی ہیں۔ تمہارا بیان راجہ کو مطمئن نہ کر سکے گا۔"

جے رام نے پریشان ہو کر کہا۔ "آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ پہلے آپ نے زبیر اور علی کو اذیت پہنچا کر مجھے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ میری بہن غائب نہیں ہوئی۔ اب آپ یہ ثابت کرنے پر مُصر ہیں کہ عرب لڑکی اور میری بہن جہاز پر سے غائب ہوئی ہیں۔"

پرتاب رائے نے جواب دیا۔ "مَیں یہ پُوچھنا چاہتا ہوں کہ وُہ کون سی مجبُوری تھی جس نے تمہیں اپنی بہن کا راز چُھپانے پر مجبور کیا؟"

"آپ جانتے ہیں کہ زبیر میرا محسن تھا۔ اُس نے میری جان بچائی تھی اور مَیں یہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ اِس واقعہ کی آڑ لے کر اُسے اذیت پہنچائیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم صرف زبیر کی خاطر اپنے صحیح دعویٰ سے دست بردار ہوئے۔ تم زبیر کی دوستی پر اپنی بہن کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو۔ لیکن تمہارا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ تمہاری بہن کو مَیں نے اغوا

کیا ہے اور صرف تمہاری بہن ہی نہیں بلکہ ایک عرب لڑکی اور لڑکے کے غائب ہو جانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہی عاید ہوتی ہے۔"

جے رام نے جواب دیا۔ "نہیں نہیں۔ مجھے آپ کے متعلق جو غلط فہمی تھی وُہ دُور ہو چکی ہے۔"

"کب؟"

جے رام نے اچانک محسوس کیا کہ پرتاب اُس کے لئے پھر ایک پھندا تیار کر رہا ہے، اُس نے چونک کر کہا۔ "آخر ان باتوں سے آپ کا مطلب؟ مَیں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ مَیں راجہ کے سامنے اپنی بہن کا ذکر نہیں کروں گا۔"

پرتاب رائے نے سرد مہری سے کہا۔ "تم جو کچھ خود نہیں کہنا چاہتے وہ عربوں کی زبان سے کہلواؤ گے۔ اِس سے میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پہلے جس راز کو تم ظاہر کرنا چاہتے تھے اُسے مَیں چھپانا چاہتا تھا اب جس راز کو تم چھپانا چاہتے ہو اُسے مَیں ظاہر کرنے پر مجبور ہوں۔ میرے متعلق اگر تمہاری غلط فہمی دُور ہوئی ہے تو اُس کی کوئی وجہ ہے، اور مَیں وہ وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مَیں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ تم ایک عرب کے لئے اتنی بڑی قربانی کر سکتے ہو۔ کوئی عقلمند آدمی یہ ماننے کے لئے تیار نہ ہو گا۔"

"تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ مَیں نے خود اپنی بہن کو کہیں غائب کر دیا ہے۔"

"تمہاری بہن کا مسئلہ میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن عرب لڑکی کا سُراغ لگانے کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ تمہاری طرح عربوں نے بھی راجہ کو مجھ سے بدظن کرنے کے لئے ایک لڑکی کے غائب ہو جانے کا بہانہ تراشا ہو۔ لیکن اگر دربار میں اُس کے غائب ہو جانے کا سوال اُٹھایا گیا تو ہم میں سے ایک کو یہ ذمہ داری اپنے سر لینا پڑے گی۔"

جے رام نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "جس طرح میں نے آپ سے انتقام لینے کے لئے اپنی بہن کے غائب ہو جانے کا جھوٹا افسانہ تراشا تھا، اسی طرح اُنھوں نے مجھے آپ کا شریکِ کار سمجھ کر محض انتقام کے لئے یہ بہانہ تلاش کیا ہے۔ میں زبیر کو سمجھا سکتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ وہ میرے کہنے پر راجہ کے سامنے جھوٹی شکایت پیش نہیں کرے گا۔"

پرتاب رائے نے بے رُخی سے کہا "تم کسی قیدی سے بات چیت نہیں کر سکتے۔ میں نے سپاہیوں کو حکم دے دیا ہے، راجہ کے سامنے پیش ہونے سے پہلے تمہیں اپنا صندوق کھول کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں۔"

جے رام کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن فوج کے ایک افسر نے آکر پرتاب رائے کو اطلاع دی کہ مہاراج آپ کو یاد فرماتے ہیں۔

جے رام نے پرتاب رائے کے ساتھ جانا چاہا لیکن اُس نے کہا۔ "مہاراج نے مجھے یاد فرمایا ہے تمہیں نہیں۔ تم اطمینان سے بیٹھے رہو۔ جب تمہیں بلایا جائے گا میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گا۔"

پرتاب رائے جہاز سے لُوٹا ہوا مال اُٹھوا کر چلا گیا، اور جے رام

پریشانی کی حالت میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ زبیر باقی قیدیوں کے ساتھ ہی ایک کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے ٹہلتے ٹہلتے اندر جھانک کر دیکھا لیکن پہرہ دار نے اُسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ جے رام سے ایک معمولی پہرہ دار کا یہ سلوک دیکھ کر زبیر اور دوسرے قیدیوں کو یقین ہونے لگا کہ وہ اُن کے ساتھ ایک ہی کشتی میں سوار ہے۔

(۲)

غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے راجہ کے ایک سپاہی نے جے رام کو اطلاع دی کہ مہاراج آپ کو بلاتے ہیں۔ جے رام کاٹھیاواڑ کے راجہ کے تحائف کا صندوق اُٹھوا کر راجہ کے محل میں پہنچا۔ پہرہ دار اُسے محل کے ایک کمرے میں لے گئے۔ راجہ داہر سنگِ مرمر کے چبوترے کے اُوپر سونے کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاب رائے کے علاوہ دیبل کا حاکمِ اعلیٰ اور سیناپتی اودھے سنگھ اور اُس کا نوجوان بیٹا بھیم سنگھ جو ارورؔ[1] سے راجہ کے ساتھ آئے تھے اُس کے سامنے کھڑے تھے۔ جے رام نے راجہ کو تین بار جھک کر پرنام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ دو سپاہیوں نے آبنوس کا صندوق راجہ کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ جے رام نے راجہ کے حکم سے صندوق کھولا۔ راجہ نے جواہرات پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ پھر پرتاب رائے کی طرف

---

[1] سندھ کا دارالحکومت۔ ضلع نواب شاہ میں بیرانی کے قریب ایک قدیم شہر کے کھنڈرات موجود ہیں جسے دلور کہا جاتا ہے۔ بعض محققین کے خیال میں دلور، ارور کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ لیکن بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ ارور کا شہر موجودہ روہڑی کے آس پاس آباد تھا اور دریائے سندھ نے اس کا نشان تک نہیں چھوڑا۔

دیکھا اور جے رام سے سوال کیا۔ "ہم نے سُنا ہے کہ تم عربوں کی حمایت کرنا چاہتے تھے۔ تم نے ہمارے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ ہم عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور تم نے ہمارے وفادار پرتاب رائے پر تہمت لگانے کے لئے ایک عرب لڑکی اور اپنی بہن کو کہیں چھپا دیا ہے۔"

جے رام نے جواب دیا۔ "اَن داتا! مجھے یہ یقین نہ تھا کہ پرتاب رائے نے آپ کے حکم سے اُن کے جہازوں کو لوٹا تھا۔ اُن کا دیبل میں ٹھہرنے کا ارادہ نہ تھا۔ اُنہوں نے مجھے راستے میں بحری ڈاکوؤں سے چھڑایا تھا۔ دیبل میں مَیں اُنہیں اپنے مہمان بنا کر لایا تھا۔ اور اپنے مہمانوں کی رکھشا ایک راجپوت کا دھرم ہے۔ عرب لڑکی اور اپنی بہن کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جب جہاز لوٹے جا رہے تھے میں ایک کوٹھڑی میں بند تھا۔"

"تم نے پرتاب رائے سے یہ کہا تھا کہ تم نے عربوں کو اُس کی قید سے چھڑانے کے لئے یہ بہانہ تراشا تھا؟"

"اَن داتا! مَیں اس سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن ...."

راجہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم کچھ نہیں سُننا چاہتے۔ اگر عربوں نے یہ شکایت کی کہ جہاز پر سے اُن کی ایک لڑکی غائب ہوئی ہے تو تمہیں اُس لڑکی کو ہمارے حوالے کرنا پڑے گا۔"

"مہاراج! اگر عرب مجھ پر یہ شُبہ ظاہر کریں کہ لڑکی کو میں نے اغوا کیا ہے تو مَیں ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔"

"ہم تمہاری چال اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اگر عربوں نے تمہیں قصوروار نہ ٹھہرایا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم نے اُن کی مرضی سے لڑکی کو کہیں چھپا رکھا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس ایسے طریقے ہیں جن سے انہیں سچ بولنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔"

"اَن داتا اگر مجھے قصوروار ٹھہراتے ہیں تو جو سزا جی میں آئے، دے لیں۔ لیکن عربوں کے ساتھ پہلے ہی بہت زیادتی ہو چکی ہے۔"

"تو تم ہمارے دشمنوں کے ساتھ دوستی کا دم بھرتے ہو؟"

"وُہ آپ کے دشمن نہیں۔ وہ سندھ کو عرب کا ایک پُرامن ہمسایہ خیال کرتے تھے، ورنہ وُہ دیبل کے قریب سے بھی نہ گزرتے۔ اگر وہ نیک نیت نہ ہوتے تو جواہرات کا یہ صندوق جو مَیں مہاراجہ کاٹھیاواڑ کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں آپ تک نہ پہنچتا۔"

راجہ نے کہا "کاٹھیاواڑ کے جواہرات، سراندیپ کے جواہرات کے مقابلے میں پتھر معلوم ہوتے ہیں۔"

"مہاراج! مَیں جوہری نہیں، ایک سپاہی ہوں۔ مَیں پتھروں کو نہیں پہچانتا لیکن آپ کے دوست اور دُشمن کو پہچانتا ہوں۔ مَیں اِن پتھروں کے ساتھ آپ کی خدمت میں مہاراجہ کاٹھیاواڑ کی دوستی کا پیغام لایا ہوں۔ ان پتھروں کی قیمت، اگر ایک کوڑی بھی نہ ہو تو بھی وُہ ہاتھ جو آپ کے سامنے یہ ناچیز تحائف پیش کر رہا ہے بہت قیمتی ہے۔ لیکن پرتاب رائے نے عرب جیسی پُرامن اور طاقتور ہمسایہ سلطنت کے جہاز لوٹ کر جو کچھ

آپ کے لئے حاصل کیا ہے۔ وہ آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ اَن داتا! آپ کو مسلمانوں سے دشمنی مُول لینے سے پہلے بہت سوچ بچار سے کام لینا چاہئیے اُن کا ہاتھ ہر ہاتھ سے مضبوط ہے اور اُن کا لوہا ہر لوہے کو کاٹتا ہے۔ وہ جیٹھ کی آندھیوں کی طرح اُٹھتے ہیں اور ساون کے بادلوں کی طرح چھا جاتے ہیں۔ اُن کے مقابلے پر آنے والوں کو نہ سمندر پناہ دے سکتے ہیں اور نہ پہاڑ۔ اُن کے گھوڑے پانی میں تیرتے اور ہوا میں اُڑتے ہیں۔ آپ نے برسات میں دریائے سندھ کی لہریں دیکھی ہیں لیکن اُنکی فتوحات کا سیلاب اُس سے کہیں زیادہ تُند اور تیز ہوتا ہے“۔

راجہ داہر کی قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اُس نے چلّا کر کہا۔ یہ ڈرپوک گیدڑ، تمہاری رگوں میں راجپوت کا خون نہیں۔ میرے مُلک میں تمہارے جیسے بُزدل آدمی کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں“۔

”اَن داتا! مَیں اس وقت مہاراجہ کاٹھیاواڑ کا ایلچی ہوں میں خود ایسے مُلک میں نہیں رہنا چاہتا جس میں دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست خیال کیا جائے“۔

”کاٹھیاواڑ کا راجہ اگر خود بھی یہاں موجود ہوتا تو بھی مَیں یہ الفاظ سُننے کے بعد اُس کا سر قلم کروا دیتا۔ پرتاب رائے اسے لے جاؤ۔ ہم کل اس کی سزا کا فیصلہ کریں گے۔ صبح عربوں کے سرغنہ کو ہمارے سامنے پیش کرو“۔

پرتاب رائے نے سپاہیوں کو آواز دی۔ اور آٹھ آدمی ننگی تلواریں لئے موجود ہوئے۔ پرتاب رائے نے جے رام کو چلنے کا اشارہ کیا۔ جے رام

ننگی تلواروں کے پہرے میں پرتاپ رائے کے آگے آگے چل دیا +

اودھے سنگھ جے رام کی تقریر کے دوران میں یہ محسوس کر رہا تھا، کہ ایک سر پھرا نوجوان اُس کے اپنے خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اُس نے کہا: "اَن داتا اگر مجھے اجازت ہو تو کچھ عرض کروں"۔

راجہ نے جواب دیا: "تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اسے ایسی سزا دیں گے جو برہمن آباد کے لوگوں کو دیر تک نہ بھولے"۔

اودھے سنگھ نے کہا: "لیکن مہاراج مَیں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے جو کچھ کہا ہے نیک نیتی سے کہا ہے۔ ہمیں چند ہاتھیوں اور جواہرات کے لئے عربوں کے ساتھ دشمنی مول نہیں لینی چاہئے۔ ہمیں اپنی طاقت پر بھروسہ ہے لیکن عرب ایک سخت جان دشمن ہیں"۔

راجہ نے کہا: "اودھے سنگھ! ایک گیدڑ کی چیخیں سُن کر تم بھی گیدڑ بن گئے۔ عرب اُونٹنیوں کا دُودھ پینے والے اور جَو کی سُوکھی روٹی کھانے والے ہمارے مقابلے کی جرأت کریں گے؟"

"مہاراج! وہ اُونٹنیوں کا دُودھ پی کر شیروں سے لڑتے ہیں۔ جَو کی روٹی کھا کر پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں"۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ اونٹوں پر چڑھ کر ہمارے ہاتھیوں کے مقابلے کے لئے آئیں گے؟"

"اَن داتا! بُرا نہ مانیں۔ اُن کے اُونٹ ایران کے ہاتھیوں کو شکست دے چکے ہیں"۔

راجہ نے غصے میں آکر کہا: "اودھے سنگھ مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی کہ تم عربوں کے متعلق سُنی سنائی باتوں سے مرعوب ہو جاؤ گے۔ ہم عرب کی ساری آبادی سے زیادہ سپاہی میدان میں لا سکتے ہیں۔ راجپوتانہ کے تمام راجہ ہمارے اشارے پر اپنی گردنیں کٹوانے کے لئے تیار ہوں گے۔"

اُودھے سنگھ نے کہا: "مہاراج! مجھے اُن کا خوف نہیں، لیکن میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ہمیں سوئے ہوئے فتنے کو جگانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ دوسروں کی مدد کے بھروسے پر ایک طاقتور دشمن سے لڑائی مول لینا ٹھیک نہیں۔"

"اودھے سنگھ تم بار بار کیا کہہ رہے ہو؟ سندھ کے سامنے عرب کے صحرائی ایک طاقتور دشمن کی حیثیت نہیں رکھتے۔ آخر عربوں میں کیا خوبی ہے جو ہمارے سپاہیوں میں نہیں؟"

"مہاراج! ایسے دشمن کا کوئی علاج نہیں جو موت سے نہ ڈرتا ہو۔ اگر آپ کو مجھ پر یقین نہ ہو تو آپ قیدیوں میں سے ایک عرب کو بُلا کر اُس کا امتحان لے لیں۔ تلواریں اُن کے لئے کھلونے ہیں۔"

راجہ نے اُودھے سنگھ کے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا: "کیوں بھیم سنگھ تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ ہمارے سپاہی عربوں کے مقابلے میں کمزور ہیں؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا: "مہاراج! پتا جی عربوں کے ساتھ پُر امن رہنے میں بھلائی سمجھتے ہیں۔ ورنہ ہم نے بھی تلواروں کے سائے میں پرورش پائی ہے۔ اگر عرب موت سے نہیں ڈرتے تو ہمیں مارنے سے پیچھے نہیں ہٹنا

چاہئے"۔

راجہ نے کہا "شاباش! دیکھا اودھے سنگھ تمہارا بیٹا تم سے بہادر ہے"۔

اودھے سنگھ نے جواب دیا "مہاراج کے مُنہ سے یہ سُن کر مجھے خوش ہونا چاہئے۔ لیکن سیناپتی کے فرائض کا احساس مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں مہاراج کے سامنے آنے والے خطرات کو گھٹا کر پیش نہ کروں۔ بھیم سنگھ ابھی بچہ ہے۔ اُس نے عربوں کو لڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن میں مکران کی جنگ میں یہ دیکھ چکا ہوں کہ ایک عام عرب سپاہی ہمارے بڑے سے بڑے پہلوان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ مکران پر عربوں نے کُل چھ سو سواروں کے ساتھ حملہ کیا تھا اور راجہ کے چار ہزار سپاہیوں کو تنکوں کی طرح بہا لے گئے۔ جے رام کو آپ دیر سے جانتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں اُس سے بڑھ کر تلوار کا دھنی اَور کوئی نہیں۔ اگر وہ عربوں سے اِس قدر مرعوب ہے تو اُس کی وجہ یہ نہیں کہ وُہ بُزدل یا مہاراج کا نمک حرام ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ عربوں سے بگاڑ کے خطرے کا صحیح اندازہ کر چُکا ہے"۔

راجہ نے تلخ لہجہ میں کہا "تم میرے سیناپتی ہو وزیر نہیں۔ اَور مَیں ان معاملات میں تمہاری سمجھ سے کام نہیں لینا چاہتا۔ اگر بڑھاپے میں تمہاری ہمت جواب دے چکی ہے تو تمہیں اس عہدہ سے سبکدوش کیا جا سکتا ہے اور تمہیں یہ بھی حق نہیں کہ تم جے رام جیسے سرکش، گستاخ اور بُزدِل آدمی کی سفارش کرو۔ وہ جو کچھ ہمارے سامنے کہہ چکا ہے

وہ اُسے بڑی سے بڑی سزا دینے کے لئے کافی ہے"۔

اودھے سنگھ راجہ کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اُس نے کہا۔" مہاراج میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو میرے متعلق غلط فہمی ہوئی۔ میں نے اتنی باتیں کرنے کی جرأت اس لئے کی کہ ابھی تک آپ نے عرب کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کیا۔ اگر آپ اعلانِ جنگ کر چکے ہوں تو میرا فرض ہے اور صرف میرا ہی فرض نہیں بلکہ ہر سپاہی کا یہ فرض ہے کہ آپ کی فتح کے لئے اپنی جان قربان کر دے۔ جے رام کی گستاخی کا مجھے افسوس ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وقت آنے پر وہ بھی ایک وفادار راجپوت ثابت ہو گا۔ اگر آپ عربوں کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، تو ہمیں آج ہی سے تیاری شروع کر دینی چاہیئے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم عربوں کو ایسی شکست دیں کہ وہ پھر سر اُٹھانے کے قابل نہ ہو سکیں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں اپنی افواج منظم کرنے کے علاوہ شمالی اور جنوبی ہندوستان کے تمام چھوٹے اور بڑے راجوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے۔ وہ سب آپ کا لوہا مانتے ہیں۔ اور آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر لڑنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھیں گے۔ ہمیں کاٹھیا واڑ کے راجہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اُس نے آپ کو تحائف نہیں بھیجے، خراج بھیجا ہے۔ اگر آپ جے رام کا جرم معاف کر دیں تو اُس کی وساطت سے جنگ میں بھی مہاراجہ کاٹھیا واڑ کا تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے"۔

راجہ نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔" اب تم ایک راجپوت کی طرح

بول رہے ہو۔ لیکن جے رام عربوں کے ساتھ مل چکا ہے۔ اگر اُسے معاف بھی کر دیا جائے تو اِس بات کا کیا ثبوت کہ وہ ہمارے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا۔ ہاں مَیں نے سُنا ہے کہ وُہ ایک عرب نوجوان کی دوستی کا دم بھرتا ہے۔ اگر وُہ اُس کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار ہو جائے، اور اُسے تلوار کے مقابلے میں مغلوب کرلے تو مَیں اُسے چھوڑ دوں گا۔"

"مہاراج! وہ آپ کا اشارہ پا کر پہاڑ کے ساتھ ٹکر لگانے کے لئے بھی تیار ہو گا۔"

"بہت اچھا! ہم تمہاری سفارش پر اُسے موقع دیں گے۔ کل ہم جے رام کی نیک نیتی کے علاوہ تلوار چلانے میں ایک عرب کی جسارت بھی دیکھ لیں گے۔"

راجہ نے یہ کہنے کے بعد مجلس برخاست کی اور اُٹھ کر محل کے دُوسرے کمرے میں چلا گیا۔

(۳)

اگلے دن راجہ داہر نے برہمن آباد کے محل کے ایک کشادہ کمرے میں دربار منعقد کیا۔ سندھ کے دارالخلافہ ارور سے اُس کا وزیر بھی برہمن آباد پہنچ چکا تھا۔ وزیر، سیناپتی اور برہمن آباد کے اُمراحسبِ مراتب تخت کے قریب کرسیوں پر رونق افروز تھے۔ وزیر اور سیناپتی کے بعد تیسری کرسی جس پر پہلے برہمن آباد کا گورنر بیٹھتا تھا، اب دیبل کے گورنر کو دی گئی تھی۔ اور برہمن آباد کا گورنر راجہ سے چند بالشت دُور ہو جانے پر یہ محسُوس کر

رہا تھا کہ قدرت نے راجہ اور اُس کے درمیان پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں۔ راجہ کے بائیں ہاتھ پانچویں کرسی پر بھیم سنگھ براجمان تھا۔ باقی اُمراء بائیں طرف دوسری قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیوں کے پیچھے پندرہ بیس عہدیدار دائیں بائیں دو قطاروں میں کھڑے تھے۔ تخت پر راجہ کے دائیں اور بائیں دو رانیاں رونق افروز تھیں۔ ایک حسین و جمیل لڑکی راجہ کے پیچھے صراحی اور جام لئے کھڑی تھی۔ درباری شاعر نے مترنم آواز میں راجہ کی تعریف میں چند اشعار پڑھے۔ اس کے بعد کچھ دیر رقص و سرود کی محفل گرم رہی۔ راجہ نے شراب کے چند جام پیئے اور قیدیوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ سپاہی زبیر کو پا بہ زنجیر دربار میں لے آئے۔ اُس کے تھوڑی دیر بعد جے رام داخل ہوا۔ زبیر کی طرح اُس کے ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں نہ تھیں۔ لیکن اُس کے آگے اور پیچھے ننگی تلواروں کا پہرہ زبیر کو یہ یقین دلانے کے لئے کافی تھا کہ اُس کی حالت اُس سے مختلف نہیں۔

راجہ نے پرتاب رائے کی طرف دیکھا اور پوچھا "یہ ہماری زبان جانتا ہے؟"

اُس نے اُٹھ کر جواب دیا۔ "جی مہاراج! یہ اجنبی زبانیں سیکھنے میں بہت ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔"

راجہ نے زبیر کی طرف دیکھا اور پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"زبیر!" اُس نے جواب دیا۔

راجہ نے کہا۔ "ہم نے سُنا ہے کہ تم ہمارے ساتھ بات کرنے کے لئے بہت بے چین تھے۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دیبل کی بندرگاہ پر ہمارے جہاز کیوں لُوٹے گئے اور ہمیں قیدی بنا کر ہمارے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟"

راجہ نے قدرے بے چین ہو کر جواب دیا۔ "نوجوان! ہم پہلے سُن چکے ہیں کہ عربوں کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ لیکن تمہیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خاطر ذرا ہوش سے کام لینا چاہیئے۔"

زبیر نے کہا۔ "ہمارے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے اگر آپ کو اس کا علم نہیں تو یہ اور بات ہے، ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دیبل کے گورنر نے بغیر کسی وجہ کے ہم پر دست درازی کی۔ اگر آپ کو ہمارے متعلق کوئی غلط فہمی تھی تو ہم اُسے دُور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اگر سندھ کی طرف سے یہ قدم ہماری غیرت کا امتحان لینے کی نیت سے اُٹھایا گیا ہے تو ہم والیٔ سندھ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ہندوستان کے اچھوت نہیں جن کی فریاد اُن کے گلے سے باہر نہیں آ سکتی۔ آج تک ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی جرأت کسی نے نہیں کی، اور سندھ کی سلطنت کو میں ایسی سلطنت نہیں سمجھتا جو ایران کی زرہیں اور روما کے خود کاٹنے والی شمشیروں کی ضرب برداشت کر سکے۔ وہ قوم جو روئے زمین کے ہر مظلوم کی دادرسی اپنا فرض سمجھتی ہے اپنی بہو بیٹیوں کی بے عزتی پر خاموش نہیں بیٹھے گی۔"

راجہ نے وزیر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "سنو! ایک قیدی ہمارے

خلاف اعلانِ جنگ کر رہا ہے"۔

وزیر نے جواب دیا "مہاراج! یہ عرب بہت باتونی لوگ ہیں۔ ایران اور روم کی فتوحات نے انہیں مغرور بنا دیا ہے۔ لیکن انہیں سندھ کے شیروں سے واسطہ نہیں پڑا"۔

زبیر نے جواب دیا "ہم نے دیبل میں شیروں کی شجاعت نہیں دیکھی۔ لومڑیوں کی مکاری دیکھی ہے"۔

زبیر کے ان الفاظ کے بعد تمام درباری ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اُدھے سنگھ موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے اُٹھا اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا "مہاراج چند دن قید میں رہ کر یہ نوجوان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ اور پھر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس سپاہی کی تلوار کند ہو اُس کی زبان بہت تیز ہوتی ہے"۔

زبیر غصے کی حالت میں اُدھے سنگھ کی دوستانہ مداخلت کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اور بولا "مجھ پر پیچھے سے وار کیا گیا ہے۔ ورنہ میری تلوار کے متعلق تمہاری یہ رائے نہ ہوتی"۔

پرتاب رائے نے اُٹھ کر کہا "مہاراج! یہ جھوٹ کہتا ہے۔ ہم نے اسے لڑ کر گرفتار کیا تھا"۔

زبیر نے غصے اور حقارت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "بزدل آدمی! تم انسانیت کا ذلیل ترین نمونہ ہو۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تمہارے چہرے پر خوف و ہراس کے آثار ظاہر ہیں"۔

لومڑی شیر کو پنجرے میں دیکھ کر بھی بدحواس ہے۔ میرا صرف ایک ہاتھ کھول دو اور مجھے میری تلوار دے دو۔ پھر ان سب کو میرے اور تمہارے دعوے کی صداقت معلوم ہو جائے گی۔"

پرتاب رائے پھٹی پھٹی نگاہوں سے حاضرینِ دربار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برہمن آباد کا گورنر زبیر کی آمد کو تائیدِ غیبی سمجھ رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر دربار کا سکوت توڑا اور کہا۔ "مہاراج! یہ کھشتری دھرم کی توہین ہے کہ ایک معمولی عرب بھرے دربار میں سردار پرتاب رائے کو بزدلی کا طعنہ دے۔ آپ سردار پرتاب رائے کو اجازت دیں کہ وہ اس کا دعویٰ جھوٹ ثابت کر دکھائیں۔"

اودھے سنگھ کو پرتاب رائے سے کم نفرت نہ تھی۔ لیکن وہ جے رام کو راجہ کے عتاب سے بچانا زیادہ ضروری خیال کرتا تھا۔ اور اُسے بچانے کی اُس کے ذہن میں یہی صورت تھی کہ جے رام زبیر کا مقابلہ کر کے راجہ کے یہ شکوک رفع کر دے کہ وہ عربوں کا دوست ہے۔ اُس نے اُٹھ کر کہا۔ "مہاراج! برہمن آباد کے گورنر کا خیال درست نہیں۔ سردار پرتاب رائے کا رُتبہ ایسا نہیں کہ وہ ایک معمولی عرب سے مقابلہ کرے۔ یہ اُن کی توہین ہے۔ اس نوجوان کی خواہش پوری کرنے کے لئے ہمارے پاس ہزاروں نوجوان موجود ہیں۔ اگر مہاراج کو ناگوار نہ ہو تو آپ جے رام کو یہ ثابت کرنے کا موقع دیں کہ وہ ملیچھ عربوں کا دوست نہیں۔"

راجہ نے جواب دیا۔ "تم کئی بار جے رام کی سفارش کر چکے ہو لیکن اُس کی باتیں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ وہ عربوں سے بہت زیادہ مرعوب ہے۔

کیوں جے رام، تم اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لئے تیار ہو؟"

جے رام نے ملتجیانہ انداز میں کہا "مہاراج! میں آپ کے اشارے پر آگ میں کود سکتا ہوں۔ لیکن زبیر میرا مہمان ہے۔ اور میں اس پر تلوار نہیں اُٹھا سکتا۔"

دربار میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ اودھے سنگھ نے دل برداشتہ ہو کر جے رام کی طرف دیکھا۔ راجہ نے چلّا کر کہا "اس گدھے کو میرے سامنے سے لے جاؤ۔ اس کا مُنہ کالا کر کے اِسے پنجرے میں بند کر کے شہر کی گلیوں میں پھراؤ۔ کل اسے مست ہاتھی کے سامنے ڈالا جائے گا۔ اُودھے سنگھ! تم نے اس عرب کے سامنے ہمیں شرمسار کیا۔ اور پرتاب رائے تم چُپ کیوں بیٹھے ہو۔ تم دیبل میں اسے نیچا دکھا چکے ہو۔ اب تمہاری تلوار نیام سے باہر کیوں نہیں آتی؟ تم سب کو سانپ کیوں سُونگھ گیا؟"

نوجوان بھیم سنگھ نے اُٹھ کر تلوار بے نیام کی اور کہا "مہاراج! مجھے اجازت دیجئے۔"

بھیم سنگھ کی دیکھا دیکھی تمام درباریوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ سب سے آخر میں پرتاب رائے نے تلوار نکالی۔ لیکن اُس کی نگاہیں راجہ سے کہہ رہی تھیں "ان داتا! میرے حال پر رحم کرو۔" درباریوں کو راجہ کے اشارے کا منتظر دیکھ کر زبیر نے اپنے ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "بس اب جانے دیجئے۔ مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ اپنے حریف کو پابہ زنجیر دیکھ کر آپ کے درباری بُزدل کہلانا پسند نہیں کرتے لیکن

قدرت لومڑیوں کے سامنے شیروں کو ہمیشہ باندھ کر پیش نہیں کرتی۔"

بھیم سنگھ نے کہا "مہاراج! اس کی بیڑیاں کھلوا دیجئے۔ میں اسے ابھی بتا دوں گا کہ شیر کون ہے اور لومڑی کون؟"

(۴)

راجہ کے اشارے سے سپاہیوں نے زبیر کی بیڑیاں اُتار دیں، اور اُس کے ہاتھ میں ایک تلوار دی گئی۔ لیکن وزیر نے کہا "مہاراج! آپ کے دربار میں مقابلہ ٹھیک نہیں۔"

راجہ نے جواب دیا "ٹھیک کیوں نہیں، اسی دربار میں ہمارے سپاہیوں کو بزدلی کا طعنہ دیا گیا ہے۔ اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہیں اس کا انتقام لیا جائے۔"

"مہاراج! انتقام اس نوجوان کو لڑنے کا موقع دیئے بغیر بھی لیا جا سکتا ہے۔"

راجہ نے جواب دیا "نہیں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ عرب تلوار کس طرح چلاتے ہیں؟"

بھیم سنگھ کرسیوں کے درمیان کھلی جگہ میں آ کھڑا ہوا اور اُس نے تلوار کے اشارے سے زبیر کو سامنے آنے کی دعوت دی۔

زبیر نے راجہ کی طرف دیکھا اور کہا "اس نوجوان کے ساتھ مجھے کوئی دشمنی نہیں۔ میرا مجرم پرتاب رائے ہے۔ آپ اسے قربانی کا بکرا کیوں بناتے ہیں؟"

بھیم سنگھ نے کہا: "بُزدل! تم صرف باتیں کرنا جانتے ہو۔ اگر ہمت ہے تو آؤ۔"

"اگر تم دوسرے کا بوجھ اٹھانے پر بضد ہو تو تمہاری مرضی!" یہ کہتے ہوئے زبیر آگے بڑھ کر بھیم سنگھ کے سامنے آکھڑا ہوا۔ راجہ کے حکم سے سپاہی تخت اور کرسیوں کے آگے نصف دائرے میں کھڑے ہو گئے۔ اودے سنگھ نے اُٹھ کر کہا: "بیٹا! اوچھا وار نہ کرنا۔ تم ایک خطرناک دشمن کے سامنے کھڑے ہو۔"

"پتا جی! آپ فکر نہ کریں۔" یہ کہتے ہوئے بھیم سنگھ نے یکے بعد دیگرے تین چار وار کر دیئے۔ زبیر اس حملے کی غیر متوقع شدت سے دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا اور اہلِ دربار نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ زبیر کچھ دیر بھیم سنگھ کے وار روکنے پر اکتفا کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد تماشائی یہ محسوس کرنے لگے کہ حملہ کرنے والے ہاتھ سے روکنے والا ہاتھ کہیں زیادہ پھرتیلا ہے۔ اودے سنگھ پھر چلایا: "بیٹا جوش میں نہ آؤ۔ تلوار کا ٹھنڈا کھلاڑی ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔" لیکن زبیر کے چہرے کی پُرسکون مسکراہٹ نے بھیم سنگھ کو اور زیادہ سیخ پا کر دیا۔ اور وہ اندھا دُھند وار کرنے لگا۔ اُسے آپے سے باہر ہوتا دیکھ کر زبیر نے یکے بعد دیگرے چند وار کئے اور بھیم سنگھ کو جارحانہ حملوں سے مدافعت پر مجبور کر دیا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ بھیم سنگھ کی تلوار بروقت مدافعت کے لئے نہ اُٹھ سکی۔ لیکن زبیر کی تلوار اُسے گھائل کرنے کی بجائے اس کے جسم کے کسی حصے کو چھونے کے بعد واپس چلی گئی۔ درباری اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ جان بُوجھ کر بھیم سنگھ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

بھیم سنگھ کو خود بھی اُس کی برتری کا احساس ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اعتراف شکست پر موت کو ترجیح دینے کے لئے تیار تھا۔ پرتاپ رائے بھیم سنگھ کے باپ سے پرانی رنجشوں کے باوجود انتہائی خلوص سے بھیم سنگھ کی فتح کی دعائیں کر رہا تھا۔ لیکن بھیم سنگھ کے بازو ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ اور راجہ اور اہلِ دربار کے چہروں پر مایوسی چھا رہی تھی۔

اُودھے سنگھ نے کہا۔ "مہاراج بھیم سنگھ اپنی جان دے دے گا لیکن پیچھے نہیں ہٹے گا۔ آپ اُس کی جان بچا سکتے ہیں"

بڑی رانی نے اودھے سنگھ کی سفارش کی لیکن چھوٹی رانی نے کہا۔ "مہاراج سپاہیوں کو بھیم سنگھ کی مدد کا حکم دینا انصاف نہیں۔ اپنے بیٹے کے لئے اودھے سنگھ کے خون نے جوش مارا ہے۔ لیکن جب وہ پردیسی دو قدم پیچھے ہٹا تھا اُس پر کسی کو رحم نہ آیا۔ اگر آپ بچانا چاہتے ہیں تو دونوں کی جان بچایئے"۔

راجہ تذبذب کی حالت میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اچانک زبیر پے در پے چند سخت وار کرنے کے بعد بھیم سنگھ کو چاروں اطراف سے دھکیل کر اُس کی خالی کرسی کے سامنے لے آیا۔ سپاہی جو ننگی تلواریں لئے قطار میں کھڑے ہوئے تھے اِدھر اُدھر سمٹ گئے۔ بھیم سنگھ لڑکھڑاتا ہوا پیٹھ کے بل کرسی میں گر پڑا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن زبیر نے اس کے سینے پر تلوار کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔ "تم اگر چند سال اَور زندہ رہو تو ایک اچھے خاصے سپاہی بن سکتے ہو۔ لیکن سرِدست تمہاری جگہ یہ کرسی ہے"۔

بھیم سنگھ کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور وہ غصے اور ندامت کی

حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

راجہ نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن اُن کی تلواریں بلند ہونے سے پہلے زبیر بھیم سنگھ کی کرسی سے اُوپر کُود کر پرتاب رائے کے پیچھے جا کھڑا ہُوا اور بیشتر اس کے کہ پرتاب رائے اپنی بدحواسی پر قابو پاتا۔ زبیر نے اپنی تلوار کی نوک اُس کی پیٹھ پر رکھتے ہوئے راجہ سے کہا:" اپنے سپاہیوں کو وہیں کھڑا رہنے کا حکم دیجیے ورنہ میری تلوار اس موذی کے سینے کے پار ہو جائیگی"

راجہ کے اشارے سے سپاہی پیچھے ہٹ گئے تو زبیر نے پھر راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" بیوقوفوں کے بادشاہ! مجھے تم سے نیک سلوک کی توقع نہیں لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ جن صلاح کاروں نے تمہیں عرب کے ساتھ لڑائی مُول لینے کا مشورہ دیا ہے، وہ تمہارے دوست نہیں۔ جن لوگوں پر تمہیں بھروسہ ہے وہ سب دیبل کے گورنر کا دِل اور دماغ رکھتے ہیں۔ اس کی طرف دیکھو۔ یہ وہ بہادر ہے جو کُرسی پر بیٹھا ہُوا بید مجنوں کی طرح کانپ رہا ہے۔ اب مَیں تمہارے سامنے اس شخص سے چند سوالات کرتا ہوں "کیوں پرتاب رائے! تم نے مجھے لڑ کر گرفتار کیا تھا یا دوستی کا فریب دے کر جہاز پر سے بُلایا تھا؟" جواب دو۔ خاموش کیوں ہو۔ اگر تم نے جھُوٹ بولا تو یاد رکھو، ان سپاہیوں کی حفاظت سے تم نہیں بچ سکتے۔ بولو" یہ کہتے ہوئے زبیر نے تلوار کو آہستہ سے جنبش دی اور اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:" مَیں نے تمہیں جہاز پر سے بلایا تھا۔ لیکن مہاراج کا یہی حکم تھا کہ تمہیں ہر قیمت پر گرفتار کیا جائے"۔

راجہ نے کہا:" ٹھہرو! پرتاب رائے نے ہمارے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اگر

تم نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو قیدیوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے گا جسے تم تصوّر میں بھی برداشت نہ کر سکو۔ ابھی ہم نے تمہارے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ہم خواہ مخواہ عرب کے ساتھ بگاڑنا نہیں چاہتے۔ تمہاری قوم اچھی بہادر ہے۔ لیکن اگر تم ذرا سمجھ سے کام لو تو ممکن ہے کہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو آزاد کر دیں۔ تمہارے سر پر اس وقت بیس سپاہی کھڑے ہیں۔ تم زیادہ سے زیادہ ایک کو مار سکو گے۔ لیکن اُس ایک آدمی کے بدلے ہم تمام قیدیوں کو پھانسی دے دیں گے۔ اگر اپنے ساتھیوں کی خیر چاہتے ہو تو تلوار پھینک دو۔“

زبیر نے کہا۔ ”مجھے تم میں سے کسی پر اعتبار نہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنا نفع اور نقصان سوچنے کا آخری موقع دیتا ہوں۔ یاد رکھو اگر تم نے میرے ساتھیوں کے ساتھ بدسلوکی کی تو وہ دن دُور نہیں جب تمہارے شہر پناہ کے سر پر ہیر سے جیسے سر پھروں کی تلواریں چمک رہی ہونگی۔ تمہیں اگر جواہرات اور ہاتھیوں کا لالچ ہے تو میں اُن کا مطالبہ نہیں کرتا۔ میں صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو رہا کر دو اور خالد اور اُس کی بہن ہمارے حوالے کر دو۔“

راجہ نے جواب دیا۔ ”جب تک تم تلوار نہیں پھینکتے، ہم تمہاری کسی درخواست پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں۔“

زبیر کو راجہ کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ اگر اُسے اپنے ساتھیوں کا خیال نہ آتا تو وہ یقیناً اپنے آپ کو راجہ کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے

ایک بہادرانہ موت کو ترجیح دیتا۔ لیکن بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے عبرتناک انجام کے تصور نے اُس کا جوش ٹھنڈا کر دیا۔ اُسے ناہید کا خیال آیا اور اُس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ مختلف خیالات کے گرداب میں راجہ کے حوصلہ افزا کلمات اُس کے لئے تنکوں کا سہارا ثابت ہوئے اور اُس نے اپنی تلوار تخت کے سامنے پھینک دی۔ راجہ نے اطمینان کا سانس لیا، پرتاب رائے کی حالت اُس شخص سے مختلف نہ تھی، جو بھیانک سپنا دیکھنے کے بعد نیند سے بیدار ہُوا ہو۔ بڑی رانی نے راجہ کے دائیں کان میں کچھ کہا اور چھوٹی رانی نے ایک عورت کی ذکاوتِ حِس سے اپنی سوکن کے مافی الضّمیر کا اندازہ کر کے راجہ کا بایاں کان اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔ "مہاراج! ایسے لوگوں سے دشمنی مُول لینا ٹھیک نہیں۔"

راجہ نے اشارے سے وزیر کو اپنے پاس بُلایا اور آہستہ سے پُوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "مہاراج مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔"

راجہ نے کہا۔ "اگر مَیں اسے چھوڑ دوں تو یہ سردار اور میری رعایا مجھے بُزدل خیال کریں گے۔"

"مہاراج! چاند پر تھُوکنے سے اپنے مُنہ پر چھینٹے پڑتے ہیں۔ آپ اپنی رعایا کی نظر میں ایک دیوتا ہیں۔ لیکن اب اِن قیدیوں کو چھوڑنا مصلحت کے خلاف ہے۔ عربوں کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ سندھ پر حملہ کریں۔ لیکن اِن لوگوں کو اگر ان کے مُلک واپس بھیج دیا گیا، تو یہ تمام عرب میں ہمارے

خلاف آگ کا طوفان کھڑا کردیں گے۔ اگر آپ عربوں کے ساتھ جنگ کرکے مکران کا علاقہ حاصل کرنے کا ارادہ بدل چکے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ ان سب کو آزاد کرنے کی بجائے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے تاکہ عربوں کے پاس اِس بات کا کوئی ثبوت نہ ہو کہ ہم نے دیبل سے اُن کے جہاز لوٹے ہیں۔ اس سے پہلے ہم ابوالحسن کے معاملے میں مکران کے گورنر کو ٹال چکے ہیں۔ اب بھی اگر کوئی اُن کا پتہ پوچھنے آیا تو اس کی تسلی کردی جائے گی۔"

راجہ نے کہا۔" تمہیں کس نے بتایا کہ ہم مکران کو فتح کرنے کا ارادہ بدل چکے ہیں ؟"

وزیر نے جواب دیا۔" مہاراج! اگر آپ کا ارادہ نہیں بدلا تو پھر ان لوگوں کے متعلق سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں اس کی کم سے کم سزا یہ ہو سکتی ہے کہ اِسے شہر کے چوراہے میں پھانسی دی جائے تاکہ ہمارے لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ عرب عام انسانوں سے مختلف نہیں۔"

راجہ نے کہا۔" میرا بھی یہی خیال ہے لیکن جہاز پر سے ایک عرب لڑکا اور لڑکی غائب ہو چکے ہیں۔ اگر انہوں نے سندھ کی حدود پار کرکے مکران میں عربوں کو یہ خبر پہنچا دی تو ممکن ہے کہ ہمیں بہت جلد لڑائی کی تیاری کرنی پڑے۔"

وزیر نے جواب دیا۔" مہاراج! عرب کی موجودہ حالت مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ اُن کی خانہ جنگی کو ختم ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اور اب اُن کی تمام افواج شمال اور مغرب کے ممالک میں لڑ رہی ہیں۔ ہمارے پاس ایک لاکھ فوج موجود ہے اور ہم ضرورت کے وقت اِسی قدر اور سپاہی جمع کر سکتے ہیں۔

پھر راجپوتانے کے تمام راجہ آپ کے باجگزار ہیں۔ وہ آپ کے جھنڈے تلے عربوں سے لڑنا اپنی عزت سمجھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جو عرب سندھ میں آئے گا واپس نہیں جائے گا۔"

"شاباش! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ تم آج ہی سے تیاری شروع کر دو۔"

راجہ سے کانا پھوسی ختم کرنے کے بعد وزیر اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ راجہ نے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اسے لے جاؤ۔ آج شام تک ہم اس کا فیصلہ کر دیں گے۔"

آخری اُمید

(۱)

رات کے وقت سونے سے پہلے واسو نے کئی بار نرائن داس سے جے رام کے واپس نہ آنے کی وجہ پوچھی۔ لیکن اُس نے ہر بار یہی جواب دیا۔ کہ شہر میں اُس کے کئی دوست ہیں۔ کسی نے اُسے اپنے پاس ٹھہرا لیا ہوگا۔ واسو کو جے رام کی ہدایت تھی کہ وہ اُس کے واپس آنے تک نرائن کے گھر سے باہر نہ نکلے۔ اگلے دن بھی اُس نے طوعاً و کرہاً جے رام کی اس ہدایت پر عمل کیا۔ شام سے کچھ پہلے نرائن داس نے آکر یہ خبر دی کہ جے رام کو ایک عرب کے ساتھ پنجرے میں بند کر کے شہر میں پھرایا جا رہا ہے اور صبح سورج نکلنے سے پہلے ان دونوں کو شہر کے چوراہے میں پھانسی دے دی جائے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ اُس نے عین دربار میں راجہ کے سامنے گستاخی کی ہے ؛

واسو نے یہ سنتے ہی شہر کا رُخ کیا۔ لوگ شہر کے ایک پُر رونق چوراہے میں ایک بانس کے پنجرے کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ واسو اپنے مضبوط بازوؤں سے لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا پنجرے کے قریب پہنچا۔ اور پنجرے

کے اندر زبیر اور جے رام کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اُلٹے پاؤں لوٹ آیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل کا رُخ کیا۔

آدھی رات تک چند پہرہ داروں کے سوا تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جے رام، زبیر کو جنگل میں خالد اور مایا سے ملاقات کا واقعہ سنا چکا تھا۔ چند پہرے دار سو چکے تھے اور باقی پنجرے کے قریب بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ زبیر نے موقع پا کر کہا: "وہ رومال کہاں ہے؟"

جے رام نے جواب دیا: "وہ میری کلائی کے ساتھ بندھا ہُوا ہے، لیکن ہم دونوں کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے ہیں۔ کاش وآسو کو ہماری خبر ہو جاتی۔ زبیر! زبیر! میں ایک بات پُوچھتا ہوں۔"

"پُوچھو۔"

"ہمیں سُورج نکلنے سے پہلے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ تمہیں اس وقت سب سے زیادہ کس بات کا خیال آ رہا ہے؟"

"میرے دل میں صرف ایک خیال ہے، اور وُہ یہ کہ میں اب تک خدا اور رسُولؐ کو خوش کرنے کے لئے دُنیا میں کوئی مفید کام نہیں کر سکا۔"

"تمہیں مرنے کا خوف تو ضرور ہوگا؟"

"ایک مسلمان کے ایمان کی پہلی شرط یہ ہے کہ وُہ موت سے نہ ڈرے اور ڈرنے سے فائدہ ہی کیا۔ انسان خواہ کچھ کرے۔ جو رات قبر میں آنی ہو۔ قبر ہی میں آئے گی۔ اگر میری زندگی کے دن پُورے ہو چکے ہیں، تو میں آنسو بہا کر اُنہیں زیادہ نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے ایک افسوس ہے کہ

ایسی موت ایک سپاہی کی شان کے شایاں نہیں۔"

جے رام نے کہا " مجھے ابھی تک یہ خیال آرہا ہے کہ شاید ہم اس سزا سے بچ جائیں۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ شاید ابھی بھونچال کے جھٹکے سے یہ شہر مٹی کا ایک ڈھیر بن جائے۔ کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ شاید کوئی بھگوان کا اوتار آسمان سے اُتر کر راجہ سے کہے کہ اِن بے گناہوں کو چھوڑ دو ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ کبھی مجھے یہ اُمید سہارا دیتی ہے کہ شاید دریائے سندھ اپنا راستہ چھوڑ کر دیبل کا رُخ کرلے، لوگ بدحواس ہو کر شہر سے بھاگ نکلیں اور جاتے جاتے ہمیں آزاد کر جائیں۔"

" تمہیں اِس قسم کا کوئی خیال نہیں آتا؟"

" نہیں مجھے ایسے خیالات پریشان نہیں کرتے۔ میں صرف اِتنا جانتا ہوں کہ اگر خدا کو میرا زندہ رکھنا منظور ہے تو وہ ہزار طریقے سے میری جان بچا سکتا ہے، اور اگر میری زندگی کے دِن پورے ہو چکے ہیں تو میری کوئی تدبیر مجھے موت کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتی۔"

جے رام نے کہا۔" زبیر! کاش میں تمہاری طرح سوچ سکتا لیکن میں جوان ہوں اور ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تم بھی جوان ہو لیکن تمہارا سوچنے کا ڈھنگ مجھ سے مختلف ہے۔"

زبیر نے کہا:" تم بھی اگر میری طرح سوچنے کی کوشش کرو۔ تو ایک تسکین محسوس کرو گے"۔

جے رام نے جواب دیا۔" یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

زبیر نے کہا۔ "جے رام! میری ایک بات مانو گے؟"

"وہ کیا؟"

"صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ میری اور تمہاری زندگی کے شاید تھوڑے سانس باقی ہیں۔ میرے دل پر صرف ایک بوجھ ہے۔ اور اگر تم چاہو تو میں موت سے پہلے اس بوجھ کو اپنے دل سے اُتار سکتا ہوں۔"

جے رام نے کہا۔ "میں اس پنجرے میں تمہارے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں اُس کے لئے تیار ہوں۔"

"جے رام! ہم نے زندگی کی چند منازل ایک دوسرے کے ساتھ طے کی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد ہمارے راستے مختلف ہوں میں چاہتا ہوں کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ اگر تم اس وقت بھی کلمۂ توحید پڑھ لو تو میری گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی ہو جائے گی۔ اب اتنا وقت نہیں کہ میں تمہیں اسلام کی تمام خوبیوں سے آگاہ کر سکوں۔ کاش! میں جہاز پر اس ذمہ داری کو محسوس کرتا۔ لیکن اگر تم میری باتوں پر توجہ دو تو مجھے یقین ہے کہ تم جیسے نیک دل اور صداقت پرست آدمی کو صحیح راہ دکھانے کے لئے ایک لمبے عرصے کی ضرورت نہیں۔"

جے رام نے کہا۔ "اگر تمہاری باتیں مجھے موت کے خوف سے نجات دلا سکتی ہیں تو میں سُننے کے لئے تیار ہوں۔"

زبیر نے کہا۔ "اسلام انسان کے دل میں صرف ایک خدا کا خوف پیدا کرتا ہے، اور اُسے ہر خوف سے نجات دلاتا ہے۔ سنو" یہ کہہ کر زبیر نے

نہایت مختصر طور پر اسلام کی تعلیم پر روشنی ڈالی۔ رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے حالات بیان کیئے۔ صحابۂ کرام کی سیرت پر روشنی ڈالنے کے لئے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے اہم ترین واقعات بیان کیئے۔ اختتام پر زبیر اجنادین، یرموک اور قادسیہ کی جنگوں کے واقعات بیان کر رہا تھا اور جے رام یہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ وُہ ساری عمر تاریک غار میں بھٹکنے کے بعد ایک ہی جست میں روئے زمین کے بلند ترین پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ چکا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں اُمید کی روشنی جھلک رہی تھی۔

رات کے تیسرے پہر جے رام برسوں کے اعتقادات کو چھوڑ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔

زبیر نے پُوچھا: "اب بتاؤ تمہارے دِل کا بوجھ ہلکا ہؤا ہے یا نہیں؟"

جے رام نے کہا: "میرے دِل میں صرف ایک اضطراب باقی ہے اور وُہ یہ کہ مَیں نے مَوت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اسلام قبول کیا ہے۔ کاش! مَیں چند دن اَور زندہ رہ کر تمہاری طرح نمازیں پڑھتا اور روزے رکھتا!"

زبیر نے جواب دیا: "مسلمان کو خدا سے مایوس نہیں ہونا چاہئے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

(۲)

پہرے دار نے کسی کو پنجرے کے قریب آتے ہوئے دیکھ کر آواز دی "کون ہے؟"

ایک آدمی جواب دیئے بغیر پنجرے کے قریب پہنچ کر رُکا۔ چند اَور سپاہی

اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے سپاہی نے پھر کہا۔ "جواب نہیں دیتے تم کون ہو؟" لیکن اتنی دیر میں چند سپاہی اسے پہچان چکے تھے۔ اور ایک نے اپنے ساتھی کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "گنواروں کی طرح آوازیں دے رہے ہو۔ انہیں پہچانتے نہیں۔ یہ سردار بھیم سنگھ ہیں۔ مہاراج آپ اس وقت کیسے؟"

"میں قیدیوں کو دیکھنے کے لئے آیا تھا۔"

دوسرے سپاہی نے کہا۔ "مہاراج! آپ بے فکر رہیں۔ یہ چند آدمی ابھی سوئے ہیں۔"

بھیم سنگھ نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "مہاراج! میرا نام سروپ سنگھ ہے۔"

"تم بہت ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں برہمن آباد کے حاکم سے سفارش کروں گا کہ تمہیں ترقی دی جائے۔"

"بھگوان سرکار کا بھلا کرے۔ میرے چار بچے ہیں۔ آپ کے ہونٹ ہلیں گے اور میرا کام بن جائے گا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ ہاں قیدی سو رہے ہیں؟"

"مہاراج! ابھی باتیں کر رہے تھے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر پنجرے سے جھانک کر دیکھا اور بولا۔ "مہاراج یہ جاگ رہے ہیں۔"

"میں جے رام سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"مہاراج آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر سپاہی نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ پنجرے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے

بھیم سنگھ نے پنجرے میں جھانکتے ہوئے بلند آواز میں کہا "جے رام! تم بہت بیوقوف ہو" اور پھر اپنا ہاتھ پنجرے میں ڈال کر زبیر کا بازو ٹٹولتے ہوئے آہستہ سے کہا "تم اپنے ہاتھ میری طرف کرو" زبیر نے اپنی پیٹھ پھیر کر اپنے بندھے ہوئے ہاتھ اس کی طرف کر دیئے۔ بھیم سنگھ نے دوبارہ بلند آواز میں کہا "نمک حرام تمہیں راجہ کے سامنے اس ملیچھ عرب کی دوستی کا دم بھرتے ہوئے شرم نہ آئی" اور پھر آہستہ سے کہا "جے رام میں تمہارے ساتھی کے ہاتھوں کی رسیاں کاٹ رہا ہوں۔ کچھ بولو ورنہ سپاہیوں کو شک پڑ جائیگا۔"

جے رام نے چلا کر کہا "بھیم سنگھ شرم کرو۔ یہ ایک راجپوت کی شان کے شایاں نہیں کہ وہ کسی کو بے بس دیکھ کر گالیاں دے۔"

"میں تمہارے جیسے بزدل آدمی کو گالیاں دینا اپنی بے عزتی سمجھتا ہوں۔ میں صرف یہ پوچھنے کے لئے آیا ہوں کہ تم نے اس لڑکی اور لڑکے کو کہاں چھپایا ہے؟"

"مجھے اُن کا کوئی علم نہیں۔ جاؤ مجھے تنگ نہ کرو۔"

زبیر کے ہاتھ آزاد ہو چکے تھے بھیم سنگھ نے اس کے ہاتھ میں خنجر دیتے ہوئے آہستہ سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لئے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارے لئے یہ پنجرا توڑ کر بھاگ نکلنا ممکن نہیں لیکن پھر بھی قسمت آزمائی کر دیکھو۔ اگر تم آزاد نہ بھی ہو سکے تو کم از کم بہادروں کی موت مر سکو گے۔"

سپاہیوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لئے بھیم سنگھ نے پھر اپنا لہجہ تبدیل

کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ عرب لڑکی کو تم نے کہیں چھپا رکھا ہے اچھا تمہاری مرضی۔ نہ بتاؤ لیکن یاد رکھو سورج نکلنے سے پہلے برہمن آباد کے باشندے تمہیں پھانسی کے تختوں پر دیکھ رہے ہوں گے۔"

بھیم سنگھ نے پنجرے سے چند قدم دور جا کر سپاہیوں سے کہا "تم ایک طرف کیوں کھڑے ہو گئے ہو۔ میں نے اس سے کوئی مخفی بات نہیں کرنی تھی۔ اس جے رام کو دیکھو۔ اس کا غرور ابھی تک نہیں ٹوٹا۔"

سپاہی نے جواب دیا۔ "مہاراج! اس کی قسمت بری تھی۔ ورنہ ہم نے سنا ہے کہ راجہ اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ مہاراج! شہر کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ عرب جادوگر ہے۔ اس نے جادو کی طاقت سے جے رام کو راجہ کا نافرمان بنا دیا تھا۔"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "شاید یہی بات ہو۔ مجھے بھی اس کے پنجرے کے قریب نہیں جانا چاہیئے تھا۔"

"نہیں مہاراج! آپ پر اس کا جادو کیا اثر کرے گا۔ پھر بھی آپ گھر جا کر پرارتھنا کریں۔"

"تم بہت سمجھدار ہو۔ میں جانتا ہوں۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ شاید یہ جادو کا اثر ہے۔"

"مہاراج اگر حکم ہو تو ہم میں سے کوئی ایک آپ کو گھر چھوڑ آئے؟"

"نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔"

بھیم سنگھ چل دیا تو سپاہی نے پیچھے سے آواز دے کر کہا "مہاراج

میرا خیال رکھنا۔"

"تم فکر نہ کرو۔"

"مہاراج۔ آپ کا بھلا کرے۔"

بھیم سنگھ کے چلے جانے کے بعد ایک سپاہی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ یہ جادوگر ہے اور تم نہیں مانتے تھے سروپ سنگھ تمہاری خیر نہیں۔ تم کئی بار پنجرے کو ہاتھ لگا چکے ہو۔ اب تک تمہارا سر نہیں چکرایا۔"

"میرا سر—؟ ہاں کچھ بوجھل سا ضرور ہے۔"

"تو فکر نہ کرو ابھی چکرانے لگ جائے گا۔"

سروپ سنگھ نے فکرمند سا ہو کر کہا۔ "لیکن میں نے سنا ہے۔ کہ جادوگر کے مرجانے پر جادو کا اثر نہیں رہتا۔"

"ایسے جادوگر مر کر بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔"

ایک اور سپاہی بولا۔ "یار میں نے بھی پنجرے کو ہاتھ لگایا تھا میرا سر بھی چکرا رہا ہے۔"

سروپ سنگھ بولا۔ "بھگوان ایسے جادوگر کو غارت کرے اب میرا سر سچ مچ چکرا رہا ہے۔"

ان باتوں کا یہ اثر ہوا۔ کہ سپاہی آٹھ دس قدم ہٹ کر پہرہ دینے لگے۔ زبیر پنجرے کے اندر اپنے پاؤں کی رسیاں کاٹنے کے بعد جے رام کے ہاتھ پاؤں بھی آزاد کر چکا تھا۔ اور دونوں پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ

زور آزمائی کر رہے تھے۔

ایک سپاہی نے چلّا کر کہا۔" ارے وہ پنجرے میں کیا کر رہے ہیں؟"

زبیر اور جے رام ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور آنکھیں بند کر کے خرّاٹے لینے لگے۔ دو سپاہیوں نے پنجرے کے گرد چکّر لگایا اور مطمئن ہو کر اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔

جے رام نے آہستہ سے کہا۔" زبیر!"

اُس نے جواب دیا۔" کیا ہے؟"

" یہ سلاخیں بہت مضبوط ہیں۔ قدرت نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے۔ کیا تمہیں اب بھی چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی امید ہے؟"

" میرا دل گواہی دیتا ہے۔ کہ خدا ہماری مدد کرے گا۔"

جے رام نے کہا۔" برہمن آباد میں سینکڑوں سپاہیوں پر بھیم سنگھ کا اثر ہے۔ شاید وہ آخری وقت پر ہماری مدد کرے۔"

" میں صرف خدا سے مدد مانگتا ہوں اور تمہیں بھی اسی کا سہارا لینا چاہیئے۔ اگر اسے ہمارا زندہ رکھنا منظور ہے تو ہم بھیم سنگھ کی مدد کے بغیر بھی رہا ہو جائیں گے۔"

" میں تمہارے ایمان کی پختگی کی داد دیتا ہوں لیکن بُرا نہ ماننا۔ یہ سلاخیں خود بخود ٹوٹنے والی نہیں۔"

زبیر نے کہا۔" جے رام! جہاں عقل کے چراغ گل ہو جاتے ہیں وہاں ایمان کی مشعل کام دیتی ہے تم ایک ایسے خدا پر ایمان لا چکے ہو جس نے

ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کو گلزار بنا دیا تھا۔"

جے رام کچھ کہنے والا تھا کہ باہر سے ایک سپاہی چلایا۔ "کون ہے؟"

ایک شخص نے چند قدم کے فاصلے سے جواب دیا۔ "جی میں ماہی گیر ہوں۔"

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"جی میں مچھلیاں لایا ہوں۔"

"مچھلیاں اس وقت؟"

"جی اب دن نکلنے والا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ انہیں بیچ کر جلدی واپس چلا جاؤں۔ آپ کو کوئی مچھلی چاہیئے؟"

ایک سپاہی نے کہا۔ "سروپ سنگھ! لے لو تمہارے چار بچے ہیں۔"

مچھیرے نے کہا۔ "ہاں سرکار لے لو۔ بالکل تازہ ہیں۔"

سروپ سنگھ نے جواب دیا۔ "ہم اس وقت پیسے باندھ کر تھوڑا بیٹھے ہیں۔ مفت دینی ہے تو دے جاؤ۔"

"جی شہر کے عام لوگ بھی ہم سے مفت چھین لیتے ہیں۔ آپ تو سپاہی ہیں۔ آپ سے پیسے کون مانگ سکتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے ماہی گیر نے مچھلیوں کی ٹوکری سپاہیوں کے آگے رکھ دی

ایک سپاہی نے کہا۔ "ارے تمہارے پاس تو کافی مچھلیاں ہیں۔ ہمیں بھی دو گے یا نہیں؟"

سروپ سنگھ نے کہا۔ "نہیں نہیں اس بیچارے پر ظلم نہ کرو۔ میں تو اس کا روز کا گاہک ہوں۔ میں مفت تھوڑا لے رہا ہوں۔ کل پیسے ادا کر دوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے سروپ نے ایک مچھلی اٹھالی اور شرارت آمیز تبسم کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا اور انہوں نے ہنستے ہوئے آن کی آن میں تمام ٹوکری خالی کر دی ؛

سروپ نے کہا۔ "لو بھئی تمہارا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب کل اسی جگہ اور اسی وقت پیسے لے لینا۔"

"بہت اچھا سرکار ——— !"

پنجرے کے اندر زبیر جے رام سے کہہ رہا تھا۔ "یہ گنگو ہے لیکن یہ اکیلا کیوں آیا ؟"

گنگو نے سپاہیوں سے کہا۔ "مجھے الگوجا بجانا آتا ہے۔ آپکو سناؤں ؟"

سپاہیوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔ "ہاں ہاں سناؤ۔"

گنگو نے الگوجے سے چند دلکش تانیں نکالیں اور اس کے ساتھی عام شہریوں کے لباس میں مختلف گلیوں سے نکل کر سپاہیوں کے گرد جمع ہونے لگے۔ ایک سپاہی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "ارے اس نے تو خواہ مخواہ مچھیرے کا ذلیل پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ تو الگوجا بجا کر کافی پیسے کما سکتا ہے"

گنگو کے ساتھی ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے "مجھے اس کی تانوں نے گہری نیند سے بیدار کیا اور پھر میرا سونے کو جی نہ چاہا" ——— "مجھے وسنتی کی ماں کہتی تھی کہ جاؤ دیکھو کوئی فقیر ہو گا" ——— "ارے میرے محلے کے تمام لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے ؟" گنگو الگوجا بجاتے بجاتے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اُس کے ساتھی اچانک تلواریں سونت کر سپاہیوں پر پل پڑے اور آن کی

آن میں اُن کا صفایا کر دیا۔ واسُو نے کلہاڑے کی چند ضربوں سے پنجرے کا دروازہ توڑ دیا۔ اور جے رام اور زبیر لپک کر باہر نکل آئے۔

چوک کے آس پاس کی آبادی نے الگوجے کی دلکش تانوں کے بعد حملہ آوروں اور سپاہیوں کی غیر متوقع چیخ و پکار سُنی لیکن اپنے گھروں کے دروازے کھول کر باہر جھانکنا خلل در معقولات خیال کیا۔ زبیر اور جے رام گنگو اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ بھاگتے ہوئے شہر سے باہر نکلے گنگو کے چند ساتھی ایک باغ میں گھوڑے لئے کھڑے تھے۔

جس وقت شہر میں اس ہنگامے کا ردِ عمل شروع ہو رہا تھا۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگل کا رُخ کر رہے تھے۔

(۳)

ناہید اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور مایا اس کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ اس کا سر دبا رہی تھی۔ خالد بے قراری کے ساتھ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا بستر کے قریب کھڑا ہو کر بولا "ناہید بہت دیر ہو گئی۔ انہیں اس وقت تک پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ کاش ہمیں یہاں ٹھہرنے پر مجبور نہ ہوتا"۔

مایا نے خالد کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا کر تسلی آمیز لہجے میں بولی۔ "مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ راجہ داہر اس قدر ظالم ہو سکتا ہے ممکن ہے کہ واسو ــــــــ"

خالد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تمہاری نیک خواہشات ایک بھیڑیئے کو انسان نہیں بنا سکتیں"۔

مایا نے جھجکتے ہوئے کہا۔"آپ فکر نہ کریں۔ وہ آجائیں گے۔"

"زبیر پھانسی پر لٹک رہا ہو اور مجھے فکر نہ ہو۔ کاش میں گنگو کے ساتھ ہوتا"

یہ کہتے ہوئے خالد نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور ہونٹ کاٹتا ہوا باہر نکل گیا

مایا ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ناہید کی طرف دیکھنے لگی اور وہ اس کے سر پر

ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے بولی۔"مایا۔ اس نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا۔

تم ذرا ذرا سی بات پر رو پڑتی ہو۔"

مایا نے جواب دیا۔"آج اُن کے تیور دیکھ کر مجھے ڈر لگتا ہے۔

اگر وہ ناکام آئے تو کیا ہوگا؟

ناہید نے کہا۔"وہ ایک خطرناک مہم پر گئے ہیں اور ان کی کامیابی

اور ناکامی میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔"

"اگر گنگو اور اسکے ساتھی بھی لڑائی میں مارے گئے تو آپ اپنے

وطن چلے جائیں گے اور میں . . . . ؟"

ناہید نے جواب دیا۔"میری ننھی بہن! تم اپنے لئے عرب کی زمین

تنگ نہ پاؤ گی۔"

"لیکن خالد آج بات بات پر مجھ سے بگڑتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ

مجھے یہیں چھوڑ جائیں۔"

"مایا میرے سامنے خالد نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ ہاں تمہارے

بھائی اور زبیر کے متعلق یہ المناک خبر سننے کے بعد وہ کچھ بے قرار سا ہے

خدا کرے وہ زندہ بچ کر آجائیں اور پھر تم خالد کے چہرے پر تمام عمر مسکراہٹیں

دیکھا کرو گی۔"

خالد کی مسکراہٹوں کا ذکر مایا کو تھوڑی دیر کے لئے تصوّرات کی حسین دنیا میں لے گیا۔ اُسے یہ اُجڑی ہوئی دنیا مہکتے ہوئے پھولوں کی ایک کیاری دکھائی دینے لگی۔ وہ پھولوں سے کھیل رہی تھی۔ مہکتی ہوئی ہوا کے جھونکوں سے سرشار ہو رہی تھی۔ چڑیوں کے چہچہے سُن رہی تھی۔ وہ ایک عورت تھی جسے محبّت تنکوں کا سہارا لینا اور امید دریا کے کنارے مٹی کے گھروندے بنانا سکھاتی ہے۔ لیکن ایک خیال بادِ سموم کے تُند و تیز جھونکے کی طرح آیا اور مایا کے دامن امید میں مہکتے ہوئے پھول مرجھا گئے۔ تصوّر کی نگاہیں عرب کے ریگ زاروں اور نخلستانوں میں گھومنے کے بعد برہمن آباد کے چوراہے میں اپنے بھائی کو پھانسی کے تختے پر لٹکا ہُوا دیکھنے لگیں۔ وہ ایک بہن تھی ایک بہن جو اپنے گھر میں مسرّت کے قہقہے سننے کے باوجود بھائی کی ایک ہلکی سی آہ پر چونک اٹھتی ہے۔ مایا نے اپنے دل میں کہا "بھیّا۔ میرے بھیّا! خدا تمہیں واپس لائے۔ تمہارے بغیر مجھے کسی کی مسکراہٹ خوش نہیں کر سکتی۔"

ناہید نے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا "مایا! تمہیں واقعی خالد سے اسی قدر محبت ہے؟"

مایا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپا کر ہچکیاں لینے لگی۔

ناہید نے پھر کہا۔ "مایا! معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں آتا

میں خالد کو جانتی ہوں۔ وہ ....."

مایا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "نہیں نہیں میں اپنے بھائی کے متعلق سوچ رہی ہوں" قلعے کا ایک پہرہ دار بھاگتا ہوا آیا۔ ناہید نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

پہرے دار نے کہا "خالد گھوڑے پر زین ڈال رہے ہیں وہ میرا کہا نہیں مانتے انہیں برہمن آباد کا راستہ بھی معلوم نہیں۔ اگر..... کوئی حادثہ پیش آ گیا تو گنگو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ آپ انہیں منع کریں۔"

ایک لمحہ کے لئے مایا کا دل بیٹھ گیا۔ پھر زور زور سے دھڑکنے لگا وہ اٹھی اور بے تحاشا بھاگتی ہوئی قلعے سے باہر نکل آئی۔ اس کا دل .... یہ کہہ رہا تھا "خالد مت جاؤ۔ مت جاؤ۔ میں بھائی کا غم برداشت کر سکتی ہوں۔ لیکن تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ خالد مجھ پر رحم کرو۔ خالد! خالد!!"

قلعے سے باہر خالد گھوڑے کی باگ تھام کر اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا۔ مایا نے بھاگتے ہوئے آواز دی۔ "ٹھہرو! خدا کے لئے ٹھہرو۔ اکیلے مت جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

خالد نے اپنا پاؤں رکاب سے نکال لیا اور پریشان سا ہو کر مایا کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں ناہید بھی باہر آ چکی تھی۔ مایا ناہید کی طرف متوجہ ہو کر بولی "بہن انہیں روکو۔ یہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں بھگوان کے لئے

خدا کے لئے انہیں روکو۔"

ناہید نے ان کے قریب پہنچ کر کہا۔ "خالد! اگر تمہارے جانے میں کوئی مصلحت ہوتی تو میں اس بے کسی کے باوجود تمہارا راستہ نہ روکتی۔ تم اکیلے شہر میں راجہ کے تمام لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہیں گنگو کا انتظار کرنا چاہیئے وہ ضرور آئے گا۔ اگر وہ نہ آیا تو اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور آئے گا۔ بیشک تم بہادر ہو لیکن ایسے موقع پر صبر سے کام لینا بہادری ہے۔"

خالد نے جواب دیا۔ "آپا تمہیں بخار ہے۔ تم جا کر آرام کرو۔ میں صرف ان کی راہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں دُور نہیں جاؤں گا۔"

مایا نے کہا۔ "نہیں نہیں بہن انہیں مت جانے دو۔ یہ واپس نہیں آئیں گے۔"

خالد نے کہا۔ "مایا! ممکن ہے کہ راجہ کے سپاہی ان کا تعاقب کر رہے ہوں۔ ان کی مدد میرا فرض ہے۔ تم اپنے بھائی کا خیال کرو۔"

مایا نے جواب دیا۔ میرا بھائی اگر خطرے میں ہے تو آپ اس کی مدد نہیں کر سکتے۔"

خالد کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔ لیکن دُور سے ایک شخص جو درخت پر چڑھ کر پہرہ دے رہا تھا چلّایا۔ "وہ آ رہے ہیں" اور معاً جنگل میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ایک اور پہرہ دار بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ "شاید دشمن اُن کا پیچھا کر رہے ہوں۔ تم قلعے کے تہ خانے میں چھپ جاؤ۔"

خالد نے اطمینان سے جواب دیا۔ "چھپنے کی ضرورت نہیں۔ اگر سپاہی

اُن کے تعاقب میں ہوتے تو وہ اِس طرف نہ آتے۔ لیکن یہ تو بہت تھوڑے گھوڑے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا خیر کرے"۔

گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز قریب آرہی تھی اور خالد نے دوسری بار چونک کر کہا "معلوم ہوتا ہے کہ صرف چار گھوڑے واپس آئے ہیں"۔

گھوڑوں کی آمد کی خبر پاکر ناہید نے اپنے دل میں ایک زبردست دھڑکن محسوس کی اور جب خالد نے یہ کہا کہ صرف چار گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دے رہی ہے، اُمید کے چراغ اچانک روشن ہو کر بجھ گئے۔ اُس کی حالت غم و اندوہ کے بحرِ بیکراں میں ٹوٹی ہوئی کشتی کے اُس ملّاح سے مختلف نہ تھی جو اُٹھتی ہوئی لہر کو ساحل سمجھنے کا دھوکا کھا چکا ہو۔ وہ محسوس کر رہی تھی، کہ قدرت آخری بار اُمید کا دامن اُس کے ہاتھوں سے چھین رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک گھوڑا جھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہوا۔ سوار نے قریب پہنچ کر باگیں کھینچ لیں اور گھوڑے سے کود کر مایا کی طرف بڑھا۔ مایا "بھیا! میرا بھیا!" کہتی ہوئی بھاگ کر اُس کے ساتھ لپٹ گئی۔ ناہید اور خالد کی نگاہیں جھاڑیوں کی طرف تھیں۔ جے رام کو دیکھ کر ناہید زبیر کے متعلق پھر ایک بار اُمید کے بجھے ہوئے چراغ روشن کر رہی تھی۔ جے رام کے بعد واسو اور اُس کے پیچھے گنگو اور زبیر جھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہوئے۔ زبیر کو دیکھ کر ناہید جھجکتی ہوئی دو تین قدم آگے بڑھی۔ زبیر اُس کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اُترا۔ خالد بھاگ کر اُس سے لپٹ گیا۔ ناہید نے چاہا کہ بھاگ کر اپنے کمرے میں پہنچ جائے۔ لیکن اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے

پاؤں زمین کے ساتھ پیوست ہو چکے ہیں۔ اُس کے اعضا میں ایک رعشہ تھا۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ مہینوں کے تھکے ہوئے مسافر کی طرح منزل کو اچانک اپنے قریب دیکھ کر اُس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔

زبیر خالد سے علیحدہ ہو کر آگے بڑھا اور بولا "ناہید اب تم اچھی ہو نا؟"

وہ جواب دینے کی بجائے اپنے چہرے کا نقاب درست کرنے لگی۔

زبیر نے پھر کہا۔ "ناہید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، تمہیں بخار ہے۔ تمہارا زخم اب کیسا ہے؟"

ناہید کے ہونٹ کپکپائے۔ اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ آگئے۔ میں ٹھیک ہوں۔" اُس کے آخری الفاظ ایک گہری سانس میں ڈوب کر رہ گئے اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔

(۴)

جب اُسے ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ خالد اور مایا کے مغموم چہرے دیکھنے کے بعد اُس کی نگاہیں زبیر پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ مرجھائے ہوئے چہرے پر اچانک حیا کی سرخی چھا گئی۔ اور وہ اپنے چہرے پر نقاب ڈالتے ہوئے اُٹھ بیٹھی۔ گنگو اور جے رام دروازے سے باہر کھڑے تھے۔ خالد نے اُن کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "ناہید کو ہوش آگیا ہے آپ فکر نہ کریں۔"

زبیر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ناہید، اب ہماری مصیبت ختم ہونے والی ہے۔ میں آج ہی جا رہا ہوں۔"

بایا ایک عورت کی ذکاوتِ حِس سے زبیر کے متعلق ناہید کے جذبات کا اندازہ لگا چکی تھی۔ اُس نے جلدی سے کہا: ”نہیں آج آپ نہیں جا سکتے جب تک بہن ناہید تندرست نہیں ہوتی۔ آپ یہیں ٹھہریں۔ اس وقت سارے سندھ میں آپ کی تلاش ہو رہی ہو گی۔“

زبیر نے جواب دیا: ”میرے لئے سندھ کی سرحد پار کرنے کا یہی ایک موقع ہے۔ کل تک تمام راستوں کی چوکیوں کو ہمارے فرار ہونے کی اطلاع مل جائے گی۔ ہمارے باقی ساتھی راجہ کے سپاہیوں کو چکمہ دینے کے لئے مشرق کے صحرا کا رُخ کر رہے ہیں۔ مَیں اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں۔ خالد تم یہیں رہو گے۔ اگر اس جگہ کوئی خطرہ پیش آیا۔ تو گنگو تمہیں کسی محفوظ مقام پر لے جائے گا۔ عرب سے ہماری افواج کی آمد تک اگر ناہید گھوڑے پر چڑھنے کے قابل ہو گئی تو گنگو تمہیں مکران پہنچا دے گا۔“

ناہید نے کہا: ”جب تک میری دوسری بہنیں قید میں ہیں مَیں یہیں رہنا پسند کروں گی۔ خدا آپ کو جلدی واپس لائے۔ ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ میرا خط آپ کو مل گیا ہو گا۔ آپ فوراً روانہ ہو جائیں۔ واپس آنے میں دیر نہ کریں۔ ہاں مَیں علی کا حال پُوچھنا چاہتی ہوں۔“

”علی آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ دیبل کے گورنر نے اُسے بہت اذیّت دی۔ لیکن وہ ایک بہادر لڑکا ہے۔ وہ خواہ کسی حالت میں ہو، نماز کے وقت اذان ضرور دیتا ہے۔ یہ لوگ اذان سے بہت گھبراتے ہیں۔ اُسے بارہا کوڑوں کی سزا دی جا چکی ہے لیکن اُس کے استقلال میں کوئی فرق نہیں

آیا - برہمن آباد کے قید خانہ میں بھی اُس کا یہی حال ہے ۔ راجہ کے سپاہی اُسے زبان کاٹ ڈالنے کی دھمکی دے چکے ہیں ۔ لیکن اُس کا ارادہ متزلزل نہیں ہُوا۔"

ناہید نے کہا۔ "یہ آپ کی صحبت کا اثر ہے ۔ ورنہ وُہ اتنے مضبُوط دل کا مالک نہ تھا ۔ سراندیپ میں اُسے ایک کمزور دل لڑکا سمجھا جاتا تھا۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "انسان کے عیوب اور محاسن صرف خطرے کے وقت ظاہر ہوتے ہیں۔"

دروازے پر سے گنگو نے آواز دی ۔ "اب دوپہر ہونے والی ہے ۔ آپ کو دیر نہیں کرنی چاہیئے ۔"

ناہید نے کہا۔ "آپ جائیں ۔ خدا آپ کی مدد کرے لیکن آپ کو مکران تک خشکی کا راستہ معلوم ہے؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "واسو میرے ساتھ جا رہا ہے اور وہ تمام رستوں سے واقف ہے ۔ مَیں مکران کی سرحد پر پہنچ کر اُسے واپس بھیج دُوں گا ۔"

مایا نے کہا۔ "لیکن اِس لباس میں آپ فوراً پہچانے جائیں گے۔"

زبیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میری ننّھی بہن کو میرا بہت خیال ہے ۔ لیکن اُسے پریشان نہیں ہونا چاہیئے ۔ مَیں ایک سندھی کا لباس پہن کر جا رہا ہوں ۔ اور اب تو سندھ کی زبان مَیں سیکھ چکا ہوں ۔ کوئی مجھ پر شک نہیں کرے گا۔"

مایا نے کہا۔ "آپ مجھے بہن کہہ کر بہت سی ذمہ داریاں اپنے سر

لے رہے ہیں۔ یاد رکھئے ہمارے مُلک میں دھرم کے بہن بھائیوں کا رشتہ سگے بہن بھائیوں کے رشتے سے کم مضبوط نہیں ہوتا۔ اگر آپ مجھے اپنی بہن کہتے ہیں تو ہفتوں کا سفر دنوں میں طے کیجیے۔ ہماری مصیبت آپ کے ساتھیوں کی مصیبت سے کم نہیں۔ وہ میرے بھائی کی تلاش میں سندھ کا کونہ کونہ چھان ماریں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ کی افواج کے آنے سے مایوس ہو کر کہیں میرا بھائی کاٹھیاواڑ کی طرف فرار ہونے پر آمادہ نہ ہو جائے۔"

جے رام نے باہر سے بلند آواز میں کہا: "مایا کیا کہتی ہو۔ میں ایک راجپوت ہوں، نہیں بلکہ ایک مسلمان۔ میں اپنے محسنوں کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟"

"مسلمان؟ میرا بھائی ایک مسلمان؟" مایا یہ کہتی ہوئی ناہید کی چارپائی سے اُٹھ کر بھاگی۔ اور باہر نکل کر جے رام سے لپٹ گئی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے: "بھیا سچ کہو تم مسلمان ہو گئے؟"

اُس نے جواب دیا: "مایا پارس کے ساتھ مس ہو کر لوہا لوہا نہیں رہ سکتا۔ تم رُوٹھ تو نہ جاؤ گی؟"

"میں ---؟" اُس نے الگ ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "میں... میں کیسے رُوٹھ سکتی ہوں۔ خدا نے میری دُعائیں سُن لیں۔ میری مِنتیں مان لیں۔ بھیا مبارک ہو۔ لیکن تمہارا اسلامی نام؟"

زبیر نے باہر نکلتے ہوئے کہا: "یہ میری کوتاہی ہے۔ اگر تم پسند کرو تو تمہارے بھائی کا نام ناصرالدین رکھتا ہوں۔"

"اور میرا نام؟"

خالد، زبیر، گنگو اور جے رام حیران ہو کر مایا کی طرف دیکھنے لگے۔ مایا نے اپنے سوال کا کوئی جواب نہ پا کر کہا: "تم حیران کیوں ہو۔ ناہید سے پوچھو" وہ یہ کہہ کر دہلیز میں کھڑی ہو گئی اور ناہید کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "ناہید بہن! انہیں بتاؤ کیا میں نے تمہارے سامنے کلمہ نہیں پڑھا؟ کیا میں نے چھپ چھپ کر تمہارے ساتھ نمازیں نہیں پڑھیں؟ کیا میں نے قرآن کی آیات یاد نہیں کیں ——؟"

مایا پھر اپنے بھائی کے پاس آ کر کھڑی ہوئی اور زبیر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی: "آپ کس سوچ میں پڑ گئے۔ ناہید میرا نام زہرا رکھ چکی ہے اور مجھے یہ نام پسند ہے۔"

خالد نے اندر آ کر ناہید کے کان میں آہستہ سے کہا: "تم نے یہ باتیں مجھ سے کیوں چھپائیں؟"

ناہید نے مسکرا کر جواب دیا: "مایا کو اس بات کا ڈر تھا کہ آپ یہ خیال کریں گے وہ آپ کو خوش کرنے کے لئے مسلمان ہوئی ہے۔ اسے اپنے بھائی کا خوف بھی تھا، اس لئے وہ مجھ سے وعدہ لے چکی تھی کہ میں ابھی اس کا راز اپنے تک محدود رکھوں۔" خالد پھر بھاگتا ہوا جے رام کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس کی روح خوشی کے ساتویں آسمان پر تھی۔

زبیر نے کہا: "بھائی ناصر الدین، بہن زہرا! میں تم دونوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ خدا تمہیں استقامت دے۔"

گنگو نے کہا "زبیر! اگر ہمارا دل ٹٹول کر دیکھو تو ہم سب مسلمان ہیں۔ لیکن سب کے لئے نام سوچتے ہوئے تمہیں بہت دیر لگ جائے گی۔ یہ خدمت خالد کے سپرد کرو۔ اب دوپہر ہو رہی ہے۔ تمہیں شام تک کم از کم یہاں سے تیس کوس نکل جانا چاہیئے۔"

زبیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں تیار ہوں۔"

گنگو نے واسو کو آواز دے کر کپڑے لانے کے لئے کہا۔ زہرا پھر ناہید کے پاس آ بیٹھی اور زبیر نے گنگو کی ہدایات کے مطابق ایک سندھی سپاہی کا لباس زیب تن کیا۔ گنگو نے کہا "باہر آپ کے لئے گھوڑے تیار کھڑے ہیں۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ ناہید کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس کے پاؤں کی آہٹ سن کر اپنے چہرے پر نقاب ڈال چکی تھی۔

زبیر نے کہا "ناہید! خدا حافظ۔ بہن زہرا! میرے لئے دعا کرنا۔"

دونوں نے جواب میں خدا حافظ کہا۔ اور زبیر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

خالد، ناصر الدین اور گنگو نے قلعے کے دروازے تک اس کا ساتھ دیا۔ واسو دروازے پر دو گھوڑے لئے کھڑا تھا۔ زبیر خدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ واسو نے اس کی تقلید کی۔ گنگو نے کہا "دھوپ تیز ہے۔ لیکن یہ دونوں گھوڑے تازہ دم ہیں۔ تیس کوس کی پہلی منزل ان کے لئے بڑی بات نہیں۔ واسو اس مہم میں تمہاری کامیابی شاید چند مہینوں میں سندھ کا نقشہ بدل دے۔ جب تک زبیر مکران کی سرحد عبور نہ کر لے واپس نہ آنا۔"

"آپ بے فکر رہیں" یہ کہہ کر واسو نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ زبیر نے اپنا گھوڑا اُس کے پیچھے چھوڑ دیا۔

قلعے کے اندر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سن کر زہرا دمایانے ناہید کی طرف دیکھا ناہید کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی "خدا تمہاری مدد کرے۔ خدا تمہیں دشمنوں سے بچائے۔"

زہرا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور وہ بولی "آپا! تم اب تک مجھ سے ایک بات چھپاتی رہی ہو۔ تمہیں اُن سے محبت ہے!"

ناہید نے جواب دیئے بغیر زہرا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آہستہ آہستہ ناہید کے کانوں سے محو ہو رہی تھی۔ آنسوؤں کے موتی اُس کی آنکھوں سے چھلک کر گالوں پر بہہ رہے تھے۔ زہرا نے اپنے دوپٹے سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "بہن وہ جلد آئیں گے وہ ضرور آئیں گے۔"

حصّہ دوم

کم سن سالار

قتیبہ کا ایلچی

(۱)

بصرہ کے ایک کونے میں دریا کے کنارے ایک سرسبز نخلستان کے درمیان والیٔ بصرہ کا قلعہ نما مکان تھا۔ اِس مکان کے ایک وسیع کمرے میں ایک عمر رسیدہ لیکن قوی ہیکل شخص ٹہل رہا تھا۔ وُہ چلتے چلتے رُکتا اور دیواروں پر آویزاں نقشے دیکھنے میں منہمک ہو جاتا۔ اُس کے چہرے سے غیر معمولی عزم و استقلال ٹپکتا تھا۔ آنکھوں میں ذکاوت اور ذکاوت سے زیادہ ہیبت تھی۔

یہ حجاج بن یوسف تھا جس کے آہنی ہاتھوں سے دشمن اور دوست یکساں طور پر پناہ مانگتے تھے جس کی تلوار عرب و عجم پر صاعقہ بن کر کوندی اور بسا اوقات اپنی حدود سے تجاوز کر کے عالمِ اسلام کے اُن درخشندہ ستاروں کو بھی خاک و خون میں لٹا گئی جن کے سینے نورِ ایمان سے منوّر تھے۔

حجاج بن یوسف کی طوفانی زندگی کا پہلا دور وُہ تھا جب وہ عبدالملک کے عہدِ حکومت میں سرکشوں کو مغلوب کرنے کے لئے اُٹھا اور عراق اور عرب پر آندھی اور طوفان بن کر چھا گیا۔ لیکن اس دوران میں اُس کی تلوار ایک اندھے

کی لاٹھی تھی جو حق اور ناحق میں تمیز نہ کر سکی۔ دُوسرا دور جس سے ہماری داستان کا تعلق ہے وہ تھا جب عبدالملک کی جگہ اُس کا بیٹا ولید مسندِ خلافت پر بیٹھ چکا تھا اور عراق اور عرب کی خانہ جنگیاں ختم ہو چکی تھیں اور مسلمان ایک نئے جذبہ کے ماتحت منظم اور مستحکم ہو کر ترکستان اور افریقہ کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ اپنے باپ کی طرح ولید نے بھی حجاج بن یوسف کو اندرونی اور خارجی معاملات میں سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا تھا۔ لیکن ایک مسلمان مؤرخ کی نگاہ میں حجاج نے ولید کی جو خدمات انجام دیں وہ عبدالملک کی خدمات سے بہت مختلف تھیں ؛

عبدالملک کے عہدِ حکومت میں حجّاج بن یوسف کی تمام جدوجہد عرب اور عراق تک محدود رہی اور اُس کی خون آشام تلوار نے جہاں عبدالملک کی حکومت کو مضبوط اور مستحکم کیا، وہاں اُس کے دامن کو کئی بے گناہوں کے خون کے چھینٹوں سے داغدار بھی کیا۔ لیکن ولید کا عہد مسلمانوں کے لئے نسبتہً امن کا زمانہ تھا۔ اور حجاج بن یوسف اپنی زندگی کے باقی چند سال مشرق و مغرب میں مسلمانوں کی فتوحات کی راہیں صاف کرنے میں مصروف رہا۔

جب ہم حجاج بن یُوسف کی کتابِ زندگی کے آخری اوراق پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ قدرت سندھ، ترکستان اور سپین میں مسلمانوں کی سطوت کے جھنڈے لہرانے کے لئے اُس شخص کو منتخب کرتی ہے جو آج سے چند سال قبل مکّہ کا محاصرہ کر رہا تھا۔ وہ آنکھیں جنہوں نے عبداللہ بن زبیر کو اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھ کر ترس نہ کھایا۔ سندھ میں

ایک مسلمان لڑکی کی مصیبت کا حال سُن کر بر ہم ہو جاتی ہیں۔

تاریخ ہمارے سامنے ایک اور اہم سوال پیش کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ عرب اور عراق کے مسلمان حجاج بن یوسف کے عہد کے آخری ایام میں بھی اُس سے نالاں تھے اور ولید کو بھی اچھی نظروں سے نہ دیکھتے تھے، پھر کیا وجہ تھی کہ جب سپین، سندھ اور ترکستان کی طرف پیش قدمی شروع ہوئی تو ہر محاذ پر شامی مسلمانوں کے مقابلے میں عربوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

اس کا جواب فقط یہ ہے کہ قیادت کی خامیوں کے باوجود جمہور المسلمین کا انفرادی کردار اُسی طرح بلند تھا۔ حجاج بن یوسف سے نفرت اُن کی قومی حمیت کو کچل نہ سکی۔ جب اُنہوں نے یہ سُنا کہ اُن کے بھائی افریقیہ اور ترکستان کی غیر اسلامی طاقتوں سے نبرد آزما ہیں تو وہ پرانی رنجشیں بھول کر اُن کے ساتھ جا شامل ہوئے۔

اِس لئے ولید کے عہد کی شاندار فتوحات کا سہرا حجاج بن یوسف اور ولید کے سر نہیں بلکہ اُن عوام کے سر ہے جن کے ایثار اور خلوص میں ہر قوم کی ترقی اور عروج کا راز پنہاں ہے۔

(۲)

حجاج بن یوسف دیر تک دیواروں پر لٹکے ہوئے نقشے دیکھتا رہا۔ بالآخر اُس نے ایک نقشہ اُتارا اور اپنے سامنے رکھ کر ایرانی قالین پر بیٹھ گیا۔ دیر تک سوچنے کے بعد اُس نے قلم اُٹھا کر نقشے پر چند نشانات لگائے اور نقشے کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔

ایک سپاہی نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہو کر کہا "ترکستان سے ایک ایلچی آیا ہے"۔

حجاج بن یوسف نے کہا "میں صبح سے انتظار کر رہا ہوں۔ اُسے یہاں لے آؤ"

سپاہی چلا گیا، اور حجاج بن یوسف دوبارہ نقشہ کھول کر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک زرہ پوش کمرے میں داخل ہوا۔ وہ قد و قامت سے ایک نوجوان اور چہرے سے پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے سر پر تانبے کا ایک خود چمک رہا تھا۔ تیکھے نقوش، چمکتی ہوئی آنکھیں اور پتلے اور بھنچے ہوئے ہونٹ ایک غیر معمولی عزم و استقلال کے آئینہ دار تھے۔ اس کے قد و قامت میں تناسب اور چہرے میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ حجاج بن یوسف حیرت زدہ ہو کر اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اُس نے کرخت آواز میں پوچھا "تم کون ہو؟"

لڑکے نے جواب دیا "میں نے ابھی اطلاع بھیجی تھی۔ میں ترکستان سے آیا ہوں"

"خوب! ترکستان سے تم آئے ہو۔ میں قتیبہ کی زندہ دلی کی داد دیتا ہوں۔ میں نے قتیبہ کو لکھا تھا کہ وہ خود آئے یا کسی تجربہ کار جرنیل کو میرے پاس بھیجے اور اُس نے ایک آٹھ سال کا بچہ میرے پاس بھیج دیا ہے"

لڑکے نے اطمینان سے جواب دیا "میری عُمر سولہ سال اور آٹھ مہینے ہے"

حجاج بن یوسف نے گرج کر کہا "لیکن تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟ قتیبہ

کو کیا ہو گیا ہے؟"

لڑکے نے جواب دیئے بغیر آگے بڑھ کر ایک خط پیش کیا۔ حجاج بن یوسف نے جلدی سے خط کھول کر پڑھا اور قدرے مطمئن ہو کر پوچھا "وہ خود سیدھا میرے پاس کیوں نہیں آیا۔ تمہیں یہ خط دے کر کیوں بھیجا؟"

لڑکے نے کہا "آپ کس کے متعلق پوچھ رہے ہیں؟"

حجاج بن یوسف کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ اُس نے چلا کر کہا "وہ بے وقوف جس کے متعلق قتیبہ نے لکھا ہے کہ میں اپنا بہترین سالار بھیج رہا ہوں۔"

لڑکے نے پھر اطمینان سے جواب دیا "قتیبہ کے مکتوب میں جس کا ذکر ہے وہ تو میں ہی ہوں۔ اگر آپ کسی اور بیوقوف سے ملنا چاہتے ہیں، تو مجھے اجازت دیجئے۔"

"تم؟ اور قتیبہ کے بہترین سالار! خدا ترکستان میں لڑنے والے بدنصیب مسلمانوں کو دشمنوں سے بچائے۔ قتیبہ کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"ہم دونوں مسلمان ہیں۔"

"فوج میں تمہارا عہدہ کیا ہے؟"

"میں ہراول کا سالار ہوں۔"

"ہراول کے سالار تم؟ اور بلخ سے کترا کر بخارا اور سمرقند کی طرف رُخ کرنے کے ارادے میں بھی غالباً کسی تمہارے جیسے ہونہار مجاہد کے مشورہ کا دخل ہے!"

"ہاں یہ میرا مشورہ ہے اور میرے یہاں آنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ آپ اگر تھوڑی دیر ضبط سے کام لے سکیں تو میں تمام صورت حالات آپ کو سمجھا سکتا ہوں۔"

حجاج بن یوسف کی تلخی اب پریشانی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ "اگر آج تم مجھے کوئی بات سمجھا سکے تو میں یہ کہوں گا کہ عرب کی ماؤں کے دودھ کی تاثیر زائل نہیں ہوتی۔ بیٹھ جاؤ۔ میں صبح سے یہ نقشہ دیکھ رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ جو فوج ہرات جیسے معمولی شہر کو فتح نہیں کر سکتی وہ بخارا جیسے مضبوط اور مستحکم شہر پر فتح کے جھنڈے لہرانے کے متعلق اس قدر پُر امید کیوں ہے۔ ہاں پہلے یہ بتاؤ تمہیں نقشہ پڑھنا آتا ہے؟"

لڑکے نے کوئی جواب دیئے بغیر حجاج بن یوسف کے سامنے بیٹھ کر نقشہ کھولا۔ اور مختلف مقامات پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بلخ ہے اور یہ بخارا۔ غالباً آپ بخارا کے قلعے کی مضبوطی کے متعلق بہت کچھ سُن چکے ہوں گے لیکن بلخ کا قلعہ اگر اس قدر مضبوط نہ بھی ہو تو بھی یہ اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کے باعث کہیں زیادہ محفوظ ہے۔ بخارا کے چاروں اطراف کھلے میدان ہیں اور ہم آسانی سے اس کا محاصرہ کر کے شہر کے باشندوں کو ترکستان کے باقی شہروں کی افواج کی مدد سے محروم کر سکتے ہیں۔ رہا قلعہ تو اُس کے متعلق میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ منجنیق کے سامنے پتھر کی دیواریں نہیں ٹھہرتیں اور یہ بھی کئی بار دیکھا جا چکا ہے کہ قلعہ بند فوج زیادہ دیر فقط اُس صورت میں مقابلہ کرتی ہے جب انہیں باہر سے کسی مدد کی اُمید ہو۔ ورنہ وہ مایوس ہو کر دروازے

کھول دیتی ہیں۔ اس کے برعکس بلخ میں ہمیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شہر پر حملہ کرنے کے لئے ہمیں جس قدر افواج کی ضرورت ہوگی اُس سے کہیں زیادہ سپاہی پہاڑی علاقہ میں رسد و کمک کے راستے محفوظ رکھنے کے لئے درکار ہوں گے۔ اس کے علاوہ شہر کا محاصرہ کرنے کے لئے ہمیں اِردگرد کی تمام پہاڑیوں پر قبضہ کرنا ہوگا۔ اِن جنگوں میں پہاڑی قبائل کے پتھر ہمارے تیروں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوں گے۔ بلخ کے جنوب اور مشرق کے پہاڑ کافی اُونچے ہیں۔ اگر جنوبی اور مشرقی ترکستان کی تمام ریاستوں نے بلخ کو مدد دینے کی کوشش کی تو ایک بہت بڑی فوج اِن اُونچے پہاڑوں کی آڑ لے کر ہماری طرف کسی مزاحمت کا مقابلہ کئے بغیر بلخ کے قریب پہنچ کر مشرق، جنوب اور مغرب کے ہمارے لئے خطرہ پیدا کر سکتی ہے۔ اور اگر شمال سے اُن کی مدد کے لئے بخارا اور سمرقند کی افواج بھی آجائیں، تو مرو سے ہماری رسد و کمک کا راستہ بھی منقطع ہو جائے گا اور ہمیں چاروں اطراف سے بیرونی حملہ آوروں نے محصور کر رکھا ہوگا۔ تاہم گرمیوں میں ہم ڈٹ کر اُن کا مقابلہ کر سکیں گے۔ لیکن یہ محاصرہ یقیناً طول کھینچے گا اور سردیوں میں پہاڑی لوگ ہمارے لئے بہت خطرناک ثابت ہوں گے اور پسپائی کی صورت میں ہم سے بہت کم ایسے ہوں گے جو واپس مرو پہنچ سکیں۔"

حجاج بن یوسف اب نقشے سے زیادہ اِس کم سن سالار کو دیکھ رہا تھا اُس نے کہا "عربوں کی فوجی اصطلاحات میں ابھی تک "پسپائی" کے لفظ کو کوئی جگہ نہیں ملی!"

لڑکے نے جواب دیا۔ "مجھے عربوں کے عزم و استقلال پر شبہ نہیں، لیکن میں فوجی زاویۂ نگاہ سے اِس حملے کو خودکشی کے مترادف سمجھتا ہوں۔"

حجاج بن یوسف نے کہا۔ "تو تمہارا کیا خیال ہے کہ مشرق کی طرف پیش قدمی کا ارادہ ترک کر دیا جائے؟"

"نہیں ترکستان پر تسلط رکھنے کے لئے مشرق میں ہماری آخری چوکی بلخ نہیں ہوگی۔ بلکہ ہمیں کاشغر اور چترال کے درمیان تمام پہاڑی علاقے پر قبضہ کرنا پڑے گا۔ لیکن میں اس سے پہلے بخارا کو فتح کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ اِس میں ہمیں دو فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ یہ ترکستان کا اہم ترین شہر ہے اور اہلِ ترکستان پر اس کی فتح کا وہی اثر ہو گا جو مدائن کی فتح کے بعد ایرانیوں اور دمشق کی فتح کے بعد رومیوں پر ہوا تھا۔ دوسرا یہ کہ بخارا کا محاصرہ کرتے وقت ہمیں باہر سے اُن خطرات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، جو مَیں بلخ کے متعلق بیان کر چکا ہوں۔ بخارا کو فتح کرنے کے بعد ہم مرو کی بجائے اُسے اپنی افواج کا مستقر بنا سکتے ہیں۔ وہاں سے سمرقند اور سمرقند سے قوقند اور فرغانہ کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ اِن فتوحات کے بعد مجھے اُمید نہیں کہ ترکستان کی قوتِ مدافعت باقی رہے۔ اِس کے بعد میری تجویز ہے کہ بخارا اور سمرقند سے ہماری افواج جنوبی ترکستان کی طرف پیش قدمی کریں۔ اور قوقند کی افواج کاشغر کا رُخ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ جتنی دیر میں قوقند کی افواج دشوار گزار پہاڑوں کو عبور کرتے ہوئے کاشغر پہنچیں گی، اُس سے پہلے جنوب میں بلخ اور اُس کے آس پاس کے شہر فتح ہو چکے ہوں گے۔"

حجاج بن یوسف حیرت و استعجاب کے عالم میں اس کم سن سپاہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے نقشہ لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا۔ "تم کس قبیلے سے ہو؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "میں ثقفی ہوں۔"

"ثقفی! ــــ تمہارا نام کیا ہے؟"

"محمد بن قاسم!"

حجاج بن یوسف نے چونک کر محمد بن قاسم کی طرف دیکھا اور کہا۔

"قاسم کے بیٹے سے مجھے یہی توقع تھی۔ ــــ مجھے پہچانتے ہو؟"

محمد بن قاسم نے کہا۔ "آپ بصرہ کے حاکم ہیں۔"

حجاج بن یوسف نے مایوس ہو کر کہا۔ "بس میرے متعلق یہی جانتے ہو تم؟"

"میں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ اس سے پہلے آپ خلیفہ عبدالملک کے دست راست تھے اور اب خلیفہ ولید کے دست راست ہیں!"

"تمہیں تمہاری ماں نے یہ نہیں بتایا کہ قاسم میرا بھائی تھا، اور تم میرے بھتیجے ہو؟"

"اُنہوں نے مجھے بتایا تھا۔"

"کب؟"

"جب آپ عبداللہ بن زبیر کو قتل کر کے مدینے واپس آئے تھے!"

کم سن بھتیجے کے منہ سے یہ الفاظ سُن کر حجاج بن یوسف کی پیشانی کی رگیں تھوڑی دیر کے لئے پھول گئیں۔ وہ غضب ناک ہو کر محمد بن قاسم کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اُس کی نگاہوں میں خوف و ہراس کی بجائے غایت درجہ کا سکون دیکھ کر اُس کا غصہ آہستہ آہستہ ندامت میں تبدیل ہونے لگا۔ محمد بن قاسم کی بے خوف نگاہیں اس سے پُوچھ رہی تھیں۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے کیا وہ غلط ہے۔ کیا تم عبداللہ بن زبیر کے قاتل نہیں ہو؟"

حجاج بن یوسف اپنے دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس کرتے ہوئے اُٹھا اور دریا کی طرف کھلنے والے دریچے کے پاس کھڑا ہو کر باہر جھانکنے لگا۔ "عبداللہ بن زبیر کا قاتل ۔۔ عبداللہ بن زبیر کا قاتل!" اُس نے چند بار اپنے دل میں یہ الفاظ دُہرائے۔ تصوّر کی نگاہیں ماضی کا نقاب اُلٹنے لگیں۔ وہ مکہ کے اُس عمر رسیدہ مجاہد کو دیکھ رہا تھا جس کے ہونٹوں پر قتل ہوتے وقت بھی ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اُسے پھر ایک بار مکہ کی گلیوں میں بیواؤں اور یتیموں کی چیخیں سُنائی دینے لگیں۔ اُس نے کپکپی لیتے ہوئے مُڑ کر محمد بن قاسم کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی توقّع کے خلاف اُس کی طرف دیکھنے کی بجائے نقشہ دیکھنے میں منہمک تھا۔ عہدِ ماضی کی چند اور تصویریں اُس کے سامنے آگئیں۔ وہ پھر ایک بار مدینہ کے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے نوجوان بھائی کو بسترِ مرگ پر دیکھ رہا تھا۔ وہ بھائی جس نے مکہ میں اُس کی کارگزاری کا حال سُننے کے بعد اُسے دیکھ کر غصے اور حقارت سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ قاسم کے یہ الفاظ پھر ایک بار اُس

کے کانوں میں گونجنے لگے۔ "حجاج جاؤ میں مرتے وقت عبداللہ بن زبیر کے قاتل کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ تمہارے دامن پر جس خون کے چھینٹے ہیں اُسے میرے آنسو نہیں دھو سکتے۔" پھر وہ اپنے بھائی کے جنازے کے ساتھ اپنے کمسن بچے کو دیکھ رہا تھا۔ یہ اُس کا بھتیجا تھا جسے اُس نے اُٹھا کر گلے لگانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ تڑپ کر ایک طرف کھڑا ہو کر چلّا تا تھا۔ "نہیں۔ نہیں، مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ ابا کو تم سے نفرت تھی۔"

حجاج کے دل میں اک ہُوک سی اُٹھی۔ اُس نے محمد بن قاسم کی طرف دیکھا اور کہا "محمد ادھر آؤ۔"

محمد بن قاسم نقشہ لپیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے اُٹھا۔ اور حجاج بن یوسف کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اُس کے چہرے پر غیر معمولی اطمینان کی جھلک حجاج بن یوسف کے لئے صبر آزما تھی۔ لیکن اُس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "تو میں تمہاری نظروں میں عبداللہ بن زبیر کے قاتل کے سوا کچھ نہیں ــــ؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "یہ خلقِ خدا کا فتوےٰ ہے اور میں آپ کو دھوکے میں رکھنے کے لئے قاتل کی جگہ کوئی اور لفظ تلاش نہیں کر سکتا۔"

حجاج بن یوسف نے کہا۔ "تمہاری رگوں میں قاسم کا خون ہے میں تمہاری ہر بات برداشت کرنے کے لئے تیار رہوں۔ اگرچہ برداشت کرنا میری عادت نہیں۔"

"میں آپ کو اپنی عادت بدلنے پر مجبور کرنے کے لئے نہیں آیا۔

قتیبہ بن مُسلم باہلی نے جو فرض میرے سپرد کیا تھا وہ مَیں پُورا کر چُکا ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ اگر آپ نے قتیبہ کو کوئی پیغام بھیجنا ہو تو میں کل حاضر ہو جاؤں گا۔"

ایک لمحہ کے تذبذب کے بعد حجاج بن یوسف نے کہا۔ "تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "شہر میں والدہ کے پاس۔ مَیں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔ ابھی تک گھر نہیں گیا۔"

"تمہاری والدہ بصرہ میں ہیں؟ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ وہ یہاں کب آئیں؟"

"انہیں مدینہ سے یہاں آئے ہوئے تین چار مہینے ہوئے ہیں۔ مجھے مرو میں اُن کا خط ملا تھا۔"

"وُہ کس کے پاس ٹھہری ہیں۔ وہ یہاں کیوں نہ آئیں؟"

"وہ ماموں کے مکان میں ٹھہری ہیں اور یہاں نہ آنے کی وجہ آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔"

"اور تم ترکستان جانے سے پہلے کہاں تھے؟"

"مَیں دس برس کی عمر تک ماں کے ساتھ مدینہ میں تھا اور اُس کے بعد ماموں کے پاس بصرہ چلا آیا۔"

"اور مجھ سے اتنی نفرت تھی کہ اپنی صُورت تک نہ دکھائی؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "سچ پُوچھئے تو مَیں مکتب اور اُس کے بعد سپاہیانہ زندگی میں اس قدر مصروف رہا ہوں کہ اپنے دِل میں کسی

کی محبت یا نفرت کے جذبات کو جگہ نہیں دے سکا؟"

حجاج بن یوسف نے کچھ سوچ کر کہا۔ "مکتب میں شاید میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ لیکن پہچان نہ سکا۔ تم بہت جلد جوان ہو گئے ہو۔ اب بتاؤ اپنی چچی سے نہیں ملو گے؟"

محمد بن قاسم مذبذب سا ہو کر حجاج بن یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔ حجاج بن یوسف نے اُسے بازو سے پکڑ لیا اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا اور باغیچے کے دُوسرے کونے میں رہائشی مکان کے دروازے پر پہنچ کر محمد بن قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

(۳)

حجاج بن یوسف کی آواز سُن کر اُس کی بیوی ایک کمرے سے باہر نکلی اور محمد بن قاسم کو دیکھتے ہی چلائی۔ "محمد! تم کب آئے؟"

حجاج بن یوسف نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تم نے اسے کیسے پہچان لیا؟"

وہ خوشی کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "میں اسے کیونکر بھول سکتی تھی۔"

حجاج بن یوسف نے پھر سوال کیا۔ "تم نے اسے کب دیکھا تھا؟"

"جب میں زبیدہ اور اُس کے ماموں کے ساتھ حج پر گئی تھی۔ ہم واپسی پر مدینے میں اُن کے ہاں ٹھہرے تھے۔ محمد بھی ترکستان سے رخصت پر آیا ہوا تھا۔"

"اور میرے ساتھ ذکر تک بھی نہ کیا؟"

"مجھے اس کی والدہ نے تاکید کی تھی اور مجھے بھی ڈر تھا کہ آپ کہیں بُرا نہ مانیں۔"

"تو انہوں نے ابھی تک میری خطا معاف نہیں کی؟"

"وہ آپ سے ناراض نہیں۔ لیکن قاسم کی موت کا اُن کے دِل پر گہرا اثر ہے۔"

حجاج بن یوسف نے کچھ سوچ کر محمد بن قاسم کی طرف دیکھا، اور کہا "محمد! چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

حجاج کی بیوی نے کہا "نہیں نہیں آپ ابھی وہاں نہ جائیں۔"

"لیکن کیوں؟"

"وہ بیمار ہیں؟"

"تو اس صورت میں مجھے ضرور جانا چاہئے"

محمد بن قاسم نے بے چین سا ہو کر کہا "امی جان بیمار ہیں؟ مجھے اجازت دیجئے۔"

محمد بن قاسم بھاگ کر مکان سے باہر نکل گیا۔ حجاج بن یوسف اُس کا ساتھ دینے کے لئے مُڑا لیکن اُس کی بیوی نے آگے بڑھ کر راستہ روک لیا۔ "نہیں نہیں آپ نہ جائیں۔"

"میں ضرور جاؤں گا۔ تمہیں یہی ڈر ہے نا کہ وہ مجھے بُرا بھلا کہیں گی اور میں طیش میں آجاؤں گا؟"

"نہیں اُن کا حوصلہ اِس قدر پست نہیں۔"

"تو پھر تم مجھے اُن کی تیمارداری سے منع کیوں کرتی ہو اور یہ تمہیں کیسے معلوم ہؤا کہ وہ بیمار ہیں؟"

"مجھے ڈر ہے کہ آپ خفا ہو جائیں گے۔ مَیں آپ سے ایک بات چھپاتی رہی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"جب سے وہ دمشق میں آئی ہیں میں ہر تیسرے چوتھے دن اُن کے گھر جایا کرتی ہوں۔ کل مَیں نے خادمہ کو بھیجا اور اُس نے بتایا کہ اُن کی طبیعت بہت خراب ہے۔ مَیں ابھی وہاں سے ہو کر آئی ہوں۔ اگر آپ کا ڈر نہ ہوتا تو مَیں کچھ دیر اور وہاں ٹھہرتی۔ آج زبیدہ میرے ساتھ تھی اور اُن کی حالت دیکھ کر رہیں۔"

حجاج بن یوسف نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "تم ڈرتی کیوں ہو؟ صاف صاف کہو۔ اگر تم زبیدہ کو وہاں چھوڑ آئی ہو تو بُرا نہیں کیا۔"

"وہ ابھی آجائے گی۔ مَیں نے خادمہ کو بھیج دیا ہے۔"

"لیکن تم نے یہ سب کچھ مجھ سے کیوں چھپایا۔ کیا تمہارا یہ خیال تھا کہ مجھ میں انسانیت کی کوئی رمق باقی نہیں رہی؟"

"مجھے معاف کیجئے۔"

"اچھا اب تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

(۴)

زبیدہ محمد بن قاسم کی والدہ کے سرہانے بیٹھی اُس کا سر دبا رہی تھی

ایک شامی لونڈی اُن کے پاس کھڑی تھی۔ محمد بن قاسم کی والدہ نے کراہتے ہوئے زبیدہ کا ہاتھ اپنے نحیف ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور اُسے اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! تمہارے ہاتھوں سے میری جلتی ہوئی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ تمہارے باپ کو پتہ لگ گیا۔ تو وہ بہت خفا ہوگا اور پھر شاید تم کبھی بھی یہاں نہ آسکو۔ بیٹی جاؤ۔"

زبیدہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے جواب دیا۔ "میرا جی نہیں چاہتا کہ آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر جاؤں۔"

صحن میں کسی کی آہٹ پا کر زبیدہ نے اُٹھ کر باہر جھانکا۔ محمد بن قاسم اپنے گھوڑے کی لگام حبشی غلام کے ہاتھ میں تھما کر بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔ دروازے پر زبیدہ کو دیکھ کر جھجکا اور پھر پہچان کر بولا "تم یہاں؟ — امّی کیسی ہیں؟"

زبیدہ جواب دینے کی بجائے اس کی سپاہیانہ ہیبت سے مرعوب سی ہو کر ایک طرف ہٹ گئی اور محمد بن قاسم اندر داخل ہوا۔

بیٹے پر نگاہ پڑتے ہی ماں کے زرد چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! تم آگئے؟"

محمد بن قاسم نے اس کے قریب بیٹھ کر سر سے خود اُتارتے ہوئے پوچھا۔ "امّی! آپ کب سے علیل ہیں؟"

"بیٹا! بصرہ پہنچتے ہی میری صحت خراب ہوگئی تھی۔"

"لیکن مجھے کیوں نہ لکھا؟"

"بیٹا! تم گھر سے کوسوں دُور تھے اور میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ خود تمہارے سر پر مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اِسے پھر پہن کر دکھاؤ۔ میں اپنے کم سن مجاہد کو سپاہیانہ لباس میں اچھی طرح دیکھنا چاہتی ہوں۔"

محمد بن قاسم نے مُسکراتے ہوئے خود اپنے سر پر رکھ لیا۔ ماں کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کے منہ سے بے اختیار دُعا نکلی

"میرے اللہ! یہ سر ہمیشہ اُونچا رہے۔"

محمد بن قاسم سے نظر ہٹا کر اُس نے زبیدہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بیٹی! تم کیوں کھڑی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔"

زبیدہ جو ابھی تک دروازے کے قریب تھی جھجکتی اور شرماتی ہوئی آگے بڑھی اور بستر کے قریب ایک کُرسی پر بیٹھ گئی۔

ماں نے محمد بن قاسم کی طرف دیکھا اور کہا۔ "محمد! تم نے اسے نہیں پہچانا؟"

اُس نے جواب دیا۔ "میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ لیکن زبیدہ، تم یہاں کیسے آئیں؟ چچا کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ امی جان یہاں ہیں۔"

ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "تم اپنے چچا سے مِل کر آئے ہو؟"

"ہاں امی! قتیبہ کا ضروری پیغام تھا۔ اِس لئے میں سیدھا اُن کے پاس پہنچا اور وہ مجھے پکڑ کر گھر لے گئے وہ خود بھی آپ کے پاس آنا چاہتے تھے لیکن میں آپ کی علالت کا حال سُن کر بھاگ آیا اور اُنہیں ساتھ نہ لا سکا۔"

ماں نے مغموم صُورت بنا کر کہا۔ "خدا کرے یہاں آنے میں اُس کی

نیت نیک ہو۔"

زبیدہ کا سُرخ و سپید چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اُس نے کُرسی سے اُٹھ کر کہا۔" چچی جان! میں جاتی ہوں۔" شامی کنیز بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

لیکن اتنے میں باہر کسی کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی اور شامی کنیز نے آگے بڑھ کر صحن کی طرف جھانکا اور اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

محمد بن قاسم پریشان ہو کر اُٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ زبیدہ کی ماں اندر داخل ہوئی اور حجاج بن یوسف نے دروازے پر رُک کر محمد بن قاسم سے کہا۔" محمد! اپنی ماں سے پُوچھو۔ مجھے اندر آنے کی اجازت ہے؟"

محمد بن قاسم نے مُڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔" کیوں امی! اچچا اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔"

ماں نے سر اور چہرہ ڈھانپتے ہوئے جواب دیا۔" گھر میں آنے والے مہمان کے لئے دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں بُلا لو۔"

حجاج بن یوسف اندر داخل ہُوا۔ زبیدہ کے چہرے پر کئی رنگ آ چکے تھے۔ اُس کی ماں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" بیٹی! ڈرتی کیوں ہو؟ تمہارے ابا خود تمہاری چچی کی مزاج پُرسی کے لئے آئے ہیں۔"

حجاج بن یوسف کو وہاں بیٹھے چند ساعتیں نہ گزری تھیں کہ گلی میں لوگوں کا شور سُن کر محمد بن قاسم باہر نکلا اور تھوڑی دیر کے بعد مُسکراتے ہوئے واپس آ کر کہنے لگا۔" آپ کو دیکھ کر محلّے کے تمام لوگ ہمارے دروازے پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ آپ ہمیں قتل کرنے کے لئے

آئے ہیں"

حجاج بن یوسف کے چہرے پر ایک دردناک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے سر جھکا لیا۔

(۵)

تیسرے دن محمد بن قاسم پھر حجاج بن یوسف کے پاس پہنچا، اور ترکستان واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حجاج بن یوسف نے پُوچھا "تمہاری ماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "اُن کی حالت اب پہلے سے کچھ اچھی ہے اور اُنہوں نے مجھے واپس جانے کی اجازت دے دی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں آج ہی روانہ ہو جاؤں"

حجاج بن یوسف نے جواب دیا "میں نے آج صبح قتیبہ کی طرف اپنا قاصد روانہ کر دیا ہے اور اسے لکھ بھیجا ہے کہ مجھے تمہاری تجاویز سے اتفاق ہے۔ اب تم کچھ عرصہ یہیں رہو گے"۔

"لیکن میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ قتیبہ نے مجھے جلد واپس آنے کے لئے بہت تاکید کی تھی"۔

حجاج نے جواب دیا "لیکن مجھے اس جگہ تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ مجھ پر ایک بہت بڑا بوجھ ہے اور تم میرا ہاتھ بٹا سکتے ہو۔ میں یہاں سے اکیلا ہر محاذ کی نگرانی نہیں کر سکتا۔ اِس کے علاوہ تمہارے متعلق میں نے دربارِ خلافت میں لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ تمہیں وہاں ایک فوجی مُشیر کا

عہدہ سنبھالنا پڑے۔"

"لیکن دمشق میں مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار لوگ موجود ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ دربارِ خلافت میں آپ کے اثر و رسوخ کا ناجائز فائدہ اُٹھاؤں۔ مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ آپ مجھے ترکستان جانے کی اجازت دیں۔"

"محمد! تمہارا یہ قیاس غلط ہے۔ تم اگر بھتیجے ہونے کی بجائے میرے بیٹے بھی ہوتے تو بھی میں تمہاری بے جا حمایت نہ کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ تم بڑی سے بڑی ذمہ داری سنبھال سکتے ہو۔ یہ محض اتفاق ہے کہ تُم میرے بھتیجے ہو۔ پرسوں کی ملاقات میں جو اثر تم نے مجھ پر ڈالا ہے۔ اُس کے بعد خواہ تم کوئی ہوتے میں یقیناً تمہارے لئے یہی کچھ کرتا — قتیبہ بذاتِ خود غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ وُہ تمہارے بغیر کام چلا سکے گا۔ تم میدانِ جنگ کی بجائے دمشق یا بصرہ میں رہ کر اُس کی زیادہ مدد کر سکتے ہو۔ تم کم سن ہو۔ وُہ نوجوان جو بوڑھوں کی آواز پر ٹس سے مس ہونے کے عادی نہیں۔ یقیناً تمہاری آواز پر لبیک کہیں گے قتیبہ کی سب سے بڑی مدد یہ ہو گی کہ تم یہاں یا دمشق میں بیٹھ کر اُس کے لئے مزید سپاہی بھرتی کرتے رہو۔ دُوسرے محاذ پر ہماری افواج مغربی افریقہ تک پہنچ چکی ہیں۔ ممکن ہے کہ موسیٰ بن نصیر کسی دن سمندر عبور کر کے سپین پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اِس صُورت میں ہمارے لئے مغربی محاذ، ترکستان کے محاذ سے بھی زیادہ اہم ہو جائے گا۔ اِس لئے جب تک دربارِ خلافت سے میرے مکتوب کا جواب نہیں آتا۔ تم یہیں رہو۔ اور تمہارا ماموں ابھی تک کوفہ سے آیا ہے یا نہیں؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا "وہ شاید آج آجائے"!

"اُسے آتے ہی میرے پاس بھیجنا ــــ اور کہنا کہ یہ والی بصرہ کا حکم نہیں۔ حجاج بن یوسف کی درخواست ہے"!

محمد بن قاسم باہر نکلا تو ایک کنیز نے کہا کہ آپ کی چچی آپ کو اندر بلاتی ہیں۔ محمد بن قاسم حرم سرا میں داخل ہوا۔ زبیدہ اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ محمد بن قاسم کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر حیا کی سُرخی آگئی اور وہ اُٹھ کر دُوسرے کمرے میں چلی گئی۔

چچی نے محمد بن قاسم کو اپنے سامنے ایک کُرسی پر بٹھا لیا۔ اور پُوچھا "بیٹا! تمہارے ماموں جان آئے ہیں یا نہیں؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا "وہ آج آجائیں گے لیکن اُن کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ چچا بھی مجھ سے انہیں کے متعلق پُوچھتے تھے"۔

"کچھ نہیں بیٹا! ایک کام ہے"۔

محمد بن قاسم چچی سے رخصت ہو کر گھر پہنچا، تو حجاج بن یوسف کی ایک بوڑھی خادمہ باہر نکل رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہُوا تو ماں بستر پر تکیے کا سہارا لئے بیٹھی تھی۔ وہ اُسے دیکھتے ہی مسکرا کر بولی "بیٹا! اب تو شاید تمہیں چند دن اور یہیں رہنا پڑے"۔

"ہاں امی۔ چچا نے دربار خلافت میں فوجی مشیر کے عہدہ کے لئے میری سفارش کی ہے اور مجھے جواب آنے تک یہیں ٹھہرنا پڑے گا"!

"بیٹا! حجاج کبھی کسی پر مہربان نہیں ہُوا لیکن تم بہت خوش نصیب ہو"

"امی! میں اپنے پاؤں پر اٹھنا چاہتا ہوں۔ اگر دمشق جا کر مجھے معلوم ہوا کہ میں اپنے نئے منصب کا اہل نہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ بڑی بڑی عمر کے لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔ اور سب یہ کہیں گے کہ میرے ساتھ خاص رعایت کی گئی ہے۔"

"بیٹا! حجاج میں لاکھ برائیاں ہوں۔ لیکن اس میں ایک خوبی ضرور ہے کہ وہ عہدہ داروں کا انتخاب کرتے وقت غلطی نہیں کرتا۔ میں خود یہ نہیں چاہتی کہ وہ میرے بیٹے کے ساتھ کوئی رعایت کرے۔ لیکن اگر اس نے تمہاری کوئی بے جا رعایت بھی کی ہے تو میں یہ چاہتی ہوں کہ تم نہ صرف خود کو اپنے منصب کا اہل ثابت کر دکھاؤ بلکہ یہ ثابت کر دکھاؤ کہ تم اس سے زیادہ اہم ذمہ داری بھی سنبھال سکتے ہو۔ میں تمہیں ایک اور خوشخبری سنانا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"پہلے وعدہ کرو کہ میں جو کچھ کہوں گی تم اس پر عمل کرو گے۔"

"امی آج تک آپ کا کوئی حکم ایسا ہے جس سے میں نے سرتابی کی ہو؟"

"جیتے رہو بیٹا! میری دعا ہے کہ جب تک دن کو سورج اور رات کو چاند اور ستارے میسر ہیں۔ تمہارا نام دنیا میں روشن رہے۔ اور قیامت کے دن مجاہدینِ اسلام کی ماؤں کی صف میں میری گردن کسی سے نیچی نہ ہو۔"

"ہاں امی! وہ خوشخبری کیا تھی؟"

ماں نے مسکراتے ہوئے تکیے کے نیچے سے ایک خط نکالا اور کہا۔

"لو پڑھ لو۔ تمہاری چچی کا خط ہے"!

محمد بن قاسم نے خط کھولا۔ اور چند سطور پڑھنے کے بعد اُس کا چہرہ حیا سے سُرخ ہو گیا۔ اُس نے خط ختم کیئے بغیر ماں کے آگے رکھ دیا۔ اور دیر تک سر جُھکائے بیٹھا رہا۔

"کیوں بیٹا! کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں امی!"

"بیٹا! یہ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی اور حجاج سے نفرت کے باوجود میں یہ دُعا کیا کرتی تھی کہ زبیدہ میری بہو بنے۔ پچھلے دنوں وہ باپ سے چھُپ چھُپ کر میری تیمارداری کرتی رہی سچ کہتی ہوں کہ اگر میری کوئی اپنی لڑکی بھی ہوتی، تو شاید میرا اِس قدر خیال نہ کرتی۔ مجھے یہ ڈر تھا۔ کہ حجاج بن یوسف کبھی یہ گوارا نہ کرے گا اور میں خدا سے تمہاری عزت، ترقی اور شہرت کے لئے دُعائیں کیا کرتی تھی۔ میں جب بھی زبیدہ کو دیکھتی، میرے مُنہ سے یہ دُعا نکلتی۔ "یا اللہ میرے بیٹے کو ایسا بنا دے کہ حجاج اُسے اپنا داماد بنانے پر فخر کرے۔ آج میری آرزوئیں پُوری ہوئیں۔ لیکن یہ خیال نہ کرنا کہ میں صرف اِس لئے خوش ہوں کہ تم والیٔ بصرہ کے داماد بنو گے بلکہ میں اِس لئے خوش ہوں کہ مدینہ، دمشق اور بصرہ میں میں نے زبیدہ جیسی لڑکی نہیں دیکھی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ دمشق یا کہیں اور جانے سے پہلے تمہاری شادی کر دی جائے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہو گا بیٹا!"

"امی! آپ کو خوش رکھنا میں دُنیا کی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔"

لیکن ماموں جان حجاج سے بہت نفرت کرتے ہیں۔"

"اس کے باوجود وُہ زبیدہ کو انہیں نگاہوں سے دیکھتے ہیں جن سے مَیں دیکھتی ہوں۔ تم اُن کی فکر نہ کرو۔"

(۶)

تین ہفتوں کے بعد بصرہ، کوفہ اور عراق کے دُوسرے شہروں میں یہ خبر حیرت و استعجاب سے سُنی گئی کہ حجاج بن یوسف نے جو عالم اسلام کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، اپنے بھائی قاسم کے یتیم اور غریب لڑکے کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کر دی ہے۔ دعوتِ ولیمہ میں شہر کے معززین کے علاوہ محمد بن قاسم کے بہت سے دوست اور ہم مکتب شریک تھے۔

اگلے دِن حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو بُلا کر یہ خوشخبری دی کہ دمشق سے خلیفۃ المسلمین کا ایلچی آگیا ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ تمہیں فوراً دمشق بھیج دیا جائے۔"

محمد بن قاسم نے کہا "مَیں جانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن دربارِ خلافت کے بڑے بڑے عہدہ دار مجھے دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ آپ کی وجہ سے میرے ساتھ بے جا رعایت کی گئی ہے"۔

حجاج نے جواب دیا "قیمتی پتھر اپنی ضخامت سے نہیں بلکہ چمک سے پہچانے جاتے ہیں۔ مَیں نے فقط تمہاری فطری صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ایک موزوں ماحول تلاش کیا ہے۔ دربارِ خلافت میں تم صیغۂ اُمورِ

حرب کی مجلسِ شوریٰ کے ایک رُکن کی حیثیت میں کام کرو گے اور اگر تم اپنے رفقائے کار اور خلیفہ کو میری طرح متاثر کر سکے تو یقین رکھو کہ کسی کو تمہاری کم سنی کی شکایت نہ ہو گی۔"

محمد بن قاسم نے کہا۔ "لیکن میں حیران ہوں کہ صیغۂ امورِ حرب کی مجلسِ شوریٰ دمشق میں کیا کرتی ہے؟ خلیفہ نے امورِ حرب کی تمام ذمہ داری تو آپ کو سونپ رکھی ہے۔ سپہ سالاروں کے ایلچی براہِ راست آپ کے پاس آتے ہیں۔ نقل و حرکت کے لئے تمام احکام آپ کی طرف سے جاتے ہیں۔"

"یہ اس لئے ہے کہ مجلسِ شوریٰ میں تمہارے جیسے سرگرم اور بیدار مغز ارکان کی کمی ہے اور اُن کا بہت سا بوجھ مجھ پر ڈال دیا گیا ہے۔ اب تم وہاں جاؤ گے تو کم از کم میرے سر سے افریقہ کے محاذ کی نگرانی کا بوجھ اُٹھ جائے گا۔ افریقہ کے حالات میں ذرا سی تبدیلی پر امیر المومنین مجھے ہر دُوسرے تیسرے مہینے مشورے کے لئے بُلاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ تمہاری صلاحیتیں دیکھ کر وُہ مجھے بار بار بُلانے کی ضرورت محسوس نہ کریں اور میں ترکستان کے محاذ کی طرف زیادہ توجہ دے سکوں۔"

محمد بن قاسم نے پوچھا۔ "مجھے کب جانا چاہیئے؟"

"میرے خیال میں تم کل ہی روانہ ہو جاؤ۔ میں چند دنوں تک تمہاری والدہ اور زبیدہ کو دمشق بھیجنے کا انتظام کر دوں گا۔"

محمد بن قاسم رخصت ہونے کو تھا کہ حبشی غلام نے اندر آ کر حجاج بن یوسف کو اطلاع دی۔ "ایک نوجوان حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ وُہ

کہتا ہے کہ میں سراندیپ سے نہایت ضروری خبر لے کر آیا ہوں۔"

حجاج بن یوسف نے کہا۔ "بلاؤ اُسے۔ اور محمد تم بھی ٹھہرو۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ سراندیپ سے کوئی اچھی خبر نہیں آئی۔"

غلام کے جانے کے تھوڑی دیر بعد زبیر اندر داخل ہوا۔ اُس کے کپڑے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے، اور خوبصورت چہرے پر حزن و ملال اور تھکاوٹ کے آثار تھے۔ حجاج بن یوسف نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور کہا۔ "زبیر تم آ گئے۔ تمہارا جہاز......؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ سندھ کے ساحل پر دیبل کے گورنر نے ہمارا جہاز لُوٹ لیا ہے۔ دُوسرا جہاز جس پر سراندیپ کے راجہ نے آپ کے اور خلیفہ کے لئے تحائف بھیجے تھے وُہ بھی لُوٹ لیا ہے اور مسلمانوں کے یتیم بچے جنہیں میں لینے کے لئے گیا تھا، قید کر لئے ہیں۔"

حجاج نے کہا۔ "تم یہاں کیسے پہنچے۔ مجھے تمام واقعات بتاؤ؟"

زبیر نے شروع سے لے کر آخر تک اپنی سرگزشت سُنائی۔ حجاج بن یوسف کی آنکھوں میں غم و غصہ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اُس کے چہرے پر پُرانی ہیبت چھا گئی، اور وہ ہاتھوں کی مُٹھیاں بھینچتا اور ہونٹ چباتا ہُوا کمرے میں چکر لگانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وُہ ایک دیوار کے قریب رُک کر ہندوستان کے نقشے کی طرف دیکھنے لگا۔ اور اُس کے مُنہ سے ایک زخمی شیر کی گرج سے ملتی جُلتی آواز نکلی۔ "سندھ کے راجا کی یہ جراُت!"

بکریاں بھی شیروں کو سینگ دکھانے لگیں۔ شاید اُسے بھی یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ہماری افواج شمال اور مغرب میں پھنسی ہوئی ہیں"۔

یہ کہہ کر حجاج زبیر کی طرف متوجہ ہوا "تم نے ابھی تک بصرہ میں کسی کو یہ خبر تو نہیں سنائی؟"

زبیر نے جواب دیا "نہیں میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں"۔

حجاج نے کہا "سندھ کی طرف سے اس سے زیادہ صریح الفاظ میں ہمارے خلاف اعلانِ جنگ نہیں ہو سکتا۔ لیکن تم جانتے ہو کہ اس وقت ہماری مجبوریاں ہمیں ایک نئے محاذ کی طرف پیش قدمی کی اجازت نہیں دیتیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ المناک خبر ابھی عوام تک نہ پہنچے۔ وہ خود جہاد پر جانے کے لئے تیار ہوں یا نہ ہوں لیکن مجھے کوسنے میں کوتاہی نہیں کریں گے"۔

زبیر نے کہا "آپ کا مطلب ہے کہ آپ یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کریں گے؟"

حجاج نے جواب دیا "سردست خاموشی کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہیں۔ میں مکران کے گورنر کو لکھتا ہوں کہ وہ خود سندھ کے راجہ کے پاس جائے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی غلطی کے لئے آمادہ ہو جائے۔ اور مسلمان بچوں کو اُس کے حوالے کر دے"۔

زبیر نے کہا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ اپنی غلطی کے اعتراف کے لئے آمادہ نہ ہوں گے۔ ابو الحسن کا جہاز لاپتہ ہونے پر بھی آپ نے مکران کے گورنر کو وہاں بھیجا تھا لیکن اُنہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، اور

مجھے یقین ہے کہ ابوالحسن کا جہاز بھی لوٹا گیا تھا اور وہ اور اُس کے چند ساتھی اب تک راجہ کی قید میں ہیں۔ میں خود بھی راستے میں مکران کے عامل سے مِل کر آیا ہوں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اُن کے ساتھ راجہ اور اُس کے اہل کار گزشتہ ملاقات میں نہایت ذلت آمیز سلوک کر چکے ہیں۔ اِس لئے وُہ بذاتِ خود دوبارہ اُس کے پاس جانا پسند نہیں کرتے۔ تاہم اُنہوں نے آپ کا مشورہ لئے بغیر مکران کے سالارِ اعلےٰ عبیداللہ کی قیادت میں دیبل کے سردار کے پاس ایک وفد بھیج دیا ہے۔ جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں اُس سے میرا اندازہ ہے کہ دیبل کا حاکم انتہا درجے کا بے رحم اور ہٹ دھرم ہے اور عبیداللہ بھی کافی جوشیلا ہے ممکن ہے کہ وہاں اُن کے ساتھ بھی وہی سلوک ہو جو ہمارے ساتھ ہو چکا ہے اور وہ راجہ سے ملاقات کرنے سے پہلے ہی کسی خطرے کا شکار ہو جائیں۔"

حجاج نے کہا "تاہم میں عبیداللہ کی واپسی کا انتظار کروں گا۔"

"اور اگر وہ بھی کوئی اچھی خبر نہ لایا تو؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سندھ ایک وسیع مُلک ہے۔ اور ہمیں وہاں لشکر کشی سے پہلے ایک لمبی تیاری کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امیر المومنین ترکستان، شمالی مغربی افریقہ اور اُس کے بعد شاید اندلس کی فتح سے پہلے ہمیں سندھ پر لشکر کشی کی اجازت نہ دیں۔"

محمد بن قاسم اب تک خاموشی سے یہ تمام باتیں سُن رہا تھا۔ اُس نے زبیر کی مایوس نگاہوں سے متاثر ہو کر کہا "خلیفہ کو رضامند کرنے کا ذمہ

میں لیتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کل کی بجائے آج ہی دمشق روانہ ہو جاؤں۔

حجاج نے جواب دیا "برخوردار! جاتے ہی نہ خلیفہ کو نہ مشورہ دے کر تم اپنی سپاہیانہ صلاحیتوں کا اچھا مظاہرہ نہیں کرو گے۔ تمہاری غیرت اور شجاعت میں کلام نہیں۔ لیکن دشمنوں کے قلعے خالی تدبیروں سے فتح نہیں ہوتے۔ اِس مہم کے لئے بہت سے سپاہیوں کی ضرورت ہو گی اور عراق، عرب اور شام کے کسی مستقر میں ہمارے پاس زاید افواج نہیں!"

محمد بن قاسم نے جواب دیا "میں مسلمانوں کی غیرت سے مایوس نہیں۔ ایسی خبر اُن لوگوں کو بھی متاثر کر سکتی ہے جنہیں آرام کی زندگی جذبۂ جہاد سے محروم کر چکی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اپنی عمر کے لوگوں سے مایوس ہوں۔ لیکن میں نوجوانوں سے نا اُمید نہیں۔ وہ نوجوان جو آپ اور خلیفہ سے اختلافات کے باعث ترکستان اور افریقہ جا کر لڑنا پسند نہیں کرتے۔ مسلمان بچوں پر سندھ کے راجہ کے مظالم کی داستان سُن کر یقیناً متاثر ہوں گے۔ ہزاروں نوجوان ایسے ہیں جن کی حمیت ابھی تک فنا نہیں ہوئی۔ وہ مسلمان جن سے آپ مایوس ہیں مرے نہیں سو رہے ہیں اور قوم کے یتیم بچوں کی فریاد یقیناً اُن کے لئے صورِ اسرافیل ثابت ہو گی۔"

حجاج بن یوسف گہری سوچ میں پڑ گیا۔ زبیر نے موقع دیکھ کر ایک سفید رومال جس پر ناہید کی تحریر تھی، اپنی جیب سے نکال کر اُسے پیش کیا۔ اور کہا "آپ کے نام یہ مکتوب ابوالحسن کی لڑکی نے اپنے خون سے لکھا تھا۔ اور مجھے کہا تھا کہ اگر حجاج بن یوسف کا خون منجمد ہو چکا ہو، تو میرا یہ خط

پیش کر دینا۔ ورنہ اس کی ضرورت نہیں"۔

حجاج بن یوسف رومال پر خون سے لکھی ہوئی تحریر کی چند سطور پڑھ کر کپکپا اُٹھا اور اُس کی آنکھوں کے شعلے پانی میں تبدیل ہونے لگے۔ اُس نے رومال محمد بن قاسم کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور خود دیوار کے پاس جا کر ہندوستان کا نقشہ دیکھنے لگا۔ محمد بن قاسم نے شروع سے لے کر آخر تک یہ مکتوب پڑھا۔ مکتوب کے الفاظ یہ تھے:۔

"مجھے یقین ہے کہ والیٔ بصرہ قاصد کی زبانی مسلمان بچوں اور عورتوں کی مصیبت کا حال سُن کر اپنی فوج کے غیور سپاہیوں کو گھوڑوں پر زینیں ڈالنے کا حکم دے چکا ہوگا۔ اور قاصد کو میرا یہ خط دکھانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اگر حجاج بن یوسف کا خون منجمد ہو چکا ہے تو شاید میری تحریر بھی بے سُود ثابت ہو۔ میں ابوالحسن کی بیٹی ہوں۔ میں اور میرا بھائی ابھی تک دُشمن کی دسترس سے محفوظ ہیں۔ لیکن ہمارے باقی تمام ساتھی ایک ایسے دُشمن کی قید میں ہیں جس کے دل میں رحم کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ قید خانے کی اُس تاریک کوٹھڑی کا تصوّر کیجئے جس کے اندر اسیروں کے کان مجاہدین اسلام کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُننے کے لئے بے قرار ہیں۔ ہماری تلاش جاری ہے۔ اور ممکن ہے کہ ہمیں بھی کسی تاریک کوٹھڑی میں پھینک دیا جائے۔ ممکن ہے

کہ اس سے پہلے ہی میرا زخم مجھے موت کی نیند سُلا دے اور
میں اس عبرتناک انجام سے بچ جاؤں۔ لیکن مرتے وقت
مجھے یہ افسوس ہوگا کہ وہ صبا رفتار گھوڑے جن کے سوار
ترکستان اور افریقہ کے دروازے کھٹکھٹا رہے ہیں، اپنی
قوم کے یتیم اور بے بس بچوں کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔ کیا یہ ممکن ہے۔
کہ وہ تلوار جو روم و ایران کے مغرور تاجداروں کے سر پر
صاعقہ بن کر کوندی۔ سندھ کے مغرور راجہ کے سامنے کُند ثابت
ہوگی؟ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ لیکن اے حجاج! اگر
تم زندہ ہو۔ تو اپنی غیور قوم کے یتیموں اور بیواؤں کی مدد کو
پہنچو ——

ناہید — ایک غیور قوم کی بے بس بیٹی"

محمد بن قاسم نے رومال لپیٹ کر زبیر کے حوالے کیا، اور حجاج بن یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ گرد و پیش سے بے خبر سا ہو کر نقشے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

محمد بن قاسم نے پوچھا "آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

حجاج بن یوسف نے اپنا خنجر نکالا۔ اور اس کی نوک سندھ کے نقشے میں پیوست کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں سندھ کے خلاف اعلانِ جہاد کرتا ہوں۔ محمد، تم آج ہی دمشق روانہ ہو جاؤ۔ زبیر کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ یہ مکتوب بھی امیر المؤمنین کو دکھا دینا۔ جتنی فوج دمشق سے فراہم ہو سکے لے کر یہاں پہنچ جاؤ۔ میرا خط بھی امیر المؤمنین کے پاس لے جاؤ۔ واپس آنے میں دیر

نہ کرنا۔ ہاں اگر امیر المؤمنین متاثر نہ ہوں تو دمشق کی رائے عامہ کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرنا۔ اور مجھے یقین ہے کہ امیر المؤمنین عوام میں زندگی کے آثار دیکھ کر سندھ کے خلاف اعلانِ جہاد میں پس و پیش نہیں کریں گے۔ مَیں تمہیں ایک بہت بڑی ذمہ داری سونپ رہا ہوں، اور دمشق سے واپس آنے پر شاید تمہیں اس سے کہیں زیادہ اہم ذمہ داری سونپ دی جائے۔ میرا خط دکھانے پر تمہیں راستے کی ہر چوکی سے تازہ دم گھوڑے مل جائیں گے۔ اب گھر جا کر تیار ہو آؤ۔ اتنی دیر میں مَیں خط لکھتا ہوں اور زبیر تم بھی تیار ہو جاؤ۔“

حجاج بن یوسف نے تالی بجائی اور ایک حبشی غلام بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔

حجاج نے کہا۔ ”انہیں مہمان خانے میں لے جاؤ۔ کھانا کھلانے کے بعد ان کے کپڑے تبدیل کراؤ۔ ان کے سفر کے لئے دو بہترین گھوڑے تیار کرو۔“

بصرہ سے دمشق تک

(۱)

چند دنوں کی یلغار کے بعد محمد بن قاسم اور زبیر ایک صبح دمشق سے چند کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی سے باہر فوجی چوکی پر اُترے۔ محمد بن قاسم نے چوکی کے افسر کو حجاج بن یوسف کا خط دکھایا اور تازہ دم گھوڑے تیار کرنے اور کھانا لانے کا حکم دیا۔

افسر نے جواب دیا۔ "کھانا حاضر ہے لیکن آج گھوڑے شاید آپ کو نہ مِل سکیں۔ ہمارے پاس اس وقت صرف پانچ گھوڑے ہیں۔"

محمد بن قاسم نے کہا۔ "لیکن ہمیں تو صرف دو چاہئیں۔"

"لیکن اِن گھوڑوں پر امیر المومنین کے بھائی سلیمان بن عبدالملک اور اُن کے ساتھی دمشق روانہ ہونے والے ہیں۔ کل چونکہ دمشق میں فنونِ حرب کی نمائش ہوگی۔ اِس لئے اُن کا آج شام تک وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ مَیں نہ والیٔ بصرہ کے حکم سے سرتابی کرسکتا ہوں اور نہ امیر المومنین کے بھائی کو ناراض کرنے کی جرأت کرسکتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ وُہ بہت سخت

طبیعت کے آدمی ہیں۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"وہ اندر آرام فرما رہے ہیں۔ غالباً دوپہر کے بعد یہاں سے روانہ ہوں گے۔ اگر آپ کا کام بہت ضروری ہے تو اُن سے اجازت لے لیجئے۔ دوپہر تک اُن کے اپنے گھوڑے تازہ دم ہو جائیں گے۔ ویسے بھی وہ کوئی بڑی منزل کر کے نہیں آئے۔ آپ کھانا کھا کر اُن سے پُوچھ لیں۔ بذاتِ خود میں آپ کو منع نہیں کرتا۔ آپ لے جائیں تو آپ کی مرضی۔ لیکن ہماری شامت آجائے گی۔"

زبیر اور محمد بن قاسم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھایا، اور محمد بن قاسم اندر جانے کے ارادے سے اُٹھا لیکن زبیر نے کہا "کیا یہ ضروری ہے کہ ہم سلیمان کی اجازت حاصل کریں۔ یہ گھوڑے صرف فوجی ضروریات کے لئے یہاں رکھے گئے ہیں، اور سلیمان سیر و تفریح کے لئے دمشق جا رہا ہے۔ اُسے فوجی معاملات میں رُکاوٹ پیدا کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ گھوڑے اصطبل میں تیار کھڑے ہیں۔ شہزادہ سلیمان دوپہر تک آرام فرمائے گا۔ اُس کے بعد کچھ دیر آئینہ سامنے رکھ کر اپنے خادموں سے اپنی خوبصورتی کی تعریف سُنے گا۔ اُس کے بعد اپنے اشعار کی داد لے گا۔ پھر اپنی نیزہ بازی اور شاہسواری کی تعریف سُنے گا۔ اُس کے بعد ممکن ہے کہ شام کے وقت سپاہیوں کو حکم دے کہ گھوڑوں کی زینیں اُتار دو۔ ہم صبح جائیں گے۔"

محمد بن قاسم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ سلیمان بن عبدالملک کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں"۔

"ہاں! مَیں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ عالمِ اسلام میں شاید اس سے زیادہ مغرور اور خود پسند آدمی اور کوئی نہ ہو۔ اسی لئے مَیں یہ کہتا ہوں کہ مجھے اُس سے کسی اچھے جواب کی اُمید نہیں"۔

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "مجھے صرف یہ خیال ہے کہ ہمارے چلے جانے کے بعد چوکی کے سپاہیوں کی شامت آجائے گی۔ اس لئے اُس سے پُوچھ لینے میں کوئی ہرج نہیں"۔

"آپ کی مرضی۔ لیکن آپ پُوچھنے جائیں اور مَیں اتنی دیر میں اصطبل سے دو گھوڑے کھول لاتا ہوں"۔

محمد بن قاسم نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ سلیمان اپنے ساتھیوں کے درمیان دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ دو خادم اُس کے پاؤں دبا رہے تھے۔

محمد بن قاسم السلام علیکم کہہ کر اندر داخل ہوا۔ سلیمان نے بے پروائی سے اُس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پُوچھا۔ "تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟"

محمد بن قاسم نے اُس کی تُرش کلامی سے لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجئے! مَیں آپ کے آرام میں مُخل ہوا۔ مَیں آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ مَیں دمشق ایک ضروری کام کے لئے جا رہا ہوں"۔

"جاؤ ہم نے کب روکا تمہیں؟" سلیمان کے ساتھیوں نے اس پر

ایک قہقہہ لگایا۔ لیکن محمد بن قاسم نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارے گھوڑے بہت تھکے ہوئے ہیں اور میں اس چوکی سے دو تازہ دم گھوڑے لے جا رہا ہوں۔ اس کے لئے مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن میں نے اس خیال سے آپ کو ملنا ضروری خیال کیا کہ آپ خواہ مخواہ چوکی کے سپاہیوں کو برا بھلا نہ کہیں۔"

سلیمان نے ذرا اکڑ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہارے گھوڑے تھکے ہوئے ہیں تو تم پیدل جا سکتے ہو۔"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "ایک سپاہی کے لئے پیدل چلنا باعث عار نہیں۔ لیکن میں بہت جلد دمشق پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"تو تم سپاہی ہو۔ تمہارے نیام میں لکڑی کی تلوار ہے یا لوہے کی" سلیمان کے ساتھیوں نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔

محمد بن قاسم نے پھر اطمینان سے جواب دیا۔ "اگر بازوؤں میں ہمت ہو تو لکڑی سے بھی لوہے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری تلوار بھی لوہے کی ہے اور مجھے اپنے بازوؤں پر بھی بھروسہ ہے۔"

سلیمان نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "صالح یہ لڑکا باتوں میں کافی ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔ ذرا اٹھو میں اس کے سپاہیانہ جوہر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ایک گندمی رنگ کا قوی ہیکل شخص فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور نیام سے تلوار نکال کر آگے بڑھا۔

محمد بن قاسم نے کہا "میں راہ چلتوں کے سامنے اپنی سپاہیانہ صلاحیتوں کی نمائش کرنے کا عادی نہیں۔ اور نہ میرے پاس اتنا وقت ہی ہے۔ اور اگر وقت بھی ہوتا تو بھی میں کرائے پر قہقہے لگانے والوں سے دل لگی کرنا ایک سپاہی کے لئے باعثِ عار سمجھتا ہوں"۔

محمد بن قاسم یہ کہہ کر باہر نکل آیا۔ لیکن صالح نے آگے بڑھ کر تلوار کی نوک سامنے کرتے ہوئے اُس کا راستہ روک لیا اور کہا "بے وقوف! اگر تمہاری عمر دو چار سال اور زیادہ ہوتی تو میں تمہیں بتاتا کہ کرائے پر قہقہہ لگانے والا کسے کہتے ہیں"!

سامنے زبیر ایک گھوڑے پر سوار ہو کر دوسرے گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے تھا۔ سلیمان نے باہر نکل کر کہا "اسے جانے دو۔ یہ بیچارہ خدا جانے کہاں سے تلوار اُٹھا لایا ہے۔ لیکن وہ کون ہے"؟

سلیمان نے زبیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اُسے روکو"!

صالح زبیر کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُس نے نیزہ سنبھال لیا۔

محمد بن قاسم نے تلوار کھینچتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ ایامِ جاہلیت کے عرب اب بھی اس دُنیا میں موجود ہیں۔ لیکن تم ہمیں نہیں روک سکتے"۔

صالح زبیر سے مُنہ پھیر کر اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ اور تلوار کی نوک اُس کے سینے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "اگر تمہاری زبان سے ایک لفظ اور نکلا تو یاد رکھو۔ میری تلوار خون میں نہائے بغیر واپس

نیام میں ......"

لیکن اُس کا فقرہ پُورا ہونے سے پہلے محمد بن قاسم کی تلوار کی جنبش سے ہوا میں ایک سنسناہٹ اور پھر دو تلواروں کے ٹکرانے سے ایک جھنکار پیدا ہوئی۔ صالح کی تلوار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دس قدم دُور جا پڑی۔ اور وہ حیرت، ندامت اور پریشانی کی حالت میں اپنے ساتھیوں اور اُس کے ساتھی دم بخود ہو کر محمد بن قاسم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

سلیمان نے اپنے ساتھی کی بے بسی دیکھ کر زور سے قہقہہ لگایا لیکن محمد بن قاسم کو گھوڑے پر سوار ہوتا دیکھ کر قہقہے کی آواز اُس کے گلے میں اٹک گئی اور اُس نے چلّا کر کہا "ٹھہرو!"

محمد بن قاسم نے گھوڑے کی باگ موڑتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور کہا "آپ کا ساتھی بہادر ہے لیکن تلوار پکڑنا نہیں جانتا۔ میرا مشورہ ہے کہ اپنے ساتھیوں کو دمشق کی نمائش میں لے جانے سے پہلے کسی سپاہی کے سپرد کریں۔" یہ کہہ کر محمد بن قاسم نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور دونوں آن کی آن میں درختوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔

صالح غصے سے اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا اصطبل کی طرف بھاگا لیکن سلیمان نے کہا "بس اب رہنے دو۔ تم اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ چودہ پندرہ سال کا بچہ ہم سب کا مُنہ چڑا کر نکل گیا۔"

راستے میں زبیر نے محمد بن قاسم سے کہا "دیکھ لیا شہزادہ سلیمان کو۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ وہ خلافت کا اُمیدوار بھی ہے۔"

محمد بن قاسم نے کہا "خدا مسلمانوں کو شر سے بچائے"۔

زبیر نے کہا "محمد! آج میں نے پہلی وفعہ تمہارے چہرے پر جلال دیکھا ہے۔ تلوار نکالتے وقت تم اپنی عمر سے کئی سال بڑے معلوم ہوتے تھے۔ اور جانتے ہو وہ شخص جسے تم نے مغلوب کیا ہے کون تھا؟ وہ صالح تھا۔ قریباً ڈیڑھ سال ہوا میں نے اسے کوفہ میں دیکھا تھا۔ اُسے تیغ زنی میں اپنے کمال پر ناز ہے۔ لیکن آج اُس کا غرور اُسے لے ڈوبا"۔

(۲)

دمشق کی جامع مسجد میں نمازِ عصر ادا کرنے کے بعد محمد بن قاسم اور زبیر قصرِ خلافت میں داخل ہوئے۔ خلیفہ ولید نے اپنے دربان سے ان کی آمد کی اطلاع پاتے ہی انہیں اندر بُلا لیا۔ ولید بن عبدالملک نے یکے بعد دیگرے ان دونوں کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پُوچھا "تم میں محمد بن قاسم کون ہے؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "میں ہوں"۔

حاضرینِ دربار جن کی نگاہیں زبیر پر مرکوز ہو چکی تھیں، حیرت زدہ ہو کر محمد بن قاسم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اُن کی خاموش نگاہیں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ حجاج بن یوسف کے گزشتہ مکتوب سے ولید کو معلوم ہو چکا تھا کہ محمد بن قاسم بہت کم سن ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بھی درباریوں کی طرح زبیر ہی کو حجاج کا ہونہار بھتیجا سمجھ رہا تھا۔ وہ سولہ سترہ سالہ لڑکے کو قتیبہ کے لشکر کے ہراول کا سالارِ اعلےٰ تسلیم کرنے

کے لئے تیار نہ تھا۔

آنکھوں کے اشاروں کے ساتھ اہلِ دربار کی زبانیں بھی ہلنے لگیں اور ولید نے اچانک یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اُس کے خاندان کے سب سے بڑے محسن حجاج بن یوسف کے متعلق کچھ کہا جا رہا ہے۔ مسند سے اُٹھ کر محمد اور زبیر کے ساتھ مصافحہ کیا اور انہیں اپنے قریب ایرانی قالین پر بٹھاتے ہوئے کہا۔" وہ مجاہد جس کے متعلق حجاج بن یوسف جیسا مردم شناس اور قتیبہ بن مسلم جیسا سپہ سالار اس قدر بلند رائے رکھتے ہوں۔ میرے لئے یقیناً قابلِ احترام ہے۔" پھر اُس نے محمد بن قاسم سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ " اور یہ تمہارا بڑا بھائی ہے؟"

"نہیں امیر المومنین، یہ زبیر ہے۔"

ولید نے زبیر کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔" میں نے شاید پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے۔ شاید تم سراندیپ کے ایلچی کے ساتھ گئے تھے تم کب آئے؟ اور وہ بچے کہاں ہیں؟"

خلیفہ کی طرح حاضرینِ دربار کی توجہ بھی زبیر کی طرف مرکوز ہو گئی۔ اور بعض نے اُسے پہچان لیا۔ زبیر کا تذبذب دیکھ کر محمد بن قاسم نے جلدی سے حجاج بن یوسف کا خط پیش کرتے ہوئے کہا۔" امیر المومنین ہم ایک نہایت ضروری پیغام لے کر آئے ہیں۔ پہلے آپ یہ پڑھ لیں۔ ولید نے جلدی سے خط کھول کر پڑھا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد حاضرینِ دربار سے مخاطب ہو کر کہا۔" سندھ کے راجہ نے ہمارا جہاز لوٹ لیا ہے۔ سراندیپ

سے آنے والی بیواؤں اور یتیم بچوں کو قید کر لیا ہے۔ زبیر تم اپنی تمام سرگزشت سناؤ۔" زبیر نے شروع سے لے کر اخیر تک تمام واقعات بیان کئے۔ لیکن دربار میں جوش و خروش کی بجائے مایوسی کے آثار پا کر اختتام پر اُس کی آواز بیٹھ گئی اور اُس نے جیب سے رومال نکال کر خلیفہ کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "ابوالحسن کی بیٹی نے یہ خط والیٔ بصرہ کے نام لکھا تھا۔"

حجاج بن یوسف کی طرح ولید بھی یہ خط پڑھ کر بے حد متاثر ہوا۔ اُس نے اہلِ دربار کو سنانے کے لئے خط کو دوسری بار بلند آواز میں پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن چند فقرے پڑھنے کے بعد اُس کی آواز بیٹھ گئی۔ اُس نے مکتوب محمد بن قاسم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "تم پڑھ کر سنا دو۔"

محمد بن قاسم نے سارا خط پڑھ کر سنایا۔ مجلس کا رنگ بدل چکا تھا۔ حاضرین میں سے اکثر کے چہرے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ جذبات کا طوفان عقل کی مصلحتوں کو مغلوب کر چکا ہے۔ لیکن ولید کو خاموش دیکھ کر سب کی زبانیں گنگ تھیں۔ شہر کا عمر رسیدہ قاضی دیر تک اِس تکلیف دِہ خاموشی کو برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے کہا۔ "امیر المؤمنین! اب آپ کو کس بات کا انتظار ہے۔ یہ سوچنے کا موقع نہیں۔ پانی سر سے گزر چکا ہے۔"

ولید نے پوچھا۔ "آپ کی کیا رائے ہے؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "امیر المؤمنین! فرض کے معاملے میں رائے سے کام نہیں لیا جاتا۔ رائے صرف اُس وقت کام دیتی ہے، جب سامنے دو راستے ہوں۔ لیکن ہمارے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے۔"

ولید نے کہا "میں آپ سب کی رائے پوچھتا ہوں"۔

ایک عہدہ دار نے کہا "ہم میں سے کوئی بھی اُلٹے پاؤں چلنا نہیں جانتا"۔

ولید نے کہا "لیکن ہمارے پاس افواج کہاں ہیں؟ موسیٰ کا پیغام آچکا ہے کہ وُہ اندلس پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ دُوسری طرف ترکستان میں عراق کی تمام افواج کو قتیبہ اپنے لئے کافی نہیں سمجھتا۔ ہمیں نیا محاذ کھولنے کے لئے یا تو ان میں سے ایک محاذ کمزور کرنا پڑے گا اور یا کچھ مُدت انتظار کرنا پڑے گا"۔

قاضی نے جواب دیا "امیر المومنین! یہ خط سننے کے بعد ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جو انتظار کا مشورہ دے۔ اگر آپ یہ مشورہ عوام کے سامنے پیش کریں تو مجھے امید ہے کہ سندھ کی مہم کے لئے ترکستان یا افریقہ سے افواج منگوانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی"۔

ولید نے کہا "اگر آپ عوام کو جہاد کے لئے آمادہ کرنے کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں تو میں ابھی اعلانِ جہاد کرنے کے لئے تیار ہوں"۔

قاضی مذبذب سا ہو کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

ولید نے کہا "میں عوام سے مایوس نہیں۔ مجھے صرف یہ شکایت ہے کہ ہمارا اہل الرائے طبقہ خود غرض اور خود پسند ہو چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں جب مُوسیٰ بن نصیر نے طُونس پر حملہ کیا تھا، اُونچے طبقہ کے کئی آدمیوں نے ہماری مخالفت کی تھی۔ جب قتیبہ نے مرو پر حملہ کیا تھا، میرا اپنا بھائی سلیمان اُن لوگوں کا ساتھ دے رہا تھا جو عوام کو یہ تبلیغ کر رہے تھے کہ یہ جہاد ناجائز ہے

یہ ہماری اور بدقسمتی ہے کہ با اثر طبقے میں جو لوگ کچھ مخلص ہیں وہ کاہل اور تن آسان ہیں اور گھروں میں بیٹھے روئے زمین پر غلبۂ اسلام کے لئے اپنی نیک دُعاؤں کو کافی سمجھتے ہیں۔ اگر آپ سب عوام تک پہنچنے کی کوشش کریں تو چند دنوں میں ایک ایسی فوج تیار ہو سکتی ہے جو نہ صرف سندھ بلکہ تمام دُنیا کی تسخیر کے لئے کافی ہو لیکن آپ بُرا نہ مانیں، آپ تھوڑی دیر کے لئے متاثر ہوئے ہیں۔ آپ ایک یا دو دن عوام کو بلکہ اپنے جیسے اُونچے طبقے کے بے عمل لوگوں کو یہ خبر سُنانے میں ایک لذت محسوس کریں گے۔ سندھ کے ظالم راجہ کو بُرا بھلا کہیں گے اور اُس کے بعد بنی اسرائیل کی طرح دُنیا اور عاقبت کا بوجھ خدا کے سر تھوپ کر آرام سے بیٹھ جائیں گے۔ لیکن اگر آپ ہمت کریں تو مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عامۃ المسلمین ابھی تک زندہ ہیں۔ اگر آپ اُونچے طبقہ کی تفریحی مجالس کے بجائے دمشق کے ہر گھر میں جانا عوام میں بیٹھنا، اور اُن سے باتیں کرنا گوارا کریں تو مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سندھ کے اسیر جو قید خانے کی دیواروں سے کان لگائے کھڑے ہیں، بہت جلد ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُن لیں گے۔ اور خدا اُس لڑکی کو زندگی اور صحت دے، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گی کہ ہماری تلواریں کُند نہیں ہوئیں۔"

محمد بن قاسم نے کہا۔ "اگر امیر المومنین مجھے اجازت دیں تو مَیں یہ ذمہ داری اُٹھانے کے لئے تیار ہوں۔"

ولید نے کہا۔ "تمہیں میری اجازت کی ضرورت نہیں۔"

محمد بن قاسم کے بعد دربار کے ہر عہدہ دار نے ولید کو نئی فوج بھرتی کرنے کا یقین دلایا اور یہ مجلس برخاست ہوئی۔

عشا کی نماز کے بعد جب محمد بن قاسم اور زبیر آپس میں باتیں کر رہے تھے، ایک صاحب نے آکر یہ پیغام دیا کہ امیر المومنین محمد بن قاسم کو بلاتے ہیں۔ محمد بن قاسم سپاہی کے ساتھ چلا گیا اور زبیر اپنے بستر پر لیٹ کر کچھ دیر اُس کا انتظار کرنے کے بعد اونگھتے اونگھتے سپنوں کی حسین وادی میں کھو گیا۔ یہاں سے کوسوں دور وہ ناہید کی تلاش میں سندھ کے شہروں میں بھٹک رہا تھا۔ قلعوں کی فصیلیں اور قید خانوں کے دروازے توڑ رہا تھا۔ ناہید کے خوبصورت ہاتھوں کی آہنی بیڑیاں کھول رہا تھا۔ اُس کی سیاہ اور چمکدار آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا "ناہید! میں آگیا ہوں۔ تم آزاد ہو۔ تمہارا زخم کیسا ہے؟ دیکھو برہمن آباد کے قلعے پر ہمارا جھنڈا لہرا رہا ہے!"

اور وہ کہہ رہی تھی "زبیر! میں اچھی ہوں۔ لیکن تم نے بہت انتظار دکھایا۔ میں مایوس ہو چکی تھی۔"

میٹھے اور سہانے سپنے کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ انتہائی بے کسی کی حالت میں پابہ زنجیر کھڑا ہے۔ راجہ کے چند سپاہی ننگی تلواریں اٹھائے اُس کے چاروں طرف کھڑے ہیں اور باقی ناہید کو پکڑ کر قید خانے کی طرف لے جا رہے ہیں اور وہ مڑ مڑ کر ملتجی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی ہے۔ ناہید کے پاؤں اندر رکھتے ہی قید خانے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور وہ سخت جد و جہد کے بعد اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی زنجیریں

توڑ کر سپاہیوں کو مارتا گراتا اور دھکے دیتا ہوا قید خانے کے دروازے تک پہنچتا ہے اور اُسے کھولنے کی جدوجہد کرتا ہے۔

زبیر نے "ناہید! ناہید!!" کہتے ہوئے آنکھیں کھولیں، اور سامنے محمد بن قاسم کو کھڑا دیکھ کر پھر بند کر لیں۔

محمد بن قاسم اُسے خواب کی حالت میں ہاتھ پاؤں مارتے اور ناہید کا نام لیتے ہوئے سُن چکا تھا تاہم اُس نے اُسے گفتگو کا موضوع بنانا مناسب نہ سمجھا اور چپکے سے اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد زبیر نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور کہا "آپ آ گئے؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا "ہاں میں آگیا ہوں۔" اور پھر کچھ سوچ کر پوچھا "آپ نیزہ بازی میں کیسے ہیں؟"

زبیر نے جواب دیا "میں نے بچپن میں جو کھلونا پسند کیا تھا، وہ کمان تھی اور جب گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھنے کے قابل ہوا، میں نے نیزے سے زیادہ کسی اور چیز کو پسند نہیں کیا۔ رہی تلوار۔ اُس کے متعلق کسی عرب سے یہ سوال کرنا کہ تم اس کا استعمال جانتے ہو یا نہیں اُس کے عرب ہونے میں شک کرنے کے مترادف ہے۔ آپ یقین رکھئے میری تربیت آپ کے ماحول سے مختلف ماحول میں نہیں ہوئی۔"

محمد بن قاسم نے کہا "کل میرا اور آپ کا امتحان ہے۔ امیر المومنین نے مجھے اسی لئے بلایا تھا۔ اُن کی خواہش ہے کہ ہم دونوں فنونِ حرب کی نمائش میں حصہ لیں۔ اگر ہم مقابلے میں دوسروں پر سبقت لے گئے۔ تو

دمشق کے لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑے گا اور ہمیں جہاد کے لئے تبلیغ کا موقع مل جائے گا۔ امیر المؤمنین کی خواہش ہے کہ ہمارا مقابلہ سلیمان اور اُن کے ساتھیوں سے ہو۔"

زبیر نے کہا "امیر المؤمنین کا خیال درست ہے۔ خدا نے ہمارے لئے یہ اچھا موقع پیدا کیا ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ صالح اور سلیمان کے متعلق غلط اندازہ نہ لگائیں۔ راستے میں آپ کے ہاتھوں اُس کا مات کھا جانا ایک اتفاق کی بات تھی۔ وہ دونوں نیزہ بازی میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ تاہم میں تیار ہوں۔"

محمد بن قاسم نے کہا "ہمیں اپنی بڑائی مقصود نہیں۔ ہم ایک اچھے مقصد کے لئے نمائش میں حصہ لیں گے اور خدا ہماری مدد کرے گا۔ امیر المؤمنین نے کہا ہے کہ وہ ہمیں اپنے بہترین گھوڑے دیں گے۔"

(۳)

سلیمان بن عبدالملک نے ایک قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر زرہ پہنی اور سر پر خود رکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیوں صالح! میں عام لباس میں اچھا معلوم ہوتا ہوں یا سپاہیانہ لباس میں؟"

صالح نے جواب دیا "خدا نے آپ کو ایک ایسی صورت دی ہے جو ہر لباس میں اچھی لگتی ہے۔"

سلیمان آئینے کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر کچھ سوچ کر بولا "مجھے اُس لڑکے کی صورت پر رشک آگیا تھا۔ وہ نمائش دیکھنے ضرور آئے گا۔

اگر تم میں سے کسی کو مل جائے تو اُسے میرے پاس لے آؤ۔ وہ ایک ہونہار سپاہی ہے اور میں اُسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں"۔

صالح نے ایسا محسوس کیا کہ سلیمان اُس کی دُکھتی رگ پر نشتر چبھو رہا ہے۔ وہ بولا "آپ مجھے زیادہ شرمندہ نہ کریں۔ اُس وقت تلوار پر میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط نہ تھی اور یہ بات میرے وہم میں بھی نہ تھی کہ وہ میری لاپروائی سے فائدہ اُٹھائے گا"۔

سلیمان نے کہا "اپنے مدِمقابل کو کمزور سمجھنے والا سپاہی ہمیشہ مات کھاتا ہے۔ خیر یہ تمہارے لئے اچھا سبق تھا۔ اچھا یہ بتاؤ، آج ہمارے مقابلے میں کوئی آئے گا یا نہیں؟"

صالح نے جواب دیا "مجھے یہ توقع نہیں کہ کوئی آپ کے مقابلے کی جرأت کرے گا۔ گزشتہ سال نیزہ بازی میں تمام نامور سپاہی آپ کے کمال کا اعتراف کر چکے ہیں"۔

"لیکن امیرالمؤمنین مجھ پر خوش نہ تھے"۔

"اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ اُن کے بھائی ہیں اور وہ یہ جانتے ہیں کہ آپ کی ناموری اور شہرت اُن کے بیٹے کی ولیعہدی کے راستے میں رُکاوٹ ہو گی لیکن لوگوں کے دلوں میں جو جگہ آپ پیدا کر چکے ہیں۔ وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتی"۔

سلیمان نے کہا "لیکن میری راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ حجاج بن یوسف ہے۔ وہ عراق میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اِس

بات کی کوشش میں ہے کہ میرے بھائی کے بعد میرا بھتیجا مسندِ خلافت پر بیٹھے"۔

صالح نے کہا: "خدا میرے بھائی کے قاتل کو غارت کرے۔ مجھے یقین ہے کہ اُس کی یہ خواہش کبھی پُوری نہ ہو گی۔ لوگوں کے دلوں پر اثر ڈالنے کے لئے جو خوبیاں آپ میں ہیں وہ نہ آپ کے بھائی میں ہیں نہ کسی اور میں آپ گزشتہ سال فنونِ حرب کی نمائش میں نام پیدا کر کے اپنا راستہ صاف کر چکے ہیں۔ رائے عامہ خلافت کے معاملے میں آپ کی حق تلفی گوارا نہ کرے گی"۔

ایک غلام نے آ کر اطلاع دی کہ گھوڑے تیار ہیں۔ اور صالح نے کہا: "ہمیں چلنا چاہیے۔ نمائش شروع ہونے والی ہے"۔

سپاہی اور شہزادہ

(۱)

زمانۂ جاہلیت میں بھی عرب تیراندازی شمشیرزنی اور شاہسواری میں غیر معمولی مہارت حاصل کرنا اپنی زندگی کا اہم ترین فریضہ سمجھتے تھے۔ سرداری، عزت، شہرت اور ناموری کا سب سے بڑا معیار یہی تھا۔ صحرانشینوں کی محفل میں سب سے بڑا شاعر اُسے تسلیم کیا جاتا تھا جو تیروں کی سنسناہٹ اور تلواروں کی جھنکار کا بہترین تصوّر پیش کرسکتا ہو۔ جسے اپنے صبارفتار گھوڑے کے سُموں کی آواز کسی صحرائی دوشیزہ کے قہقہوں سے زیادہ متاثر کرتی ہو۔ جس کے لئے دُور سے محبوبہ کے محمل اور گردوغبار میں اڑتے ہوئے شاہسوار کی جھلک یکساں طور پر جاذب نگاہ ہو"

اسلام نے عربوں کی انفرادی شجاعت کو صالحین کی ناقابلِ تسخیر قوت میں تبدیل کردیا۔ روم و ایران کی جنگوں کے ساتھ ساتھ عربوں کے فنونِ حرب میں اضافہ ہوتا گیا۔ خالدِاعظم کے زمانے میں صف بندی اور نقل و حرکت کے پُرانے طریقوں میں کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ عربوں میں زرہ پہننے کا رواج پہلے بھی تھا۔ لیکن روم کی جنگوں کے دوران میں زرہیں اور خود سپاہیانہ لباس

کے اہم ترین جزو بن گئے۔

قلعہ بند شہروں کے طویل محاصروں کے دوران میں کسی ایسے آلے کی ضرورت محسوس کی جو پتھر کی مضبوط دیواروں کو توڑ سکتا ہو۔ اور اس ضرورت کا احساس منجنیق کی ایجاد کا باعث ہوا۔ یہ ایک لکڑی کا آلہ تھا جس سے بھاری پتھر کافی دور پھینکے جا سکتے تھے۔ اس کی بدولت حملہ آور افواج قلعہ بند تیر اندازوں کی زد سے محفوظ رہ کر شہر پناہ پر پتھر برسا سکتی تھیں۔ اس کا تخیل کمان سے اخذ کیا گیا تھا۔ لیکن چند سالوں میں آلاتِ حرب کے ماہرین کی کوشش نے اُسے ایک نہایت اہم آلہ بنا دیا تھا۔

قلعہ بند شہروں کی تسخیر کے لئے دُوسری چیز جسے عربوں نے بہت زیادہ رواج دیا، دبابہ تھی، یہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا قلعہ تھا جس کے نیچے پہیے لگائے جاتے تھے۔ چند سپاہی لکڑی کے تختوں کی آڑ میں بیٹھ جاتے اور چند اُسے دھکیل کر شہر کی فصیل کے ساتھ لگا دیتے۔ پیادہ سپاہی اس کی پناہ میں آگے بڑھتے اور اس سے سیڑھی کا کام لے کر فصیل پر جا چڑھتے۔

کھُلے میدان میں پیادہ فوج کی طرح عرب سوار بھی ابتدا میں تلوار کو نیزے پر ترجیح دینے کے عادی تھے۔ لیکن آہن پوش سپاہیوں کے مقابلے میں اُنھوں نے نیزے کی اہمیت کو زیادہ محسوس کیا اور چند سالوں میں عرب کے طول و عرض میں تیر اندازی اور تیغ زنی کی طرح نیزہ بازی کا رواج بھی عام ہو گیا۔ شام کے مسلمان روم کی قربت کی وجہ سے زیادہ متاثر تھے اور یہاں نیزہ بازی کو آہستہ آہستہ تیغ زنی پر ترجیح دی جانے لگی تھی۔

عرب گھوڑے اور سوار دُنیا بھر میں مشہور تھے۔ اِس لئے دُوسرے فنون کی طرح نیزہ بازی میں بھی وہ ہمسایہ ممالک پر سبقت لے گئے۔

(۲)

دمشق کے باہر ایک کھُلے میدان میں قریباً ہر روز نیزہ بازی کی مشق کی جاتی تھی۔ نیزہ بازی میں یونان کا قدیم رواج مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔

ہمّت آزمائی کرنے والے زرہ پوش شاہسوار کچھ فاصلے پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے خطرہ سے بچنے کے لئے زرہ، خود اور چار آئینہ کے استعمال کے باوجود اصلی نیزوں کے علاوہ ایسے نیزے استعمال کئے جاتے جن کے پھل لوہے کے نہ ہوں اور اگلا سرا تیز ہونے کی بجائے کند ہو۔ ثالث درمیان میں جھنڈی لے کر کھڑا ہو جاتا اور اُس کے اشارے پر دو سوار گھوڑوں کو پوری رفتار سے دوڑاتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے۔ جو سوار اپنے مدِمقابل کے نیزے کی زد سے بچ کر اُسے ضرب لگانے میں کامیاب ہوتا وہ بازی جیت جاتا۔ مات کھانے والا سوار کُند نیزے کی ضرب سے زخمی تو نہ ہوتا لیکن اکثر اوقات سینے میں چوٹ لگنے یا مدِمقابل کے نیزے کے دباؤ کی وجہ سے وہ توازن کھو کر گھوڑے سے گر پڑتا اور تماشائیوں کے لئے سامانِ تضحیک بن جاتا۔

اِس سال حسبِ معمول فنونِ حرب کی سالانہ نمائش میں حصّہ لینے کے لئے کئی لوگ دُور دُور سے آئے تھے۔ ایک وسیع میدان کے چاروں اطراف تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ ولید بن عبدالملک ایک کُرسی

پر رونق افروز تھا۔ اُس کے دائیں بائیں دربارِ خلافت کے بڑے بڑے عہدہ دار بیٹھے تھے۔ دوسری طرف تماشائیوں کی قطار کے آگے سلیمان بن عبدالملک اپنے چند عقیدت مندوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ نمائش شروع ہوئی۔ اسلحہ جات کے ماہرین نے منجنیق اور دبابوں کے جدید نمونے پیش کر کے انعامات حاصل کئے۔ تیر اندازوں اور شمشیر زنی کے ماہرین نے اپنے کمالات دکھائے اور تماشائیوں سے داد و تحسین حاصل کی۔

سلیمان کے تین ساتھی تلوار اور تیر اندازی کے مقابلے میں شریک ہوئے اور اُن میں سے ایک دوسرے درجے کا بہترین تیر انداز مانا گیا۔ اُس کا دُوسرا ساتھی صالح تلوار کے مقابلے میں یکے بعد دیگرے دمشق کے پانچ مشہور پہلوانوں کو نیچا دکھا کر اس بات کا منتظر تھا کہ امیرالمومنین اسے بُلا کر اپنے قریب کُرسی دیں گے۔ لیکن ایک نوجوان نے اچانک میدان میں آکر اُسے مقابلے کی دعوت دی۔ اور ایک طویل اور سخت مقابلے کے بعد اُس کی تلوار چھین لی۔

یہ نوجوان زبیر تھا۔ تماشائی آگے بڑھ بڑھ کر صالح کو مغلوب کرنے والے نوجوان کی صُورت دیکھنے اور اُس سے مصافحہ کرنے میں گرمجوشی دِکھا رہے تھے۔ اور صالح غصے اور ندامت کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ ولید اُٹھ کر آگے بڑھا۔ اور زبیر سے مصافحہ کرتے ہوئے اُسے مبارکباد دی اور پھر صالح کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "صالح! تم اگر غصے میں نہ آجاتے تو شاید مغلوب نہ ہوتے۔ بہرصُورت مَیں اِس نوجوان کی طرح

تمہیں بھی انعام کا حق دار سمجھتا ہوں"۔

سب سے آخر میں نیزہ بازی شروع ہوئی۔ کئی مقابلوں کے بعد آٹھ بہترین نیزہ باز منتخب کئے گئے۔ اور آخری مقابلہ شروع ہوا۔ جُوں جُوں مقابلہ کرنے والوں کی تعداد گھٹتی جاتی تھی۔ داد و تحسین میں گلا پھاڑنے والے تماشائیوں کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ بالآخر ایک طرف ایک اور دوسری طرف دو نیزہ باز رہ گئے۔ تنہا رہ جانے والے سوار نے یکے بعد دیگرے اپنے دونوں مخالفین کو گرا کر اپنا خود اُتارا اور عوام اُسے پہچان کر زیادہ جوش و خروش کے ساتھ تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرنے لگے۔ یہ نوجوان ایک یونانی نومسلم تھا اور اس کا نام ایوب تھا۔ ایوب نے فاتحانہ انداز میں اپنا نیزہ بلند کرتے ہوئے اکھاڑے میں چاروں طرف ایک چکر لگایا اور اُس کے بعد پھر میدان میں آ کھڑا ہوا۔

نقیب نے آواز دی "کوئی ایسا ہے جو اس نوجوان کے مقابلے میں آنا چاہتا ہے؟"

عوام کی نگاہیں سلیمان بن عبدالملک پر مرکوز ہو چکی تھیں۔ سلیمان نے سر پر خود رکھتے ہوئے اُٹھ کر ایک حبشی غلام کی طرف اشارہ کیا جو پاس ہی ایک خوبصورت مشکی گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ غلام نے گھوڑا آگے کیا اور سلیمان اُس پر سوار ہو گیا۔ سورج کی روشنی میں سلیمان کی زرہ چمک رہی تھی اور ہلکی ہلکی ہوا میں اُس کے یونانی وضع کے خود کے اُوپر سبز ریشم کے تاروں کا پھندنا لہرا رہا تھا۔

سلیمان اور ایوب ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور عوام دم بخود ہو کر ثالث کی جھنڈی کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔ ثالث نے جھنڈی ہلائی اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ صبا رفتار گھوڑے ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ سواروں نے ایک دوسرے کے قریب پہنچ کر خود بچنے اور دوسرے کو ضرب لگانے کی کوشش کی۔ سلیمان مقابلے میں آنے سے پہلے اپنے مدِ مقابل کے تمام داؤ دیکھ کر اُن سے بچنے کے طریقے سوچ چکا تھا۔ چنانچہ ایوب کا وار خالی گیا اور سلیمان کا نیزہ اُس کے خود پر ایک کاری ضرب کا نشان چھوڑ گیا۔

ثالث نے سلیمان کی فتح کا اعلان کیا۔ ولید نے اُٹھ کر اپنے بھائی کو مبارکباد دی اور ایوب کی حوصلہ افزائی کی۔

سلیمان نے خود اُتار کر فاتحانہ انداز میں تماشائیوں کی طرف نگاہ دوڑائی اور حسبِ معمول اکھاڑے کا چکر لگا کر پھر میدان میں آکھڑا ہوا۔

(۳)

نقیب نے تین بار آواز دی "کوئی ہے جس میں سلیمان بن عبدالملک کے مقابلے کی ہمت ہے؟" لیکن لوگوں کو اس سے پہلے ہی یقین ہو چکا تھا کہ اب کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اور وہ امیر المؤمنین کے اُٹھنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب سفید گھوڑے پر ایک سوار نیزہ ہاتھ میں لئے میدان میں آکھڑا ہوا۔ تماشائیوں کو حیرانی اِس بات پر نہ تھی کہ ایک نیزہ باز سلیمان بن عبدالملک کو مقابلے کی دعوت

دے رہا تھا۔ بلکہ وہ اِس بات پر ششدر تھے کہ اجنبی سوار کے جسم پر نہ زرہ تھی اور نہ چار آئینہ۔ وہ سیاہ رنگ کا چُست لباس پہنے ہوئے تھا۔ سر پر خود کی بجائے سفید عمامہ تھا۔ اور آنکھوں کے سوا باقی چہرے پر سیاہ نقاب تھا۔

زرہ کے بغیر صرف وہ لوگ ایسے مقابلوں میں حصّہ لیتے تھے جنہیں اپنے حریف کی کمتری کا پُورا پورا یقین ہو۔ لیکن سلیمان اس دن کا ہیرو تھا اور لوگ سلیمان کے مقابلہ کے لئے زرہ اور خود کے بغیر میدان میں آنے والے سوار کی بہادری سے متأثر ہونے کی بجائے اُس کی دماغی حالت کے صحیح ہونے پر شک کر رہے تھے۔

ولید اور زبیر کے سوا کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے لیکن اُس کی اِس جراٴت پر ولید بھی پریشان تھا۔ اُس نے آہستہ سے زبیر کے کان میں کہا "یہ محمد بن قاسم ہے یا کوئی اور؟"

زبیر نے جواب دیا "یہ وہی ہے۔"

"لیکن وہ سلیمان کو کیا سمجھتا ہے۔ اگر اُس کی پسلیاں لوہے کی نہیں تو مجھے ڈر ہے کہ لکڑی کا کندسرا بھی اُس کے لئے نیزے کی تیز نوک سے کم خطرناک ثابت نہ ہوگا۔ تم جاؤ اور اُسے جا کر سمجھاؤ۔"

زبیر نے جواب دیا "امیرالمؤمنین مَیں اُسے بہت سمجھا چکا ہوں، وہ خود بھی اِس خطرے کو محسوس کرتا ہے۔ لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ اِس صورت میں اگر اُس کی جیت ہوئی تو نوجوانوں پر اس کا خوشگوار اثر پڑے گا۔

اور اُسے سندھ کے حالات بتا کر اُنہیں جہاد کے لئے آمادہ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اُس کا یہ بھی خیال ہے کہ زرہ کے بغیر سوار زیادہ چُست رہ سکتا ہے۔"

زبیر کا جواب ولید کو مطمئن نہ کرسکا۔ وہ خود اُٹھ کر محمد بن قاسم کی طرف بڑھا اور تماشائی زیادہ پریشانی کا اظہار کرنے لگے۔

محمد بن قاسم سلیمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ولید نے قریب پہنچتے ہی آواز دے کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا "برخوردار! مجھے تمہاری شجاعت کا اعتراف ہے۔ لیکن یہ شجاعت نہیں نادانی ہے۔ تم زرہ اور خود کے بغیر عرب کے بہترین نیزہ باز کے مقابلہ میں جا رہے ہو۔ اور اگر اُس نے اسے اپنی تضحیک سمجھا تو مجھے ڈر ہے کہ تم دوبارہ گھوڑے پر سوار ہونے کے قابل نہیں رہو گے۔"

محمد بن قاسم نے جواب دیا "امیر المؤمنین خدا جانتا ہے، کہ مجھے اپنی نمائش مقصود نہیں۔ مَیں یہ خطرہ ایک نیک مقصد کے لئے قبول کر رہا ہوں اور یہ کوئی بہت بڑا خطرہ بھی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ زرہ پہن کر سوار چُست نہیں رہتا۔"

"لیکن اگر تمہاری چُستی تمہاری پسلیاں نہ بچا سکی تو؟"

"تو بھی مجھے افسوس نہ ہوگا۔ مجھے اپنی پسلیوں سے زیادہ اُس لڑکی کا خیال ہے جس کے سینے میں ہمارے بے رحم دشمن کے تیر کا زخم ناسُور بن چکا ہے۔ اگر خدا کو اُس کی مدد منظور ہے تو مجھے یقین ہے کہ وُہ آج

مجھے دمشق کے لوگوں کے سامنے سامانِ تضحیک نہ بننے دے گا۔ اور ممکن ہے کہ میں بازی جیتنے کے بعد اس ہجوم میں اُس کا پیغام پڑھ کر سُنا سکوں۔ انفرادی تبلیغ سے جو کام ہم مہینوں میں کر سکتے ہیں، وہ ایک آن میں ہو جائے گا۔ آپ مجھے اجازت دیجئے اور دُعا کیجئے، کہ خدا میری مدد کرے۔"

ولید نے کہا۔ "لیکن تم کم از کم سر پر خود تو رکھ لیتے۔"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "آپ بُرا نہ مانیں۔ جو سپاہی نیزے کا وار سر پر روکتا ہے۔ اُس کے متعلق میں بہت بُری رائے دوں گا۔ میرے سر کی حفاظت کے لئے یہ عمامہ کافی ہے۔"

ولید نے کہا۔ "بیٹا! اگر آج تم سلیمان پر سبقت لے گئے تو انشاء اللہ سندھ پر حملہ کرنے والی فوج کا جھنڈا تمہارے ہاتھ میں ہو گا۔"

ولید واپس مُڑا اور راستے میں نقیب کو کچھ سمجھانے کے بعد اپنی کُرسی پر بیٹھ گیا۔

دوسری طرف سلیمان کے گرد چند تماشائی کھڑے تھے۔ صالح نے آگے بڑھ کر سلیمان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "امیر المومنین آپ کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ آپ ہوشیاری سے کام لیں۔"

سلیمان نے پُوچھا۔ "لیکن وہ سر پھرا ہے کون؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ لیکن وہ کوئی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پھر گھوڑے پر سوار نہ ہو گا۔"

نقیب نے آواز دی ”حاضرین! اب سلیمان بن عبدالملک اور محمد بن قاسم کا مقابلہ ہوگا۔ سیاہ پوش نوجوان کی عمر سترہ سال سے کم ہے۔“

تماشائی اور زیادہ حیران ہو کر سیاہ پوش سوار کی طرف دیکھنے لگے۔ ثالث نے جھنڈی ہلائی اور نیزہ باز پوری رفتار سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ تماشائیوں پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ دونو سوار ایک دوسرے کی زد سے بچ کر نکل گئے۔ اور عوام نے ایک پُرجوش نعرہ بلند کیا۔

کمسن اور نوجوان دیر تک محمد بن قاسم کے لئے تحسین کے نعرے بلند کرتے رہے اور عمر رسیدہ لوگ یہ کہہ رہے تھے ”یہ لڑکا بلا کا چست ہے۔ لیکن سلیمان کے ساتھ اُس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ پہلی مرتبہ سلیمان نے جان بوجھ کر اُس کی رعایت کی ہے۔ لیکن دوسری دفعہ اگر وہ بچ گیا، تو یہ ایک معجزہ ہوگا۔ کہاں سترہ سال کا چھوکرا اور کہاں سلیمان جیسا جہاندیدہ شاہسوار!“

لیکن نوجوانوں نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا سلیمان کی بجائے اب ایک سترہ سالہ اجنبی اُن کا ہیرو بن چکا تھا۔ وہ کسی کی زبان سے ایک حرف بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بعض تماشائی تکرار سے ہاتھا پائی تک اُتر آئے۔

رواج کے مطابق نیزہ بازوں کو دوسرا موقع دیا گیا۔ اور دونو پھر ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ بچے اور نوجوان بھاگ بھاگ کر اُس طرف جا رہے تھے جس طرف اُن کا کمسن ہیرو کھڑا تھا۔ سب

کی نگاہیں نقاب میں چھپے ہوئے چہرے کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھیں۔ ثالث نے بھاگ کر لوگوں کو پیچھے ہٹایا اور پھر اپنی جگہ پر آکھڑا ہُوا۔ جھنڈی کے اشارے کے بعد تماشائیوں کو پھر ایک بار میدان میں گرد اُڑتی ہوئی نظر آئی۔ تھوڑی دیر کے لئے پھر ایک بار سکوت چھا گیا۔

محمد بن قاسم پھر اچانک ایک طرف جھک کر سلیمان کے نیزے کی ضرب سے بچ گیا۔ سلیمان نے بھی بائیں طرف جھک کر اپنے مدِ مقابل کے وار سے بچنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس سے کہیں زیادہ پھُرتی کے ساتھ محمد بن قاسم نے اپنے نیزے کا رُخ بدل دیا۔ اور اُس کی دائیں پسلی میں ضرب لگا کر اُسے اور زیادہ بائیں طرف دھکیل دیا۔ سلیمان لڑکھڑا کر نیچے گرنے کے بعد فوراً اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور پسلی پر ہاتھ رکھ کر انتہائی بیچارگی کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چاروں طرف سے فلک شگاف نعروں کی صدا آرہی تھی۔ محمد بن قاسم نے تھوڑی دُور جا کر اپنے گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ اور سلیمان کے قریب آکر نیچے اُترتے ہوئے مصافحہ کے لئے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن سلیمان مصافحہ کرنے کی بجائے مُنہ پھیر کر تیزی سے قدم اُٹھاتا ہُوا ایک طرف نکل گیا۔ آن کی آن میں تماشائی ہزاروں کی تعداد میں محمد بن قاسم کے گرد جمع ہو گئے۔ یونانی شہسوار ایوب نے آگے بڑھ کر محمد بن قاسم کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا۔ "میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اب اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو آپ چہرے سے نقاب اُتار دیجئے۔ ہم سب کی آنکھیں آپ کی صُورت

دیکھنے کے لئے بیقرار ہیں" ۔

(۳۴)

محمد بن قاسم نے نقاب اُتار ڈالا۔ کم سن شاہسوار کا چہرہ لوگوں کی توقع سے کہیں زیادہ متین اور سنجیدہ تھا۔ اُس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں سے شوخی کی بجائے معصومیت ٹپکتی تھی۔ لوگوں کے نعروں اور پُر اشتیاق نگاہوں کے جواب میں اُس کا سکون یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اُسے بڑی سے بڑی فتح بھی متأثر نہیں کر سکتی۔ جو نوجوان اُسے اپنے کندھوں پر اُٹھا کر دمشق کی گلیوں میں اُس کا شاندار جلوس نکالنے کے ارادے سے بڑھے تھے، دم بخود ہو کر اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایوب نے اپنے ایک عرب دوست سے کہا۔ "میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے یُونان کے مجسموں میں بھی کوئی صُورت بیک وقت اِس قدر خوبصورت، معصوم، سادہ اور بارعب نہیں دیکھی"۔

ایک عرب نے پُوچھا۔ "آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "بصرہ سے"۔

اِس پر کئی لوگ یہ اصرار کرنے لگے کہ آپ ہمارے ہاں ٹھہریئے۔

محمد بن قاسم نے سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "میں دمشق کے لوگوں کے پاس ایک ضروری پیغام لے کر آیا ہوں اور مجھے جلد واپس جانا ہے۔ اگر آپ سب خاموشی سے میرا پیغام سُن لیں تو یہ مجھ پر بہت بڑی عنایت ہوگی"۔

لوگ اب بہت زیادہ تعداد میں محمد بن قاسم کے گرد جمع ہو رہے تھے ولید بن عبدالملک عہدہ داروں کی جماعت کے ہمراہ آگے بڑھا۔ لوگ امیر المؤمنین کو دیکھ کر ادھر اُدھر ہٹ گئے۔ ولید نے محمد بن قاسم کے قریب پہنچ کر کہا: "میرے خیال میں یہ تمہارے لئے بہترین موقع ہے۔ تم گھوڑے پر سوار ہو جاؤ، تاکہ سب لوگ تمہاری صورت دیکھ سکیں۔"

محمد بن قاسم گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ مجمع میں کانوں کان ایک سے دُوسرے سرے تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ یہ سیاہ پوش نوجوان کوئی اہم پیغام سُنانا چاہتا ہے اور وہ لوگ جو اگلی قطاروں میں تھے یکے بعد دیگرے زمین پر بیٹھ رہے تھے۔

محمد بن قاسم نے مختصر الفاظ میں سراندیپ کی مسلمان بیواؤں اور یتیم بچوں کی المناک داستان بیان کی۔ اُس کے بعد زبیر سے رومال لے کر ناہید کا مکتوب پڑھ کر سُنایا۔ بیواؤں اور یتیم بچوں کی سرگزشت سُننے کے بعد عوام کے دلوں پر ناہید کے مکتوب کے الفاظ تیر و نشتر کا کام کر رہے تھے۔ مکتوب سُنانے کے بعد محمد بن قاسم نے رومال زبیر کو واپس دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا:۔

"فدایانِ اسلام! میں تم میں سے اکثر کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا ہوں۔ لیکن یاد رکھو! ستم رسیدہ انسانیت کے دامن پر ظلم کی سیاہی کے دھبے آنسوؤں سے نہیں، خون سے دھوئے جاتے ہیں۔ جبر و استبداد کی جو

آگ سندھ کے وسیع ملک میں سُلگ رہی ہے۔ ہم نے دُور
سے اُس کی ہلکی سی آنچ محسوس کی ہے۔ اور وُہ اِس لئے
کہ ہمارے چند بھائی، چند مائیں اور چند بہنیں اس
آتشکدہ میں جل رہی ہیں۔ لیکن ہمیں اُن لاکھوں
بے کسوں کا حال معلوم نہیں، جو مُدّت سے سندھ
کے استبدادی نظام کی زنجیروں میں جکڑے
ہوئے ہیں۔ یہ تیر جو ایک مسلمان لڑکی کے جسم میں
پیوست ہُوا۔ اُن لاکھوں تیروں میں سے ایک تھا جن
کی مشق سندھ کا مغرور اور جابر حکمران اپنی بے کس رعایا کے
سینوں پر کرتا ہے۔ آج سندھ میں اگر ہماری بہنیں اور
بھائی قید خانے کی تاریک کوٹھڑی میں مجاہدین اسلام
کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آہٹ سننے کے منتظر ہیں۔ آج
اگر وُہ اللہ اکبر کے اُن نعروں کا انتظار کر رہے ہیں۔ جن
میں اب بھی دیبل کے قلعے کی مضبوط دیواروں پر زلزلہ
طاری کر دینے کی قوت موجود ہے۔ تو مجھے یقین ہے کہ
سندھ کے عوام جو برسوں سے ظلم و استبداد کی آگ میں
جل رہے ہیں۔ افق مغرب سے رحمت کی اُن گھٹاؤں کے
منتظر ہیں جو آج سے کئی برس پہلے آتشکدۂ ایران کو ٹھنڈا
کر چکی ہیں۔ اُن کے مجروح سینوں سے یہ آواز نکل رہی

ہے کہ اے کاش! وہ مجاہدین جنہوں نے اپنے خون سے باغ آدم میں مساوات، عدل، انصاف اور امن کے پودے کی آبیاری کی ہے۔ سندھ کے حکمران کے ہاتھوں سے ظلم کی تلوار چھین لیں۔ اور اُن کے گھوڑے ان خار دار جھاڑیوں کو مسل ڈالیں جن کے ساتھ انسانیت اور آزادی کا دامن اُلجھا ہوا ہے۔

مسلمانو! یہ خبر ہمارے لئے بُری بھی ہے۔ اور اچھی بھی۔ بُری اِس لئے کہ ہمیں اپنے بھائیوں اور بہنوں کا حال سُن کر دُکھ ہوا۔ اور اچھی اِس لئے کہ حق و صداقت کی تلوار کے سامنے قیصر اور کسریٰ کی طرح ایک اور مغرور سر اُٹھا ہے۔ آؤ اُسے یہ بتا دیں کہ ہماری تلواریں کُند نہیں ہوئیں۔

گزشتہ چند برسوں میں ہمارے اندرونی خلفشار نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ وہ سلطنتیں جو ہمارے آبا و اجداد کے نام سے تھراتی تھیں، آج ہمارے خلاف اعلانِ جنگ کر رہی ہیں۔ ایک مظلوم لڑکی کا یہ خط اگر تمہاری رگوں میں حرارت پیدا نہ کر سکا، تو یاد رکھو! روئے زمین پر ہماری عظمت اور عروج کے دِن گِنے جا چُکے ہیں۔ لیکن مَیں مایوس نہیں مَیں

تم میں سے کسی کے چہرے پر بھی مایوسی نہیں دیکھتا میں
صرف یہ کہوں گا کہ ایک شجاع قوم غفلت کی نیند سو رہی ہے
اور اُس قوم کی ایک غیور بیٹی بلند آواز میں یہ کہہ رہی ہے
کہ اسلام کے غیور بیٹو! تم تو روئے زمین کی ہر بہو بیٹی کی
عصمت کی حفاظت کے لئے پیدا ہوئے تھے، اور آج
تمہاری یہ حالت کہ تمہاری اپنی بہو بیٹیوں کو پا بہ زنجیر
برہمن آباد کے بازاروں میں کھینچا جا رہا ہے۔"

عوام جذبات سے مغلوب ہو کر ولید بن عبدالملک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک معمر شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اگر ہم سے پہلے یہ خبر امیر المومنین تک پہنچ چکی ہے تو ہم حیران ہیں کہ اُنہوں نے ابھی تک سندھ کے خلاف اعلانِ جہاد کیوں نہیں کیا؟" ہجوم آتش فشاں پہاڑ کی طرح بھڑ اُٹھا تھا۔ چاروں اطراف "جہاد" "جہاد" کے فلک شگاف نعرے گونجنے لگے۔ محمد بن قاسم نے دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے لوگوں کو خاموش کیا اور پھر اپنی تقریر شروع کی:۔

"میرے مخاطب وہ لوگ نہیں جو ایک ہنگامی جوش کے
ماتحت چند نعرے لگا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ زندہ
قومیں نعرے بلند کرنے سے پہلے اپنی تلواریں بے نیام
کر کے میدان میں کودتی ہیں۔ تم دمشق میں چند نعرے
لگا کر ان نگاہوں کی تشفی نہیں کر سکتے۔ جو یہاں سے

ہزاروں میل دُور تمہاری تلواروں کی چمک دیکھنے کے لیئے بیقرار ہیں۔ امیر المؤمنین کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔ لیکن اُنہوں نے ابھی تک تمہارے نعرے سُنے ہیں۔ کاش اِن نعروں کے ساتھ وہ تلواریں بھی نیام باہر آنے کے لئے بے قرار ہوتیں۔ جن کی نوک کے ساتھ تمہارے آبا و اجداد سطوتِ اسلام کی داستان لکھ گئے ہیں۔ مَیں دیکھنا چاہتا ہوں کہ قادسیہ اور اجنادین کے مجاہدوں کی اولاد میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہے یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری تمام افواج ترکستان اور افریقہ کے میدانوں میں مصروفِ پیکار ہیں۔ لیکن تم میں سے کون ایسا ہے جو تلوار کا استعمال نہیں جانتا؟ اگر تم ہمت کرو تو ہم سندھ کے میدانوں میں یرموک اور دمشق کی یادگاریں پھر زندہ کر سکتے ہیں۔ آج تم کو اپنے آبا و اجداد کی طرح یہ ثابت کرنا ہے کہ ضرورت کے وقت ہر مسلمان سپاہی بن سکتا ہے اب تمہاری کی تلواریں دیکھ کر مَیں امیر المؤمنین سے اعلان جہاد کی درخواست کرتا ہوں"۔

محمد بن قاسم گھوڑے سے اُتر پڑا۔ اُس کی تقریر کے اختتام تک کئی بوڑھے اور نوجوان تلواریں بلند کر چکے تھے۔ ایک دس سال کا

لڑکا سخت جدوجہد کے بعد لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور ولید کے قریب جا کر بولا "امیرالمومنین کیا مجھے بھی جہاد پر جانے کی اجازت ہو گی؟ مجھے معلوم نہ تھا ورنہ مَیں تلوار لے کر آتا۔ لیکن میں ابھی لے آتا ہوں۔ آپ انہیں تھوڑی دیر روکیں۔"

ولید نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تمہیں ابھی چند سال اور انتظار کرنا پڑے گا۔"

لڑکا دل برداشتہ سا ہو کر محمد بن قاسم کے قریب آ کھڑا ہوا۔ ولید کے اشارے پر ایک شخص ایک کرسی اُٹھا لایا۔ اور اُس نے کرسی پر کھڑے ہو کر کہا "اس نوجوان کی تقریر کے بعد مجھے کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہاری غیرت زندہ ہے۔ میں سندھ کے خلاف اعلانِ جہاد کرتا ہوں۔"

ہجوم نے پھر ایک بار نعرے بلند کئے۔ ولید نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر دمشق کی فوج بصرہ روانہ ہو جائے۔ وہاں اگر محمد بن قاسم جیسے چند اور نوجوان موجود ہیں تو مجھے یقین ہے کہ کوفہ اور بصرہ سے بھی سپاہیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہو جائے گی۔ آپ میں سے جن لوگوں کے پاس گھوڑے نہیں، اُن کے لئے گھوڑوں اور جن کے پاس اسلحہ جات نہیں، اُن کے لئے اسلحہ جات کا انتظام کیا جائے گا۔ مَیں جو اہم ترین خبر آپ کو سُنانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ مَیں محمد بن قاسم

کو سندھ پر حملہ کرنے والی افواج کا سپہ سالار مقرر کرتا ہوں۔ میں نے اس ہونہار مجاہد کے لئے عماد الدین کا لقب تجویز کیا ہے۔ آپ دُعا کریں کہ یہ صحیح معنوں میں عماد الدین ثابت ہو۔"

(۵)

رات کے تیسرے پہر محمد بن قاسم دمشق کی جامع مسجد میں نمازِ تہجد ادا کرنے کے بعد، ہاتھ اُٹھا کر انتہائی سوز و گداز کے ساتھ یہ دُعا کر رہا تھا۔

"یا رب العٰلمین! میرے نحیف کندھوں پر ایک بھاری بوجھ آ پڑا ہے۔ مجھے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی توفیق دے۔ اور میرا ساتھ دینے والوں کو اُن کے آباو اجداد کا عزم اور استقلال عطا کر۔ حشر کے دن فدایانِ رسول کی جماعت کے سامنے میری نگاہیں شرمسار نہ ہوں۔ مجھے خالد کا عزم اور مثنیٰ کا ایثار عطا کر۔ میری زندگی کا ہر لمحہ تیرے دین کی خوشنودی کے لئے وقف ہو۔"

اس دُعا کے اختتام پر زبیر کے علاوہ ایک اور شخص نے بھی جو محمد بن قاسم کے دائیں ہاتھ بیٹھا ہوا تھا، آمین کہی، اور یہ دونوں اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس کے سادہ لباس اور نورانی صورت میں غیر معمولی جاذبیت تھی۔ وہ کھسک کر محمد بن قاسم کے قریب ہو بیٹھا۔ اور اُس کی طرف محبّت اور پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم محمد بن قاسم ہو؟"

"جی ہاں اور آپ؟"

"میں عمر بن عبدالعزیز ہوں"۔

محمد بن قاسم، عمر بن عبدالعزیزؓ کی بزرگی اور پاکیزگی کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا۔ اُس نے عقیدت مندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے لئے دُعا کریں"۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے فرمایا "خدا تمہارے نیک ارادے پُورے کرے"۔

محمد بن قاسم نے کہا "ایک مُدت سے میرا ارادہ تھا کہ آپ سے نیاز حاصل کروں۔ آج آپ کی ملاقات کو تائیدِ غیبی سمجھتا ہوں۔ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں"۔

عمر بن عبدالعزیز نے کہا "میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ تمہارے جیسے بہادر اور ہونہار سپہ سالار کی قیادت میں انشاءاللہ دشمن کے خلاف تلوار کی مہم جلد ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر تم سندھ میں جہاد کا صحیح جذبہ لے کر جا رہے ہو تو تمہیں وہاں اپنے کردار اور اخلاق سے یہ ثابت کرنا ہو گا کہ تم سندھ کے لوگوں کو غلام بنانے کے لئے نہیں۔ بلکہ انہیں نظامِ باطل کی زنجیروں سے آزاد کر کے سلامتی کا راستہ دکھانے کے لئے آئے ہو۔ تم انہیں یہ بتانا کہ دائرۂ توحید میں قدم رکھنے والا ہر انسان دُنیا کی ہر غلامی سے آزاد ہو سکتا ہے۔ تم ایک ایسے مُلک میں جا رہے ہو، جس میں نیچ ذات کے لوگ اپنے اُوپر اُونچی ذات والوں کے جبر و اختیار کا پیدائشی حق تسلیم کرتے ہیں۔ سندھ کے استبدادی

نظام کی جڑیں کٹ جانے کے بعد اگر تم لوگوں کے سامنے اسلامی مساوات کا صحیح نقشہ پیش کر سکے تو مجھے یقین ہے کہ تم اُن کے قلوب پر بھی فتح پا سکو گے جو آج تمہارے دشمن ہیں کل تمہارے دوست ہوں گے۔

مسلمان بیواؤں اور یتیموں پر سندھ کے حکمران کے مظالم کی داستان سُن کر بعض نوجوان صرف جذبۂ انتقام کے ماتحت تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ لیکن اُن میں سے کسی کو گرے ہوئے دشمن پر وار کرنے کی اجازت نہ دینا۔ خدا زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ظالم کے ہاتھ سے اُس کی تلوار چھین لو، لیکن اس پر ظلم نہ کرو۔ بلکہ اگر وہ تائب ہو جائے تو اُس کی خطا معاف کر دو۔ اگر وہ دینِ الٰہی قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اُسے سینے سے لگا لو۔ اگر وہ زخموں سے نڈھال ہو کر تم سے پناہ مانگے تو تم اُس کے زخموں پر مرہم رکھو۔ ہمارے یتیموں اور بیواؤں پر ظلم ہوا ہے لیکن تم اُن کے یتیموں اور بیواؤں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھو۔ اور یہ یاد رکھو خدا ہمسایہ ممالک پر عرب قوم کا سیاسی تفوق نہیں چاہتا بلکہ کفر کے مقابلے میں اپنے دین کی فتح چاہتا ہے۔ اور یہ کام اگر عربوں کے ہاتھوں پورا ہو تو وہ دُنیا میں بھی فلاح پائیں گے اور اُن کی آخرت بھی اچھی ہو گی۔"

نمازِ صبح کی اذان سُن کر عمر بن عبدالعزیز نے اپنی تقریر ختم کی۔ نماز کے بعد محمد بن قاسم نے اُن سے رخصت ہوتے وقت کہا۔ "مجھے یہاں سے روانہ ہونے میں پانچ دن اور لگ جائیں گے۔ اِس عرصہ میں میں

آپ کے علم و فضل سے اور زیادہ مستفید ہونا اپنی خوش بختی خیال کروں گا۔ لیکن دن کا بیشتر حصّہ مجھے نئے سپاہیوں کو تربیت دینے میں صرف کرنا پڑے گا۔ اگر آپ کو کلیف نہ ہو تو رات کو کسی وقت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں۔"

عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا "تم جس وقت چاہو میرے پاس آسکتے ہو۔ کیا یہی وقت بہتر نہ ہوگا؟ تیسرے پہر تم ہر روز مجھے یہاں پاؤ گے آٹھ دس دن کے بعد میں بھی مدینہ چلا جاؤں گا۔"

محمد بن قاسم، حضرت عمر بن عبدالعزیز سے رخصت ہو کر مسجد سے باہر نکلا تو نوجوانوں کی ایک خاصی جماعت اُس کے آگے اور پیچھے تھی۔ دروازے کی سیڑھیوں پر پہنچ کر اُس نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ سب میدان میں پہنچ جائیں۔ میں بھی تھوڑی دیر میں پہنچ جاؤں گا۔"

(۶)

محمد بن قاسم کی قیام گاہ کے دروازے پر دو سپاہی گھوڑے لئے کھڑے تھے۔ محمد اور زبیر نے گھوڑوں پر سوار ہو کر سپاہیوں کے ہاتھوں سے نیزے لے لئے۔ اور گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ شہر کے مغربی دروازے سے باہر نکلنے کے بعد وہ سرسبز باغات سے گزرتے ہوئے ایک ندی کے کنارے آ کر رُکے اور گھوڑوں سے اُتر کر پانی میں کود پڑے۔ ندی کے صاف اور شفاف پانی میں تھوڑی دیر تیرنے اور غوطے لگانے کے بعد کپڑے بدل کر وہ کچھ

دیر اپنے سامنے دلکش اور سرسبز پہاڑوں کا منظر دیکھتے رہے۔ محمد بن قاسم نے اپنے ساتھی کو محویت کی حالت میں دیکھ کر کہا۔ "کل ہم بہت سویرے یہاں آئیں گے۔ اب ہمیں جانا چاہئے۔ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

زبیر نے چونک کر محمد بن قاسم کی طرف دیکھا۔ "کیا کہا آپ نے؟"

"ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

"چلئے!"

دونوں پھر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ محمد بن قاسم نے پوچھا "تم ابھی کیا سوچ رہے تھے؟"

زبیر نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "میں تصور میں سراندیپ کے سبزہ زار دیکھ رہا تھا۔"

"لیکن ہماری منزلِ مقصود تو سندھ کے ریگستان ہیں؟"

"انہیں میں ہر وقت دیکھتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی سراندیپ کے سبزہ زار بھی یاد آجاتے ہیں۔"

محمد بن قاسم نے کہا "کل تم خواب کی حالت میں ناہید کو آوازیں دے رہے تھے۔ میں نے اس کا ذکر مناسب نہ سمجھا۔ اب اگر برا نہ مانو۔ تو پوچھتا ہوں کہ خواب میں تم نے کیا دیکھا تھا؟"

زبیر نے اپنے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "مجھے خواب نظر آیا تھا کہ دیبل کے چند سپاہی میرے چاروں طرف ننگی تلواریں لئے کھڑے ہیں اور کچھ ناہید کو پکڑ کر قید خانہ کی طرف لے

جا رہے ہیں۔ میں بھاگ کر اُسے چھڑانا چاہتا ہوں۔ لیکن ننگی تلواریں میرا راستہ روک رہی ہیں۔"

محمد بن قاسم نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ناہید کی یاد کا آپ کے دل و دماغ پر گہرا اثر ہے۔"

"میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ جن حالات میں ہم ایک دوسرے سے ملے اور بچھڑے ہیں۔ اُن حالات میں شاید کوئی بھی اُس بہادر اور غیور لڑکی کو اپنے دل میں جگہ دینے سے انکار نہ کرتا۔"

ایک ہرن بھاگتا ہوا قریب سے گزر گیا۔ محمد بن قاسم نے نیزہ سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اس کی پچھلی ٹانگ زخمی ہے۔ کسی اوچھے تیر انداز نے اس پر وار کیا ہے۔ آؤ اس کا تعاقب کریں۔"

زبیر اور محمد نے ہرن کے پیچھے سرپٹ گھوڑے چھوڑ دیئے۔ زخمی ہرن زیادہ دُور تک نہ جا سکا اور محمد بن قاسم کے نیزے کی ایک ہی ضرب کے ساتھ نیچے گر پڑا۔ زبیر نے گھوڑے سے اُتر کر اُسے ذبح کیا اور پچھلی ران سے تیر نکالتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم اسے نہ دیکھتے، تو یہ کسی جھاڑی میں چھپ کر بُری طرح جان دیتا۔"

چند سوار درختوں کی آڑ سے نمودار ہوئے اور محمد بن قاسم نے اُن میں سے سلیمان کو پہچانتے ہوئے کہا۔ "ارے یہ تو ہمارے پُرانے دوست ہیں۔"

سلیمان نے قریب پہنچ کر اپنے گھوڑے کی باگ کھینچی اور کہا۔ "یہ

شکار ہمارا ہے۔"

محمد بن قاسم نے جواب دیا "آپ لے سکتے ہیں۔ ہم نے اسے صرف ایک تکلیف دہ موت سے نجات دی ہے۔ اس کی ٹانگ زخمی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ یہ جھاڑیوں میں چھُپ جائے گا۔"

صالح نے کہا "تم غلط کہتے ہو۔ ہم نے گرتے ہوئے ہرن کو ذبح کیا ہے۔"

محمد بن قاسم نے سنجیدگی سے جواب دیا "یہ صحیح ہے۔ ہرن گر پڑا تھا لیکن میرے نیزے کی ضرب سے، اور اگر تیر آپ نے چلایا تھا تو آپ اس کی ٹانگ دیکھ سکتے ہیں۔"

صالح نے غضب ناک ہو کر تلوار نکالی۔ لیکن سلیمان نے سختی سے کہا "تم اِن دونوں کے جوہر دیکھ چکے ہو۔ تمہیں اپنی تیر اندازی کے متعلق غلط فہمی تھی۔ آج وہ بھی رفع ہو گئی۔" یہ کہہ کر محمد بن قاسم سے مخاطب ہوا۔ "میرا یہ دوست جس قدر جوشیلا ہے اُسی قدر کم عقل ہے۔ آپ کو ضرورت ہو تو آپ یہ شکار لے جا سکتے ہیں۔"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "نہیں، شکریہ! اگر مجھے ضرورت ہوتی تو مَیں خود شکار کر لیتا۔"

یہ کہہ کر اُس نے زبیر کی طرف اشارہ کیا۔ اور دونوں نے باگیں موڑ کر اپنے گھوڑے سرپٹ چھوڑ دیئے۔

پہلی فتح

(۱)

صبح کی نماز کے بعد دمشق کے لوگ بازاروں اور مکانوں کی چھتوں پر کھڑے محمد بن قاسم کی فوج کا جلوس دیکھ رہے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک دور افتادہ ملک پر حملہ کرنے والی فوج کی قیادت ایک سترہ سالہ نوجوان کے سپرد تھی۔ دمشق سے لے کر بصرہ تک راستے کے ہر شہر اور ہر بستی سے کمسن لڑکے، نوجوان اور بوڑھے اس فوج میں شامل ہوتے۔ کوفہ اور بصرہ میں محمد بن قاسم کی روانگی کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اور نوجوان عورتیں اپنے شوہروں، مائیں اپنے بیٹوں، اور لڑکیاں اپنے بھائیوں کو کمسن سالار کا ساتھ دینے کے لئے تیار رہنے پر آمادہ کر رہی تھیں۔ غیور قوم کی ایک بے کس بیٹی کی فریاد بصرہ اور کوفہ کے ہر گھر میں پہنچ چکی تھی۔ بصرہ کی عورتوں میں زبیدہ کی تبلیغ کے باعث یہ جذبہ پیدا ہو چکا تھا کہ ناہید کا مسئلہ قوم کی ہر بہو بیٹی کی عزت کا مسئلہ ہے۔ نوجوان لڑکیاں مختلف محلوں

اور کوچوں سے زبیدہ کے گھر آتیں اور اُس کی تقاریر سے ایک نیا جذبہ لے کر واپس جاتیں۔ خرابیِ صحت کے باوجود محمد بن قاسم کی والدہ بصرہ کی معمر عورتوں کی ایک ٹولی کے ساتھ جہاد کی تبلیغ کے لئے ہر محلّے کی عورتوں کے پاس پہنچی۔ زبیدہ نے چند نئے سپاہیوں کو گھوڑے اور اسلحہ جات بہم پہنچانے کے لئے اپنے تمام زیورات بیچ ڈالے۔ بصرہ کے تمام امیر و غریب گھرانوں کی لڑکیوں نے اُس کی تقلید کی اور مجاہدین کی اعانت کے لئے بصرہ کے بیت المال کو چند دنوں میں سونے اور چاندی سے بھر دیا۔ عراق کے دوسرے شہروں کی خواتین نے اس کارِ خیر میں بصرہ کی عورتوں سے پیچھے رہنا گوارا نہ کیا۔ اور وہاں بھی لاکھوں روپے جمع ہو گئے۔

محمد بن قاسم نے بصرہ میں تین دِن قیام کیا۔ اُس کی آمد سے پہلے بصرہ میں حجاج بن یوسف کے پاس مکران کے گورنر محمد بن ہارون کا یہ پیغام پہنچ چکا تھا کہ عبید اللہ کی قیادت میں بیس آدمیوں کا جو وفد دیبل بھیجا گیا تھا اُس میں سے صرف دو نوجوان جان بچا کر مکران پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ باقی تمام دیبل کے گورنر نے قتل کر دیئے ہیں۔ اِس خبر نے بصرہ کے عوام میں انتقام کی سُلگتی ہوئی آگ پر تیل کا کام دیا۔

دمشق سے روانگی کے وقت محمد بن قاسم کی فوج کی تعداد کُل پانچ ہزار تھی۔ لیکن جب وہ بصرہ سے روانہ ہوا تو اُس کے لشکر کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تھی۔ جن میں سے چھ ہزار سپاہی گھوڑوں پر تھے۔ تین ہزار پیدل اور تین ہزار سامانِ رسد کے اُونٹوں کے ساتھ تھے۔

(۲)

محمد بن قاسم شیراز سے ہوتا ہوا مکران پہنچا۔ مکران کی سرحد عبور کرنے کے بعد لس بیلا کے پہاڑی علاقہ میں اُسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بھیم سنگھ بیس ہزار فوج کے ساتھ لس بیلا کے سندھی گورنر کی اعانت کے لئے پہنچ چکا تھا۔ اُس نے ایک مضبوط پہاڑی قلعے کو اپنا مرکز بنا کر تمام راستوں پر اپنے تیر انداز بٹھا دیئے۔ اپنے باپ کی مخالفت کے باوجود وہ راجہ کو اس بات کا یقین دلا چکا تھا کہ اُس کے بیس ہزار سپاہی بارہ ہزار مسلمانوں کو لس بیلا سے آگے نہیں گزرنے دیں گے۔

مسلمانوں کے پہاڑی علاقہ میں داخل ہوتے ہی بھیم سنگھ کے سپاہیوں نے اکا دکا حملے شروع کر دیئے۔ تیس چالیس سپاہیوں کا گروہ اچانک کسی ٹیلے یا پہاڑی کی چوٹی پر نمودار ہوتا اور آن کی آن میں محمد بن قاسم کی فوج کے کسی حصے پر تیر اور پتھر برسا کر غائب ہو جاتا۔ گھوڑوں کے سوار اِدھر اُدھر ہٹ کر اپنا بچاؤ کر لیتے۔ لیکن شتر سوار دستوں کے لئے یہ حملے بڑی حد تک پریشان کن ثابت ہوئے۔ بعض اوقات بدک کر اِدھر اُدھر بھاگنے والے اُونٹوں کو منظم کرنا حملہ کرنے والوں کے تعاقب سے زیادہ مشکل ہو جاتا۔

محمد بن قاسم نے یہ دیکھ کر ہراول کے پیادہ دستوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ لیکن حملہ آوروں کی ایک جماعت آگے سے کترا کر بھاگتی اور دوسری جماعت پیچھے سے حملہ کر دیتی۔ ایک گروہ کسی پہاڑی پر چڑھ کر لشکر کے

دائیں بازو کو اپنی طرف متوجہ کرتا اور دُوسرا بائیں بازو پر حملہ کر دیتا۔ جوں جوں محمد بن قاسم کی فوج آگے بڑھتی گئی۔ اِن حملوں کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا رات کے وقت پڑاؤ ڈالنے کے بعد شب خون کے ڈر سے کم از کم ایک چوتھائی فوج کو آس پاس کے ٹیلوں پر قابض ہو کر پہرہ دینا پڑتا۔

ایک شام محمد بن قاسم کو ایک جاسوس نے اطلاع دی کہ شمال کی طرف بیس کوس کے فاصلے پر ایک مضبوط قلعہ اس لشکر کا مستقر ہے۔ محمد بن قاسم نے اپنے تجربہ کار سالاروں کی ایک مجلس شوریٰ بلائی۔ بعض سالاروں کی یہ صلاح تھی کہ اس راستے کو چھوڑ کر سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ نسبتاً ہموار راستہ اختیار کیا جائے۔ ہم اس قلعے سے جس قدر دُور ہوں گے اُسی قدر اِن حملوں سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن محمد بن قاسم اُن سے متفق نہ ہوا۔ اُس نے کہا "جب تک یہ علاقہ دشمن سے پاک نہیں ہوتا، ہمارا آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہیں۔ ہمارا مقصد دیبل تک پہنچنا نہیں سندھ کو فتح کرنا ہے، اور یہ قلعہ اُن کے دفاع کی اہم چوکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس قلعہ کے فتح ہو جانے کے بعد دُشمن یہ تمام علاقہ خالی کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور دشمن کے جو سپاہی یہاں سے فرار ہوں گے وہ دیبل پہنچ کر ایک شکست خوردہ ذہنیت کا مظاہرہ کریں گے۔ لیکن اگر ہم یہاں سے کترا کر نکل گئے تو اُن کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور ہمارا عقب ہمیشہ غیر محفوظ رہے گا۔ ہمارا پہلا مقصد اس قلعے کو فتح کرنا ہے۔ اِس قلعے کی فتح کے بعد اگر پہاڑیوں میں پھیلے ہوئے لشکر کی تعداد کافی ہوئی تو وہ اِس علاقہ میں ہمارے ساتھ فیصلہ کن

جنگ لڑنے کی کوشش کریں گے۔ اور اس میں بھی ہماری بہتری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری پیش قدمی روکنے کے لئے اِس قلعے کے محافظوں کی زیادہ تعداد آس پاس کی پہاڑیوں پر منقسم ہے۔ میں آج سُورج نکلنے سے پہلے اس قلعے پر حملہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس مقصد کے لئے میں اپنے ساتھ فقط پانچ سَو پیادہ سپاہی لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ باقی فوج کے ساتھ رات بھر پیش قدمی جاری رکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وُہ لوگ چاروں اطراف کا خیال چھوڑ کر آپ کا راستہ روکنے کی فکر کریں گے۔ چاندنی رات میں آپ کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ زیادہ خطرناک ثابت نہ ہوگا۔ اگر صبح تک آپ کو قلعہ فتح ہو جانے کی خبر پہنچ جائے تو آپ پیش قدمی روک کر میرے احکام کا انتظار کریں۔ اگر قلعہ فتح ہو جانے کے بعد دُشمن نے کسی جگہ منظّم ہو کر مقابلے کی ہمت کی تو میں قلعے کی حفاظت کے لئے چند آدمی چھوڑ کر آپ کے ساتھ آملوں گا۔ اور اگر اُنہوں نے قلعے کو دوبارہ فتح کرنا چاہا تو آپ وہاں پہنچ جائیں۔"

ایک بوڑھے سالار نے کہا۔" مجھے یقین ہے کہ سندھ کی فتح کے لئے خدا نے آپ کو منتخب کیا ہے۔ انشاءاللہ آپ کی کوئی تدبیر غلط نہ ہوگی لیکن سپہ سالار کا فوج کے ساتھ رہنا ہی مناسب ہے۔ سپہ سالار کی جان بہت قیمتی ہوتی ہے اور وہ فوج کا آخری سہارا ہوتا ہے۔ اگر اس خطرناک مہم میں آپ کو کوئی حادثہ پیش آگیا تو؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔" قادسیہ کی جنگ میں ایرانیوں کو اپنے

زبردست لشکر کے باوجود اِس لئے شکست ہوئی کہ اُنہوں نے اپنی طاقت سے زیادہ رُستم کی شخصیت پر بھروسہ کیا۔ رُستم مارا گیا تو وُہ مسلمانوں کی مُٹھی بھر جماعت کے سامنے بھاگ نکلے لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کے سپہ سالار سعد بن ابی وقاص گھوڑے پر چڑھنے کے قابل نہ تھے۔ اور اُنہیں میدان سے ایک طرف بیٹھنا پڑا۔ لیکن مسلمانوں کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ انہیں اپنے سپہ سالار کی عدم موجودگی کا احساس تک بھی نہ تھا۔ ہماری تاریخ میں آپ کو کوئی ایسا واقعہ نہیں ملیگا جب سالار کی شہادت سے بدل ہو کر مجاہدوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہوں ہم بادشاہوں اور سالاروں کے لئے نہیں لڑتے، ہم خدا کے لئے لڑتے ہیں۔ بادشاہوں اور سالاروں پر بھروسہ کرنے والے اُن کی موت کے بعد مایوس ہو سکتے ہیں لیکن ہمارا خدا ہر وقت موجود ہے۔ قرآن میں ہمارے لئے اُس کے احکام موجود ہیں۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ خدا مجھے قدم کے لئے رستم نہ بنائے بلکہ مجھے حضرت مثنیٰؓ بننے کی توفیق دے جن کی شہادت نے ہر مسلمان کو جذبۂ شہادت سے سرشار کر دیا تھا۔ میرے لئے اُس سپہ سالار کی جان کی کوئی قیمت نہیں جو اُسے اپنے سپاہیوں کی تلواروں کے پہرے میں چھپا کر رکھتا ہے۔ اور اپنے بہادروں کو جان کی بازی لگانے کی بجائے جان بچانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اگر اس قلعہ کو فتح کرنا اس قدر اہم نہ ہوتا تو میں یہ مہم شاید کسی اور کے سپرد کر دیتا۔ لیکن اس مہم کا خطرہ اور اس کی اہمیت دونوں اس بات کے متقاضی ہیں کہ میں خود اس کی رہنمائی کروں"۔

زبیر نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں"۔

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "نہیں میں ایک قلعہ فتح کرنے کے

لئے دو دماغوں کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میری غیر حاضری میں تمہارا فوج کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ میں اپنی جگہ محمد بن ہارون کو مقرر کرتا ہوں اور تم اُس کے نائب ہو۔"

(۳)

عشاء کی نماز کے بعد محمد بن قاسم نے پانچ سو نوجوان اِس مہم کے لئے منتخب کئے اور اُن کے گھوڑے باقی لشکر کے حوالے کر کے محمد بن ہارون کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ اور خود اپنے جاں نثاروں کے ساتھ ایک پہاڑی کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

آدھی رات کے وقت چاند روپوش ہو گیا۔ اور محمد بن قاسم نے قلعے کا رُخ کیا۔ راستے کی تمام پہاڑیوں کے محافظ محمد بن ہارون کی پیش قدمی کو تمام لشکر کی پیش قدمی سمجھ کر اپنی اپنی چوکیاں خالی کر کے مشرق کی طرف جا چکے تھے بعض سواروں نے قلعہ میں بھیم سنگھ کو مشرق کی طرف مسلمانوں کی غیر متوقع پیش قدمی سے باخبر کر دیا تھا۔ اور وہ تین سو سپاہی قلعے کے اندر چھوڑ کر مسلمانوں کے لشکر کی راہ روکنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ تیسرے پہر محمد بن قاسم قلعے سے ایک میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی پر پہنچ چکا تھا۔ دُور چٹانوں میں بھیم سنگھ کے سواروں کے گھوڑوں کی آواز گونجی اور محمد بن قاسم نے اپنے ساتھیوں سے کہا:۔ "وہ قلعہ خالی کر کے جا رہے ہیں۔ ہمیں جلدی کرنی چاہئے لیکن قلعے میں حفاظت کے لئے تھوڑی بہت فوج ضرور موجود ہو گی۔ اِس لئے تمہاری طرف سے کوئی شور نہ ہو۔ تمہاری طرف سے ذرا سی آہٹ قلعہ

کے محافظوں کو باخبر کر دے گی۔ اور اگر اُن کی تعداد چالیس بھی ہوئی تو بھی وہ ہمیں کافی دیر تک قلعے سے باہر روک سکیں گے"۔

یہ ہدایات دینے کے بعد محمد بن قاسم نے اپنے جانبازوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کیا اور قلعے کی طرف پیش قدمی کی۔

قلعے کے قریب پہنچ کر یہ فوج آس پاس کے ٹیلوں میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ فصیل پر پہرہ داروں کی آوازوں میں تھکاوٹ اور نیند کی جھلک تھی۔ اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ بولنے کی بجائے بڑبڑا رہے ہیں۔ محمد بن قاسم اپنے ساتھ دس نوجوان لے کر فصیل کے ایک نسبتہً پُرسکون حصّے کی طرف بڑھا۔ اور کمند ڈال کر اُوپر چڑھنے کے بعد رسیوں کی سیڑھی پھینک دی۔ اس جگہ دو پہرے دار گہری نیند سو رہے تھے۔ آن کی آن میں محمد بن قاسم کے چھ ساتھی فصیل پر چڑھ گئے۔ لیکن ساتواں ابھی اُوپر نہ پہنچا تھا کہ چند قدم کے فاصلے سے ایک سپاہی نے چونک کر مشعل بلند کرتے ہوئے کہا "کون ہے؟"

دوسرے سپاہی نے چلا کر کہا۔ "دشمن آگیا ہوشیار!"

محمد بن قاسم نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ اور ساتھ ہی ایک زوردار حملے سے فصیل کا بہت سا حصّہ خالی کرالیا۔ یہ نعرہ سُن کر قلعے کے باہر چھپے ہوئے سپاہی آگے بڑھے اور کمندیں ڈال کر فصیل پر چڑھنے لگے۔ قلعے کے اندر آرام سے سونے والے سپاہی ابھی اپنی تلواریں سنبھال رہے تھے کہ محمد بن قاسم کے پچاس سپاہی فصیل پر پہنچ گئے۔ پہرہ داروں نے زیادہ دیر فصیل پر مزاحمت کرنے کی بجائے اندر جا کر اپنے گہری نیند سونے والے ساتھیوں کو جگانا

زیادہ مناسب خیال کیا۔ اور اُنہوں نے زیادہ دیر ڈٹ کر لڑنے پر ایک سُرنگ کے راستے فرار ہونے کو ترجیح دی۔ سرنگ بہت تنگ تھی۔ اور تمام سپاہی بیک وقت اُس میں گھسنا چاہتے تھے۔ بعض نے مایوس ہو کر قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اور کوئی پیدل اور کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے سے باہر نکل آیا۔ قلعے کا دروازہ کھلتا دیکھ کر مسلمان بھی فصیل پر چڑھنے کا خیال ترک کر کے اس طرف بڑھے اور زیادہ آدمیوں کو فرار ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ اُنہوں نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر تلواریں سونت لیں۔ لیکن تھوڑی دیر مقابلہ کرنے کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔

قلعے کے اندر سُرنگ میں جمع ہونے والے سپاہی بُری طرح ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ اُن کا شور سُن کر محمد بن قاسم ایک پہرہ دار کی نیچے گری ہوئی مشعل اُٹھا کر چند سپاہیوں کے ساتھ مختلف کمروں سے گزرتا ہُوا ایک تہ خانے کے دروازے تک پہنچا اور اندر جمع ہو کر سُرنگ میں گھسنے والوں کی بدحواسی دیکھ کر فارسی زبان میں بولا۔ "تم میں سے جو فرار ہونا چاہے اُس کے لئے قلعے کا دروازہ کھلا ہے۔ تم اپنے ہتھیار پھینک کر جا سکتے ہو۔"

یہ کہہ کر محمد بن قاسم ایک طرف ہٹ گیا۔ راجہ کے سپاہیوں میں سے جو فارسی جانتے تھے اُنہوں نے ایک دوسرے کو محمد بن قاسم کا مطلب سمجھایا۔ اور وہ محمد بن قاسم کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے تہ خانے سے باہر نکل آئے۔ بعض نے سُرنگ کو ترجیح دینا چاہی۔ لیکن محمد بن قاسم کے اشارے سے چند سپاہی تہ خانے میں داخل ہوئے اور تلواریں سونت کر سُرنگ کے منہ پر

کھڑے ہو گئے۔

محمد بن قاسم نے کہا "جب تمہارے لئے ایک کھلا راستہ موجود ہے، تو تم تنگ اور تاریک راستہ کیوں اختیار کرتے ہو۔ ہم پر اعتبار کرو۔ اگر ہمیں قتل کرنا مقصود ہو تو تمہاری گردنیں ہماری تلواروں سے دور نہیں۔"

محمد بن قاسم کے یہ الفاظ سُن کر باقی سپاہی بھی ہتھیار پھینک کر تہ خانے سے باہر نکل آئے۔ محمد بن قاسم نے واپس قلعے کے دروازے پر پہنچ کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ قلعے سے باہر نکلنے والوں کے راستے میں مزاحم نہ ہوں۔

یہ لوگ جھجک جھجک کر قدم اٹھاتے اور مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے قلعے سے باہر نکل گئے۔ مفتوح دشمن کے ساتھ یہ سلوک سندھ کی تاریخ میں ایک نیا باب تھا۔ ایک معمر سپاہی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ اور کچھ سوچ کر واپس آ گیا۔

محمد بن قاسم نے اُس سے کہا۔ "اگر قلعے میں تمہاری کوئی چیز کھو گئی ہے تو تلاش کر سکتے ہو۔" اُس نے غور سے محمد بن قاسم کی طرف دیکھا، اور سوال کیا "کیا عرب کی فوج کے سپہ سالار آپ ہیں؟"

"ہاں میں ہوں!" محمد بن قاسم نے جواب دیا۔

"دشمن کسی حالت میں بھی نیک سلوک کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟"

"ہمارا مقصد دشمن کو تباہ کرنا نہیں بلکہ اُس کو سلامتی کا راستہ دکھانا ہے۔"

"تو یقین رکھئے کہ آپ پر کوئی فتح نہیں پا سکتا ۔ یہ لوگ جنہیں آج آپ اپنے رحم کا مستحق سمجھتے ہیں کل آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر اُن مغرور بادشاہوں کے خلاف جنگ کریں گے جو گرے ہوئے دشمن پر رحم کرنا نہیں جانتے" ۔ یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گیا ۔

محمد بن قاسم نے قلعے کا چکّر لگایا ۔ ایک وسیع کمرہ کھانے پینے کی اشیا سے بھرا پڑا تھا ۔ اور اصطبل میں ساٹھ گھوڑے موجود تھے ۔

محمد بن قاسم کو یقین تھا کہ محمد بن ہارون کے تعاقب میں جانے والی فوج یہ قلعہ فتح ہو جانے کی خبر سنتے ہی واپس آجائے گی ۔ قلعے میں چند گھوڑے موجود تھے ۔ اُس نے محمد بن ہارون کی طرف چار سوار یہ پیغام دے کر روانہ کیے کہ وہ کسی محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈال کر اُس کے احکام کا انتظار کرے ۔ اس کے بعد اُس نے قلعے کا دروازہ بند کر کے فصیل پر چاروں طرف تیر انداز بٹھا دیئے اور قلعے پر جا بجا اسلامی پرچم نصب کر دیئے ۔

(۴)

محمد بن قاسم فصیل پر کھڑا طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا ۔ اُسے مشرق سے تیس چالیس سواروں کا ایک دستہ قلعے کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا ۔ محمد بن قاسم اور اُس کے ساتھی اُسے سندھ کی فوج کا دستہ سمجھتے ہوئے کمانوں پر تیر چڑھا کر بیٹھ گئے ۔ یہ سوار قلعے سے کوئی تین سو قدم کے فاصلے پر آ کر رُک گئے اور ایک سوار اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا فصیل کی طرف بڑھا ۔ تیر انداز محمد بن قاسم کے اشارے کے منتظر

تھے۔ محمد بن قاسم نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ سوار نے فصیل کے نیچے پہنچ کر گھوڑا روکا اور عربی زبان میں کہا۔ "ہم زبیر کے ساتھی ہیں، ہمیں اندر آنے دو۔"

محمد بن قاسم نے آگے جھک کر پوچھا۔ "تمہارا نام خالد ہے؟"

"جی ہاں"۔ اُس نے جواب دیا۔

"اپنے ساتھیوں کو بلا لو۔"

خالد نے پیچھے مُڑ کر اپنے ساتھیوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا، اور محمد بن قاسم نے سپاہیوں کو قلعے کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ قلعے سے باہر نکل کر خالد سے سوال کیا۔ "تمہاری بہن کہاں ہے؟"

خالد نے جواب دیا۔ "وہ میرے ساتھ ہے لیکن زبیر نہیں آیا۔"

"وہ باقی فوج کے ساتھ ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم اِس قلعے میں ہیں؟"

"ہمیں یہ خبر مل چکی تھی کہ آپ مکران کی سرحد عبور کر چکے ہیں۔ ہم سندھی سپاہیوں کا بھیس بدل کر یہاں پہنچے اور آپ حیران ہوں گے کہ راجہ کی فوج کا سالار ہمیں یہاں سے چار میل دُور ایک پہاڑی پر پہرہ دینے کے لئے متعین کر چکا تھا۔ ہم سخت بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ آج قلعے سے فرار ہونے والے سپاہی وہاں پہنچے اور اُنھوں نے بتایا کہ یہ قلعہ فتح ہو چکا ہے۔ ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں۔ سالارِ اعظم کہاں ہیں؟"

محمد بن قاسم نے مسکراتے ہوئے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا،

اور اُس نے جواب دیا۔ "تم سالارِ اعظم سے باتیں کر رہے ہو"۔

تھوڑی دیر میں خالد کے باقی ساتھی اُن کے قریب پہنچ کر گھوڑوں سے نیچے اُتر رہے تھے۔ محمد بن قاسم نے اُن سب پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد کہا۔ "لیکن تمہاری بہن کہاں ہے؟"

خالد نے مسکرا کر مردانہ لباس میں ایک نقاب پوش کی طرف اشارہ کر دیا۔

محمد بن قاسم نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ کی صحت اب ٹھیک ہے۔ ہاں زبیر باقی فوج کے ساتھ ہے"۔

زبیر کا نام سُن کر ناہید نے اپنے کانوں اور گالوں پر اچانک ایک حرارت محسوس کی اور پیچھے مُڑ کر مایا کی طرف دیکھا۔ مایا بھی اُس کی طرح مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ اُس نے آنکھ بچا کر ناہید کے بازو پر چٹکی لی اور آہستہ سے کہا۔ "ناہید مبارک ہو!"

(۵)

محمد بن قاسم نے پھر ایک بار خالد کے تمام ساتھیوں کی طرف دیکھا، اور ایک سفید ریش قوی ہیکل آدمی کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "شاید تم گنگو ہو۔ میں تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا شکر گزار ہوں"۔

گنگو نے محمد بن قاسم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے خالد کی طرف دیکھا۔ اور خالد نے کہا۔ "گنگو اور اُس کے ساتھی مسلمان ہو چکے ہیں اور گنگو نے اپنے لئے سعد کا نام پسند کیا ہے"۔

محمد بن قاسم نے الحمدللہ کہہ کر یکے بعد دیگرے سب سے مصافحہ کیا۔ ناصرالدین (رجِ رام) کے ساتھ ہاتھ ملاتے وقت اُس نے کہا: "آپ غالباً ناصرالدین ہیں۔ آپ نے ہمارے لئے بہت تکلیف اُٹھائی۔ خدا آپ کو جزا دے۔ اور یہ شاید آپ کی ہمشیرہ ہے؟"

خالد نے کہا: "یہ بھی مسلمان ہو چکی ہیں۔ ان کا نام زہرا ہے۔"

زہرا نے ناصرالدین کے قریب آ کر دبی زبان میں پوچھا: "یہ کون ہیں؟"

اور ناصرالدین نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے یہ سوال خالد کے کانوں تک پہنچا دیا۔

خالد نے بلند آواز میں کہا: "یہ ہمارے سپہ سالار ہیں۔"

سعد (گنگو) اور اُس کے ساتھی حیران ہو کر محمد بن قاسم کی طرف دیکھنے لگے۔

دُور سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ اور فصیل پر سے ایک پہرے دار نے آواز دی: "دشمن کی فوج آ رہی ہے۔"

یہ لوگ جلدی سے قلعے میں داخل ہوئے۔ محمد بن قاسم نے فصیل پر چڑھ کر دُور تک نگاہ دوڑائی۔ جنوب اور مشرق کی طرف سے سندھ کے ہزاروں پیادہ اور سوار سپاہی قلعے کا رُخ کر رہے تھے۔ محمد بن قاسم نے اپنے دس سپاہیوں کو گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے نائب تک یہ پیغام پہنچانے کا حکم دیا کہ وہ شام سے پہلے اس جگہ پہنچ جائے۔

سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو گئے تو محمد بن قاسم نے اُنہیں ہدایت کی

کہ وہ مغرب کی طرف سے چکر کاٹ کر حملہ آور لشکر کی زد سے نکل جائیں، اور پھر اپنی منزل کا رُخ کریں۔ سپاہی گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے قلعے سے باہر نکل گئے۔ حملہ آور قریب آچکے تھے۔ محمد بن قاسم نے قلعے کا دروازہ بند کرنے کا حکم دے کر دوبارہ فصیل پر چڑھ کر چکر لگایا۔ اور تیر اندازوں کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ فصیل کے ایک کونے پر خالد اور اُس کے ساتھی نہایت بے تابی سے حملہ آوروں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ اُن کے درمیان ناہید اور زہرا کو دیکھ کر محمد بن قاسم نے کہا، "خالد! انہیں قلعے کے اندر لے جاؤ، یہاں ان کی ضرورت نہیں۔"

ناہید نے جواب دیا۔ "آپ ہماری فکر نہ کریں، ہم تیر چلانا جانتی ہیں"۔

"تمہاری مرضی۔ لیکن اب ذرا سر نیچے کر کے بیٹھ جاؤ۔" محمد بن قاسم یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

بھیم سنگھ کے سپاہیوں نے گھوڑوں کو ٹیلوں کے عقب میں چھوڑ کر چاروں اطراف سے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور چٹانوں اور پتھروں کے مورچے بنا کر قلعے پر تیروں کی بارش کرنے لگے۔ قلعے کی فصیل کے مورچوں میں بیٹھنے والوں کے لئے حملہ آوروں کے تیر بے اثر ثابت ہوئے۔ محمد بن قاسم نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ فقط قلعے پر دشمن کی یلغار روکنے کے لئے تیروں کو استعمال کریں۔ بھیم سنگھ نے اپنی فوج کے تیروں کا قلعے سے کوئی جواب نہ پا کر "راجہ داہر کی جے" کا نعرہ بلند کیا۔ اور چٹانوں اور پتھروں کی آڑ میں چھُپ کر تیر چلانے والے لشکر نے چاروں اطراف سے قلعے پر دھاوا بول دیا۔

جب یہ لشکر قلعہ کے محافظوں کے تیروں کی زد میں آگیا۔ محمد بن قاسم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ یہ نعرہ ابھی فضا میں گم نہ ہوا تھا کہ قلعے سے تیروں کی بارش ہونے لگی۔ اور بھیم سنگھ کے سپاہی زخمی ہو ہو کر گرنے لگے۔ لیکن بیس ہزار فوج چند سو سپاہیوں کے نقصان کی پروانہ کرتے ہوئے قلعے کی فصیل تک پہنچ گئی۔ چند سپاہی ایک بھاری شہتیر اُٹھا کر آگے بڑھے اور اس کی ضربوں سے قلعے کا دروازہ توڑنے لگے۔ اور باقی کمندیں ڈال کر قلعے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن تیروں کی بوچھاڑ کے سامنے اُن کی پیش نہ گئی۔ چند ساعتوں کے بعد بھیم سنگھ کے قریباً دو ہزار آدمی قلعے کی دیواروں کے آس پاس ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ اور اُسے فوج کو پیچھے ہٹنے کا حکم دینا پڑا۔

سہ پہر تک بھیم سنگھ نے قلعے پر تین دفعہ یلغار کی۔ لیکن تینوں مرتبہ اُسے مایوس ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

چوتھے پہر بھیم سنگھ ایک فیصلہ کُن حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ اُسے پیچھے سے محمد بن قاسم کی باقی فوج کی آمد کی اطلاع ملی۔ اُس نے سواروں کو حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹ کر اپنے گھوڑے سنبھالیں۔ اور پیادہ فوج کے تیراندازوں کو آس پاس پہاڑیوں پر متعین کر دیا۔ دُشمن کی نقل و حرکت دیکھ کر محمد بن قاسم کو یقین ہو گیا کہ دشمن کو محمد بن ہارون کی آمد کی اطلاع مِل چُکی ہے۔ اُسے خطرہ پیدا ہوا کہ قلعے کے قریب پہنچ کر وہ چاروں اطراف کے ٹیلوں اور پہاڑیوں سے تیروں کی زد میں ہوگا۔ اُس نے جلدی سے کاغذ پر ایک نقشہ بنایا۔ اور محمد بن ہارون کے نام چند ہدایات لکھ کر اپنے

سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "محمد بن ہارون کے یہاں پہنچنے سے پہلے اُسے یہ رقعہ پہنچانا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہ کام جس قدر اہم ہے اسی قدر خطرناک ہے۔ اِس وقت دشمن کی توجہ دُوسری طرف مبذول ہو چکی ہے۔ شمال کی طرف سے دشمن کے مورچے تقریباً خالی ہو چکے ہیں اور ہم فصیل سے آدمی اُتار سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی محمد بن ہارون تک پہنچنے کے لئے اُسے کئی خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اِس مہم کے لئے ایک رضا کار...."

خالد نے محمد بن قاسم کا فقرہ پُورا نہ ہونے دیا اور بولا۔ "مجھے اجازت دیجئے۔"

بہت سے سپاہیوں نے خالد کی مخالفت کی اور اپنے نام پیش کیئے۔ سعد نے کہا: "مَیں نے سُنا ہے کہ مسلمان اپنے نومسلم بھائی کی خواہش رد نہیں کرتے۔ آپ مجھے اجازت دیں۔ میرے لباس سے کسی کو مجھ پر شک نہ ہوگا۔ اور مَیں اِس زمین کے چپے چپے سے واقف ہوں۔"

محمد بن قاسم کو اپنی فوج دُشمن کے لشکر کے عقب میں دو تین میل کے فاصلے پر ایک ٹیلے سے اُترتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس نے سعد کے ہاتھ میں رقعہ دیتے ہوئے کہا: "جاؤ خدا تمہاری مدد کرے۔" سعد بھاگتا ہُوا شمال کی دیوار کی طرف پہنچا، اور ایک رسّے کے ذریعے نیچے اُتر گیا۔

(۵)

محمد بن ہارون نے دُور سے بھیم سنگھ کے سوار دستوں کو حملے کے

لٹے تیار دیکھ کر اپنی فوج کو رُکنے کا حکم دیا۔ اور مقابلے کے لئے صفیں درست کرنے کے بعد پیش قدمی کا حکم دینے والا تھا کہ لشکر کے دائیں بازو کا سالار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اور اُس نے ایک رقعہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا:۔ یہ تحریر تو سالارِ اعظم کی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن لانے والا ایک سندھی ہے۔ ہم نے اُسے گرفتار کرلیا ہے۔ وہ بھی عربی جانتا ہے اور کہتا ہے کہ زبیر مجھے جانتا ہے۔ اپنا نام کبھی سعد بتاتا ہے۔ اور کبھی گنگو۔"

زبیر نے چونک کر کہا۔ "میں اُسے جانتا ہوں۔"

محمد بن ہارون نے رقعہ پڑھنے کے بعد کہا "سالارِ اعظم کا رقعہ دیکھنے کے بعد تمہیں اُس کے متعلق تحقیقات کرنے کی ضرورت نہ تھی اگر تم نے اُس کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی ہے تو جاکر معافی مانگو، اور اپنے سواروں سے کہو کہ وہ میرے ساتھ آملیں۔ اور زبیر، ہمارے دائیں اور بائیں طرف تمام پہاڑیوں پر دشمن کے تیر اندازوں کا قبضہ ہے۔ تم میسرہ کے شتر سواروں کو اونٹوں سے اُتر کر دونوں بازوؤں سے پہاڑیوں پر حملہ کرنے اور بائیں بازو کے سواروں کو مقدمۃ الجیش کے ساتھ شامل ہو جانے کا حکم دو۔ جب تک دشمن کے تیر انداز ان پہاڑیوں پر موجود ہیں۔ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

بھیم سنگھ کی چال نہایت کامیاب تھی۔ اگر محمد بن ہارون سامنے سے فوراً حملہ کر دیتا۔ تو اُس کے لشکر کے دونوں بازوؤں پر پہاڑیوں میں چھپے

ہوئے تیر انداز مسلمانوں کی فوج کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوتے۔ لیکن بھیم سنگھ کی توقع کے خلاف جب دائیں اور بائیں بازو سے مسلمانوں کی پیادہ فوج پہاڑوں پر چڑھنے لگی تو اس نے فوراً آگے بڑھ کر حملے کا حکم دے دیا۔

قلعے کے اندر محمد بن قاسم اس موقع کا منتظر تھا۔ اُس نے پچاس سپاہیوں کو قلعے کی حفاظت پر متعین کیا۔ اور باقی فوج کو قلعے سے باہر نکال کر دشمن پر عقب سے حملہ کرنے کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا۔ سوار اور پیدل سپاہی قلعے کے دروازے پر جمع ہو گئے، اور محمد بن قاسم دروازے کے سوراخ میں سے دونوں افواج کی نقل و حرکت دیکھنے لگا۔

خالد، ناصرالدین اور ان کے ساتھی بھی قلعے میں ٹھہرنے والے سپاہیوں سے خود، زرہیں اور عربی لباس حاصل کر کے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ اچانک ناہید اور زہرا کیل کانٹے سے لیس ہو کر ایک کمرے سے باہر نکلیں۔ اور دروازے کے پاس پہنچ کر کھڑی ہو گئیں۔

خالد نے کہا "ناہید! زہرا!! جاؤ قلعے سے باہر تمہارا کوئی کام نہیں"۔

ناصرالدین نے اُس کی تائید کی۔ محمد بن قاسم نے مڑ کر اُن کی طرف دیکھا اور کہا "میں تمہارے جذبۂ جہاد کی داد دیتا ہوں۔ لیکن تم قلعے کی حفاظت کے لئے سپاہیوں کا ساتھ دے کر ہماری زیادہ مدد کر سکتی ہو۔ قوم کے لئے بہادر ماؤں کا دودھ اُن کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔ نازک وقت آنے پر وہ گھروں کی چاردیواری کو گرتی ہوئی قوم کے لئے آخری قلعہ بنا سکتی ہیں۔ تم یہاں ہو گی تو قلعے کی حفاظت کے لئے یہ چند سپاہی اپنے خون کا آخری

قطرہ تک بہانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ لیکن میدان میں سپاہیوں کو دشمن کا مقابلہ کرنے سے زیادہ تمہاری حفاظت کا خیال ہوگا۔ تم میں سے ایک کا زخمی ہو کر گرنا سینکڑوں سپاہیوں کو بددِل کردے گا۔ اور یہ معرکہ ایسا نہیں جس کے لئے ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہو۔ تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔ شاید رات بھر تمہیں زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے جاگنا پڑے۔ خالدہ انہیں اندر لے جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ پھر دروازے کے سوراخ میں سے جھانکنے لگا جب دونوں افواج گتھم گتھا ہو گئیں۔ تو محمد بن قاسم نے گھوڑے پر سوار ہو کر دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔

خالد، ناہید اور زہرا کو کمرے میں چھوڑ کر واپس لوٹا اور وہ ابھی دروازے تک نہ پہنچا تھا کہ زہرا نے بھاگ کر اُس کا دامن پکڑ لیا۔ "خدا کے لئے مجھے ساتھ لے جاؤ۔ میں زندگی اور موت میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔"

خالد نے برہم ہو کر جواب دیا۔ "زہرا! نادان نہ ہو۔ تم سالارِ اعظم کا حکم سُن چکی ہو۔ مجھے جانے دو۔ فوج قلعے سے باہر نکل رہی ہے۔"

زہرا نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "خدا کے لئے مجھے بزدل خیال نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ جان دینا چاہتی ہوں۔"

"زہرا۔ زہرا!! مجھے چھوڑ دو۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے زہرا کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ لیکن وہ پھر راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

اُس نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اگر آپ اس سعادت سے محروم نہیں ہونا چاہتے

تو مجھے کیوں محروم رکھنا چاہتے ہیں؟"

"زہرا! یہ امیرِ عساکر کا حکم ہے اور جہاد میں امیرِ عساکر کی حکم عدولی سب سے بڑا جرم ہے۔"

زہرا نے بد دِل ہو کر خالد کا دامن چھوڑ دیا۔ اور ہچکیاں لیتی ہوئی ناہید سے لپٹ گئی۔

خالد بھاگتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ سپاہی جا چکے تھے اور دروازہ بند تھا۔ خالد نے پہرہ دار سے دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔ لیکن اُس نے جواب دیا۔ جب تک باہر سے سالارِ اعظم کا حکم نہ آئے۔ مَیں دروازہ نہیں کھول سکتا۔ خالد کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُسے خیال آیا کہ وُہ اُسے بزدِل سمجھ کر پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اُس نے بھاگ کر دروازے کے سوراخ میں سے باہر جھانکا۔ قلعے کی پیادہ فوج عقب سے بھیم سنگھ کے لشکر کے دونوں بازوؤں پر حملہ کر چکی تھی۔ اور محمد بن قاسم ساٹھ سواروں کے ہمراہ براہِ راست قلبِ لشکر پر حملہ کر چکا تھا۔ خالد دشمن کے لشکر کے عین وسط میں ہلالی پرچم دیکھ کر اپنی مٹھیاں بھینچتا اور ہونٹ کاٹتا ہوا پہرہ داروں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "اُنھوں نے میرا انتظار کیا ہو گا، اور یہ سمجھ لیا ہو گا کہ مَیں موت کے ڈر سے قلعے میں کہیں چھُپ کر بیٹھ گیا ہوں۔ خدا کے لئے دروازہ کھول دو۔ مجھے جانے دو۔"

پہرے دار نے جواب دیا۔ "آپ اطمینان رکھیے۔ سالارِ اعظم کو یہ شک نہیں کہ آپ بزدل ہیں۔ ورنہ شاید آپ کے قتل کا حکم دے جاتے۔

وہ یہ کہتے تھے کہ لڑکیوں کے پاس آپ کا ٹھہرنا بہتر ہوگا۔ ہمیں دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں۔"

"تو مَیں فصیل پر سے کود جاؤں گا۔" یہ کہہ کر خالد فصیل کی سیڑھی کی طرف لپکا۔ راستے میں زہرا کھڑی تھی۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن خالد کے تیور دیکھ کر سہم گئی۔

خالد نے اُس پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور کہا: "اب تم خوش ہو نا!"

زہرا نے کہا "مجھے معاف کر دو۔ مَیں ایک عورت ہوں۔"

خدا ایک زندہ قوم کو تمہارے جیسی عورتوں سے بچائے"۔ خالد یہ کہہ کر بھاگتا ہُوا زینے پر چڑھا اور رسا پھینک کر آن کی آن میں فصیل سے نیچے اُتر گیا۔

زہرا نے بھاگ کر کمرے سے تلوار اُٹھائی۔ ناہید نے پُوچھا۔ زہرا کہاں جارہی ہو؟"

زہرا نے جواب دیا "ناہید تمہارے بھائی نے ہمیشہ مجھے غلط سمجھا اگر مَیں واپس نہ آسکوں تو اُسے کہہ دینا مَیں بُزدل نہ تھی۔ کاش ہماری سماج عورت کو اپنے پتی کی چتا پر جلنے کی بجائے کسی مقصد پر قربان ہونا سکھا سکتی۔"

ناہید نے کہا۔ "زہرا ٹھہرو! زہرا! زہرا!!"

لیکن زہرہ آندھی کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اور بگولے کی طرح باہر نکل گئی۔ ناہید اُس کے پیچھے بھاگی۔ لیکن جب تک وہ زینے کے قریب پہنچی، وہ فصیل پر چڑھ کر رسیوں کی سیڑھی نیچے پھینک چکی تھی۔ سپاہیوں

نے اُس کو روکنا چاہا۔ لیکن اُس نے کہا "اگر میرا راستہ روکا تو میں فصیل پر سے کُود جاؤں گی"

سپاہی پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، اور زہرا نیچے اُتر گئی۔ ناہید نے فصیل پر پہنچ کر آوازیں دیں "زہرا! زہرا! پگلی نہ بنو۔ واپس آجاؤ" لیکن ناہید کی ہر آواز کے ساتھ اُس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ ناہید نے مایوس ہو کر خود نیچے اُترنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ایک عمر رسیدہ سپاہی نے کہا۔ "عورت کا جوش اندھا ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اُس کا تعاقب کیا، تو وہ بے تحاشا دشمن کی صفوں میں جا پہنچے گی"

ناہید نے مایوس ہو کر ایک سپاہی سے تیر و کمان منگوایا اور فصیل کے ایک مورچے میں بیٹھ گئی۔ ایک گھوڑا اپنے سوار کو میدان میں چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ زہرا نے پچکار کر اُس کی باگ پکڑ لی اور اُس پر سوار ہو گئی۔ اُسے گھوڑے پر دیکھ کر ناہید کو قدرے اطمینان ہُوا۔ اور وُہ اُس کی سلامتی کے لئے دُعائیں مانگنے لگی +

(۶)

مسلمانوں کی فوج پر بھیم سنگھ کی فوج کا پہلا حملہ بہت زوردار تھا۔ اور اُنہیں ایک تنگ وادی میں چند قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ لیکن جب پیادہ فوج آس پاس کی پہاڑیوں پر قبضہ جما کر تیر برسانے لگی تو سندھ کے لشکر کی توجہ دو حصّوں میں بٹ گئی۔ عین اُس موقع پر محمد بن قاسم نے قلعے کا دروازہ کھول کر عقب سے حملہ کر دیا۔ اور چند سواروں کے ہمراہ دُشمن کی صفیں درہم

برہم کرتا ہوا لشکر کے قلب تک جا پہنچا۔

لشکر کے عین درمیان میں سبز پرچم دیکھ کر محمد بن ہارون نے اپنے لشکر کو تین اطراف سے عام حملے کا حکم دے دیا۔ زبیر، محمد بن قاسم کی اعانت کے لئے پانچ سو سواروں کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ اور آن کی آن میں محمد بن قاسم کے ساتھ آملا۔ بھیم سنگھ کی فوج بدحواس ہو کر قلعے کی طرف ہٹنے لگی۔ وادی میں اُٹھتی ہوئی گرد نے شام کے دھندلکے کے ساتھ مل کر آمدِ شب کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ بھیم سنگھ نے آخری بار اپنی فوج کی ٹوٹی ہوئی صفیں منظم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن زبیر کی تقلید میں محمد بن ہارون کے باقی سپاہی بھی میدان کو صاف کرتے ہوئے محمد بن قاسم کے ساتھ آملے۔

بھیم سنگھ کی فوج غیر منظم ہو کر مختلف ٹولیوں میں لڑنے لگی۔ مسلمانوں کے دباؤ سے کئی ٹولیاں پسپا ہو کر قلعے کے قریب پہنچ چکی تھیں اور جب قلعے کے محافظ اُن پر تیر برسانے لگے تو وہ بدحواس ہو کر ادھر اُدھر بھاگ نکلے

خالد تیر اندازوں کی ایک جماعت کے ساتھ ایک ٹیلے سے اُترا، اور نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے دشمن کی ایک ٹولی پر ٹوٹ پڑا۔ بدحواس سپاہی ایک طرف ہٹ گئے اور خالد اُن کے تعاقب میں اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو گیا۔ دشمن کے سپاہیوں نے موقع پا کر اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اچانک ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور اُس نے اللہ اکبر کہہ کر اس ٹولی پر حملہ کر دیا۔ خالد اس کی آواز پہچان کر چونکا۔ یہ زہرا تھی۔ زہرا کی تلوار یکے بعد دیگرے دو سپاہیوں کے سر پر چمکی اور دونوں گر کر خاک میں لوٹنے لگے۔ ایک سپاہی نے

آگے بڑھ کر زہرا پر وار کیا۔ زہرا کا گھوڑا اچانک سیخ پا ہوا۔ اور تلوار اُس کی اگلی ٹانگ پر لگی۔ گھوڑے نے چند چھلانگیں لگائیں اور ڈگمگا کر گر پڑا۔ مسلمانوں کے دستوں کو قریب آتا دیکھ کر بھیم سنگھ کے سپاہیوں نے میدان کا یہ حصّہ بھی خالی کر دیا۔ خالد بھاگتا ہوا زہرا کے پاس پہنچا۔ وُہ گھوڑے کے قریب مُنہ کے بل پڑی ہوئی تھی۔ قریب پہنچ کر خالد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُس کے مُنہ سے بیک وقت سسکیاں، آہیں اور دُعائیں نکلیں۔ وہ رُکا، جھجکا، کپکپایا اور پھر بھاگ کر زہرا کو اُٹھانے لگا۔ معاً اُسے زہرا کی پیٹھ پر خون کے نشان اور زرہ میں دو تیر اٹکے ہوئے نظر آئے۔ اور زندگی کی تمام حرکتیں سمٹ کر اُس کی آنکھوں میں آگئیں۔ اُس نے یکے بعد دیگرے دونوں تیر نکال کر پھینک دیئے زہرا نے ایک جھرجھری لینے کے بعد آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ خالد نے چاند کی ہلکی اور پھیکی روشنی میں اُس کا زرد چہرہ دیکھا اور کہا "تم زخمی ہو؟"

اُس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اُس نے کہا "نہیں میں نے اِن تیروں کو محسوس بھی نہیں کیا۔ گھوڑے سے گرنے کے بعد میرا سر چکرا گیا تھا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میدان کا کیا حال ہے؟"

"میدان خالی ہو چکا ہے۔ خدا نے ہمیں فتح دی ہے۔ لیکن ناہید کہاں ہے؟"

"وہ قلعے میں ہے۔ میں آپ سے ایک بات پُوچھنا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"آپ مجھ سے خفا تو نہیں؟"

"اُف زہرہ! مجھے نادم نہ کرو۔ مجھے اپنی سخت کلامی کا بہت افسوس ہے"

وُہ بولی "نہیں میں غلطی پر تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ شاید زندہ واپس نہ آئیں۔ لیکن آج میں دیکھ چکی ہوں کہ انسان اپنی موت کے معیّن وقت سے پہلے نہیں مرتا۔ میں تیروں کی بارش میں سے گزر کر میدان تک پہنچی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ قدرت کا زبردست ہاتھ میری حفاظت کر رہا ہے۔"

مسلمانوں کی فوج فتح کے نعرے لگاتی ہوئی قلعے کے دروازے کے سامنے جمع ہو رہی تھی۔ خالد نے کہا "چلو زہرا ناہید بہت پریشان ہو گی۔"

زہرا نے اُٹھ کر خالد کے ساتھ چند قدم اُٹھائے لیکن اُسے چکر آیا اور وُہ ڈگمگاتی ہوئی زمین پر بیٹھ گئی۔

اُس نے خالد سے پانی مانگا اور خالد نے ایک گرے ہوئے سپاہی کی چھاگل اُتار کر اُس کے مُنہ کو لگا دی۔ زہرا پانی کے چند گھونٹ پی کر اُٹھ بیٹھی لیکن خالد نے کہا "زہرا! میں اُٹھاؤں۔ خون زیادہ بہ جانے کی وجہ سے تم بہت کمزور ہو چکی ہو۔"

زہرا نے کہا "نہیں، مجھے پیاس کی وجہ سے چکر آ گیا تھا۔ مجھے فقط آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔"

خالد نے اُسے اپنے بازو کا سہارا دیا۔ اور وہ آہستہ آہستہ اُس کے ساتھ چلنے لگی۔ چند قدم چلنے کے بعد اُسے ناصرالدین کی آواز سنائی دی "زہرا! زہرا!!" اور اُس نے خالد سے کہا "بھائی مجھے تلاش کر رہا ہے اُسے آواز دو۔"

خالد نے بلند آواز میں کہا "زہرا میرے ساتھ ہے اِس طرف۔"

ناصرالدین، زبیر اور ناہید تیزی سے چلتے ہوئے اُن کے قریب پہنچے۔ ناہید نے بھاگ کر زہرا کو گلے لگاتے ہوئے کہا "زہرا! زہرا!! میری بہن تم کیسی ہو؟"

اُس نے جواب دیا "مَیں بالکل ٹھیک ہوں۔"

لیکن ناہید نے اپنی انگلیوں پر نمی محسوس کرتے ہوئے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور چونک کر کہا "زہرا! تم زخمی ہو؟ بھائی ناصرالدین! اسے قلعے کے اندر لے چلو۔"

ناصرالدین نے آگے بڑھ کر زہرا کو اُٹھانے کی کوشش کی لیکن اُس نے کہا "بھیّا مَیں بالکل ٹھیک ہوں۔ مَیں چل سکتی ہوں۔ اور یہ کون ہیں؟ بھیّا زبیر! بھیّا معاف کرنا مَیں پہچان نہ سکی۔"

زبیر نے کہا "ننھی بہن! تم اپنے بھائیوں کو بہت پریشان کرتی ہو۔ اب چلو۔ ہمیں تمہاری مرہم پٹی کی فکر کرنی چاہیئے۔"

چند قدم چلنے کے بعد انہیں سعد نظر آیا۔ وہ جھک جھک کر میدان میں پڑی ہوئی لاشیں دیکھ رہا تھا۔ خالد نے اُسے آواز دی۔ "چچا! کسے ڈھونڈ رہے ہو۔ ہم اس طرف ہیں۔"

وہ بھاگتا ہوا اُن کے قریب آیا اور بے قرار ہو کر بولا "میرے بیٹے! میری بیٹی!! تم کہاں تھے؟"

خالد نے ہنستے ہوئے جواب دیا "ہم آپ کو تلاش کر رہے تھے۔"

"تم مجھے تلاش کر رہے تھے؟ چور کہیں کے۔ ناہید سے پوچھو مَیں کس قدر پریشان تھا۔"

ناہید نے کہا "یہ تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔ ہم نے میدان کا صرف ایک چکر لگایا ہے اور یہ شاید تین چار چکر لگا چکے ہیں۔"

سعد نے کہا "صرف اسی میدان میں نہیں، میں تو آس پاس کی تمام پہاڑیوں پر بھی خوار ہو آیا ہوں۔ تم نے آواز تو دی ہوتی۔ میرا تو گلا بھی بیٹھ گیا۔"

خالد نے کہا "میں نے آپ کی آواز نہیں سُنی۔ ورنہ میں جواب ضرور دیتا۔"

سعد نے کہا "ان زخمیوں کی چیخ پکار میں کسی کی آواز سُنائی بھی کب دیتی ہے۔"

یہ لوگ باتیں کرتے ہوئے قلعے کے دروازے کے قریب پہنچے تو ناہید نے آہستہ سے سعد کے کان میں کچھ کہا۔ اور وہ چند بار سر ہلانے کے بعد ناصر الدین سے مخاطب ہوا "میں علیحدگی میں آپ کے ساتھ ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ناصر الدین نے اُس کے ساتھ چند قدم چلنے کے بعد رُک کر کہا۔ "کہئے، کیا ارشاد ہے؟"

سعد نے آس پاس جمع ہونے والے سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "یہاں نہیں۔ یہاں بہت سے لوگ ہیں۔"

ناصر الدین نے کہا "بہت اچھا۔ جہاں چاہو لے چلو۔"

قلعے کے دروازے سے کوئی پانچ سو قدم دُور جا کے سعد نے ایک

پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ آپ بھی بیٹھ جائیں۔"

ناصر الدین اُس کے سامنے دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔

سعد نے کہا۔" پہلے آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ میری بات سُن کر میرا سر پھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو جائیں گے۔"

ناصر الدین نے جواب دیا۔" اگر کوئی سر پھوڑنے والی بات ہوئی تو ضرور پھوڑوں گا۔"

سعد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔" بات تو ایسی کوئی نہیں لیکن پرائے ہاتھوں کا کیا اعتبار۔ اچھا مَیں کہہ ہی دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مایا نہیں نہیں زہرا آپ کی بہن ہے اور میرے لئے بھی وہ بیٹی سے کم نہیں۔ خالد بھی مجھے بہت عزیز ہے۔ بالکل اپنے بیٹے کی طرح۔ اور اس سے آگے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مَیں کیا کہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ خفا ہو جائیں گے۔"

ناصر الدین نے کہا۔" مَیں سمجھ گیا۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ خالد اور زہرا کی شادی کر دی جائے۔"

"ہاں ہاں! خدا تمہارا بھلا کرے۔ مَیں یہی کہنا چاہتا تھا۔"

"بس اسی بات کے لئے مجھے یہاں تک گھسیٹ لائے ہو؟"

سعد نے جواب دیا۔" مجھے یہ خیال تھا کہ اگر آپ بگڑ کر میری داڑھی نوچنے پر آمادہ ہو جائیں۔ تو دوسرے ہمارا تماشا نہ دیکھیں۔"

ناصر الدین نے جواب دیا۔" مَیں حیران ہوں کہ مجھے آپ نے اس قدر بُرا خیال کیا۔ مجھے گنگو سے نفرت تھی۔ لیکن سعد کی میرے دِل میں وُہی

عزت ہے جو ایک راجپوت کے دل میں اپنے باپ کے لئے ہونی چاہئے
تم جس وقت چاہو اُن کی شادی کر سکتے ہو!"

سعد نے کہا "میں تو چاہتا ہوں کہ ابھی ہو جائے"۔

"لیکن زہرا زخمی ہے"۔

سعد نے چونک کر سوال کیا "زہرا زخمی ہے۔ مجھے کسی نے کیوں نہیں بتایا۔ چلو چلیں"۔

ناصرالدین نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اُس کے زخم بالکل معمولی ہیں"۔

سب کا محسن

(۱)

آدھی رات تک محمد بن قاسم کے تھکے ہوئے سپاہی زخمیوں کی مرہم پٹی اور شہیدوں کی تجہیز و تکفین میں مصروف رہے۔ میدان میں چاروں طرف سے دشمن کے زخمی سپاہیوں کی چیخ پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ شہیدوں کی نماز جنازہ پڑھانے کے بعد مسلمانوں کی فوج کا سترہ سالہ سپہ سالار جس کا جسم بے آرامی کی کئی راتیں کاٹنے کے بعد تھکاوٹ سے چور ہو چکا تھا۔ جس کے بازو دن بھر تلواروں اور نیزوں سے کھیلنے کے بعد شل ہو چکے تھے۔ اپنی پیٹھ پر پانی کا مشکیزہ اٹھائے زخموں سے کراہتے ہوئے دشمنوں کی پیاس بجھا رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں اس کے ساتھیوں نے لڑائی کے وقت قہر و غضب کی آگ کے شعلے دیکھے تھے۔ اب گر گر تڑپنے والے دشمن کے لئے عفو اور رحم کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ ہاتھ جس کی تلوار دشمنوں کے سر پر بجلی بن کر کوندی تھی، اب اُن کے زخموں پر مرہم رکھ رہا تھا۔

محمد بن قاسم کے سپاہی بھی تھکاوٹ سے چُور تھے لیکن وُہ اپنے کمسن سپہ سالار کی تقلید میں ایک رُوحانی لذت محسوس کر رہے تھے۔ اُنہوں نے دشمن کے زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر قلعے کے سامنے قطار در قطار لٹا دیا۔

محمد بن قاسم کو ایک پہاڑی کے دامن سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی اور وہ مشعل اُٹھائے اُس طرف بڑھا۔ سعید اور زبیر، سعد، ناصرالدین اور چند اور سالار اُس کے ساتھ تھے۔ مشعل کی روشنی میں چند لاشوں کے درمیان اُسے ایک زرہ پوش نوجوان دکھائی دیا۔ اُس کی زرہ میں کئی جگہوں پر خون کے نشان تھے اور پسلی میں ایک تیر پیوست تھا۔ اُس کے دائیں ہاتھ سے تلوار کا دستہ چھوٹ چکا تھا۔ لیکن بائیں ہاتھ میں وہ ابھی تک مضبوطی کے ساتھ سندھ کا جھنڈا تھامے ہوا تھا۔ محمد بن قاسم نے مشعل اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ میں تھما دی اور زمین پر گھٹنا ٹیکتے ہوئے اُسے اُٹھنے کا سہارا دے کر پانی پلایا۔ چند گھونٹ پینے کے بعد نوجوان نے آنکھیں کھولیں اور محمد بن قاسم اور اُس کے ساتھیوں کو غور سے دیکھنے کے بعد جھنڈے کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ناصرالدین نے زبیر سے کہا "زبیر تم نے اسے نہیں پہچانا۔ زبیر نے آگے بڑھ کر زخمی نوجوان کی طرف دیکھا اور کہا " اُف یہ بھیم سنگھ ہے"!

بھیم سنگھ نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چہرے پر ایک دردناک مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا " تمہیں فتح مبارک ہو"!

محمد بن قاسم کے استفسار پر زبیر نے بھیم سنگھ کے الفاظ کا عربی میں

ترجمہ کیا۔ اور اُس نے کہا "میں حیران ہوں کہ ایسے بہادر سپہ سالار کی موجودگی میں سندھ کی فوج میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔ زبیر تم اسے سہارا دو۔ میں اس کا تیر نکالتا ہوں۔"

زبیر نے آگے بڑھ کر بھیم سنگھ کو سہارا دیا۔ محمد بن قاسم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن بھیم سنگھ نے جھنڈا چھوڑ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

محمد بن قاسم نے ناصرالدین کو اشارہ کیا۔ اور اُس نے بھیم سنگھ کے دونو ہاتھ پکڑ لئے۔ محمد بن قاسم نے تیر نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔ اور ناصرالدین کو فوراً زرہ کھول ڈالنے کے لئے کہا۔

بھیم سنگھ کے زخم زیادہ گہرے نہ تھے لیکن خون زیادہ بہہ نکلنے کی وجہ سے وُہ نڈھال ہو چکا تھا۔ محمد بن قاسم نے اُس کی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُسے قلعے کے اندر لے جائیں، اور خود دوسرے زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔

(۲)

زہرا نے اپنے زخموں کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ وہ حسب معمول علی الصباح اُٹھ کر ناہید کے ساتھ صبح کی نماز کے لئے کھڑی ہو گئی۔ نماز ادا کرنے کے بعد زہرا نے اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا "ناہید! کاش میں زیادہ زخمی ہوتی اور تمہاری تیمارداری کا لُطف اُٹھاتی۔"

ناہید نے مسکراتے ہوئے کہا "تم میری تیمارداری کا تصوّر کر رہی ہو یا خالد کی تیمارداری کا؟"

زہرا کے گالوں پر تھوڑی دیر کے لئے حیا کی سُرخی چھا گئی۔ دروازے پر ناصرالدّین نے دستک دیتے ہوئے کہا "میں اندر آسکتا ہوں؟"

ناہید نے اُٹھ کر دُوسرے کمرے میں جاتے ہوئے کہا "لو اب اُٹھ کر بیٹھ جاؤ، ورنہ ــــ"

"ورنہ کیا ہو گا؟"

ناہید نے کہا "ورنہ تمہاری شادی شاید دیبل کی فتح تک ملتوی ہو جائے"

زہرا کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے اُٹھ کر ناہید کا دامن پکڑ لیا۔ اور کہا "ناہید، آپا ناہید، سچ کہو یہ کیا معاملہ ہے؟"

ناہید نے اپنا دامن چھڑاتے ہوئے کہا "پگلی تمہارا بھائی باہر کھڑا ہے، مجھے چھوڑ دو۔"

"نہیں جب تک تم مجھ سے صاف صاف نہ کہو گی میں نہیں چھوڑونگی۔ بھیّا ذرا ٹھہرنا۔ میں آپا ناہید سے ایک بات کر رہی ہوں۔ ہاں بتاؤ۔"

ناہید نے کہا۔ "اچھا بتاتی ہوں سُنو! رات کے وقت سعد نے میدان سے آتے ہی تمہارے متعلّق پُوچھا۔ اور میں نے تمام واقعات بتا دیئے اور تمہارے دل کی حالت پہلے بھی اُس سے پوشیدہ نہ تھی۔ تمہیں یاد ہے جب ہم قلعے میں داخل ہو رہے تھے وہ تمہارے بھائی کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا تھا ــــ؟"

"تو اُس نے بھائی سے کیا کہا ہو گا؟"

"یہی کہ خالد کے ساتھ تمہاری شادی کر دی جائے۔"

"آپا سچ کہو۔ تم مذاق کرتی ہو؟"

"پگلی میں مذاق نہیں کرتی۔ تمہارا بھائی ابھی میری باتوں کی تصدیق کر دے گا۔"

زہرا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔ ناہید نے کہا۔ "ہائیں تم رو رہی ہو۔ کیا تمہیں میرا بھائی پسند نہیں"؟

اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں۔"

"تو میں خود تمہارے بھائی سے کہہ دیتی ہوں کہ وہ تمہیں شادی کے لئے مجبور نہ کرے۔ کہوں اُسے؟" یہ کہتے ہوئے ناہید ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔ لیکن زہرا آگے بڑھ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

میری بہن۔ میری آپا!" اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

ناہید نے کہا۔ "تو تم خالد کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہو؟"

زہرا نے اس کی طرف دیکھا، مسکرائی اور اُسے دُوسرے کمرے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔ "جاؤ تم بہت شریر ہو۔"

ناصرالدین نے باہر سے آواز دی۔ "زہرا! تمہاری باتیں کب ختم ہوں گی؟"

اُس نے بستر پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "آ جاؤ بھیا۔ بہن ناہید دوسرے کمرے میں چلی گئی ہے۔"

(۳)

ناصرالدین نے اندر پاؤں رکھتے ہی پوچھا "تمہارے زخموں کا اب کیا حال ہے؟"

اُس نے جواب دیا "بھیا وہ معمولی خراشیں تھیں میں بالکل ٹھیک ہوں"

ناصرالدین اُس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔ زہرا کا دِل دھڑک رہا تھا۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ناصرالدین نے کہا "زہرا! خالد ایک بہادر لڑکا ہے۔ میرا اِرادہ ہے تمہاری شادی اُس کے ساتھ کر دی جائے تمہیں یہ رشتہ پسند ہے؟"

زہرا نے جواب دینے کی بجائے دونوں ہاتھوں میں اپنا مُنہ چھپا لیا۔

ناصرالدین نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا "میرا اِرادہ تھا کہ سندھ فتح ہونے کے بعد تمہاری شادی دھوم دھام سے ہو۔ لیکن مسلمان ایسی رسُومات کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اِس کے علاوہ سندھ کے ساتھ ابھی فیصلہ کُن جنگ ہونے والی ہے۔ سپاہی کو اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے خالد کو سونپ دوں۔ ناہید تمہیں بہت چاہتی ہے۔ وُہ تمہارا خیال رکھے گی اور میں زیادہ اطمینان کے ساتھ اسلام کی خدمت کر سکوں گا۔ زہرا! اس بے سروسامانی میں میرے پاس تمہارے لئے نیک دُعاؤں کے سوا کچھ نہیں۔ اگر میرے پاس ساری دُنیا کی دولت ہوتی تو میں تم پر نچھاور کر دیتا۔"

"بھیّا! بھیا!!" اُس نے آگے جھک کر ناصر الدین کی گود میں سر رکھ دیا اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں"۔

اُس نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "زہرا! میرا ارادہ ہے کہ آج ہی تمہاری شادی کر دوں۔ فوج دو چار دن اور یہاں ٹھہرے گی لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اچانک دیبل سے راجہ کی فوج کی پیش قدمی کی اطلاع آجائے اور ہمیں فوراً کوچ کرنا پڑے۔ سعد، محمد بن قاسم سے ذکر کر چکا ہے اور وہ بہت خوش ہیں۔ سعد، خالد سے بھی پوچھ چکا ہے اور بہن ناہید کو بھی مبارک باد دو۔ سالارِ اعظم خود اُس کے بھائی کو بُلا کر اس کی رضامندی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ خود تم دونوں کا نکاح پڑھانا چاہتے ہیں"۔

باہر سے سعد نے ناصر الدین کو آواز دی اور وہ اُٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

زہرا نے اُٹھ کر برابر والے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ناہید! ناہید! تم نے سُنا، آج تمہاری شادی ہے"۔

"میری شادی؟" ناہید کے چہرے پر حیا اور مسرت کی سُرخ و سفید لہریں دوڑنے لگیں۔

ہاں ناہید تمہاری شادی۔ اب بتاؤ تمہیں بھیا زبیر پسند ہیں یا نہیں کہو نہیں۔ اور میں ابھی انہیں بُلا کر کہتی ہوں کہ وہ اپنے لیئے کوئی اور لڑکی تلاش کریں"!

ناہید نے کہا۔ "تم بہت شریر ہو زہرا!"

خالد نے برآمدے سے برابر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے ناہید

کو آواز دی - اور زہرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ناہید جلدی جاؤ۔ ورنہ تمہاری شادی سندھ کی فتح تک ملتوی ہو جائے گی۔ مَیں مذاق نہیں کرتی۔ تمہارا بھائی ابھی میری باتوں کی تصدیق کر دے گا۔"

ناہید زہرا کو محبّت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی دوسرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کا دِل خوشی کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ اُس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔

(۴)

شام کے وقت لشکر کے تمام سالار قلعے کے ایک وسیع کمرے میں جمع ہو کر زبیر اور خالد کو اُن کی شادی پر مبارک باد دے رہے تھے۔ ناہید اور زہرا اپنے کمرے میں بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ناہید نے کہا۔ "زہرا! نکاح کے وقت تمہاری زبان گنگ کیوں ہو گئی تھی؟"

"ناہید مجھے معلوم نہیں۔ تم جانتی ہو مجھے یہ اُمید نہ تھی کہ یہ تمام باتیں اِس قدر جلدی ہو جائیں گی۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ مَیں کہاں ہوں۔ اور پھر اگر نکاح پڑھانے والا محمد بن قاسم کی بجائے کوئی اور ہوتا تو مَیں شاید اِس قدر بدحواس نہ ہوتی۔ اُس کے چہرے پر کتنا جلال تھا اور اُس کی آواز کس قدر رعب دار تھی۔ سچ کہتی ہوں وُہ اِنسان نہیں دیوتا ہے اور ہمیں دیوتاؤں سے ڈرنا سکھایا گیا ہے۔ ناہید اگر تم میرے پاس نہ ہوتیں تو شاید میری زبان بالکل نہ کُھلتی۔ اُنہوں نے پُوچھا۔ "تمہیں خالد قبول ہے۔" اور مَیں شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ ناہید

مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ تمہارے بھائی کے ساتھ میری شادی ہو چکی ہے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں۔ کیا تمہیں اپنی شادی ایک خواب معلوم نہیں ہوتی؟"

ناہید مسکرائی اور زہرا اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اور ناہید اُس کے سیاہ اور خوبصورت بالوں سے کھیلنے لگی۔ اچانک اُس کے دِل میں ایک خیال آیا۔ اور اُس نے اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اُتار کر زہرا کے گلے میں ڈال دیا۔

زہرا نے کہا "نہیں نہیں یہ تمہیں اچھا لگتا ہے!"

ناہید نے جواب دیا "میرے پاس دُوسرا ہے۔ مجھے خالد دے گیا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اپنی ہیرے کی انگوٹھی اُتاری اور زہرا کے احتجاج کے باوجود اُس کی اُنگلی میں پہنا دی "دیکھو اگر تمہیں میری خوشی منظور ہے تو اسے مت اُتارو"۔ زہرا مغموم سی ہو کر ناہید کی طرف دیکھنے لگی۔ ناہید نے کہا۔ "زہرا! تم مغموم کیوں ہو گئیں۔ مجھے زیور اچھے نہیں لگتے۔ اور تمہارے مُلک میں زیور پہننے کا رواج ہے"۔

زہرا نے کہا "لیکن ہمارے مُلک میں بھابی نند سے لیتی نہیں، اُسے دیتی ہے اور میں گھر سے اِتنی دُور ......"

ناہید نے بات کاٹتے ہوئے کہا "پگلی بھابی تم آج بنی ہو۔ اس سے پہلے ایک عرصہ سے تم میری ننھی بہن تھیں"۔

زہرا نے کہا "ناہید سندھ کی فتح کے بعد بھائی کا ارادہ ہے۔ کہ

وہ کاٹھیاواڑ جا کر اسلام کی تبلیغ کریں۔ میرا ابھی ارادہ ہے کہ میں چند دن کے لئے وہاں جاؤں۔ کاش تم بھی چند دن کے لئے ہمارے ساتھ جاسکو۔ ہمارا گھر سمندر کے کنارے ایک چھوٹے سے قلعے میں ہے۔ اس کے تین طرف آموں کے وسیع باغات ہیں۔ بیچ میں سے ایک ندی گزرتی ہے۔ میں اس ندی کے کنارے آم کے ایک درخت پر جھولا جھولا کرتی تھی۔ برسات کے دنوں میں اِس ندی کا پانی بہت تیز ہوتا تھا اور میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہاں نہایا کرتی تھی۔ بارش میں ہم آم توڑ کر کھایا کرتیں۔ شہد کی طرح میٹھے آم۔ باغ سے پرے ایک خوبصورت جھیل تھی۔ ہم پانی میں کود کر آنکھ مچولی کھیلتیں۔ اور کنول کے پھول توڑ کر ایک دوسری پر پھینکتیں۔ ناہید میں تمہیں وہاں ضرور لے جاؤں گی۔"

ناہید نے جواب دیا۔" خدا ہمیں فتح دے۔ ممکن ہے کہ سندھ کے بعد ہماری افواج تمہارے ملک کا رُخ کریں۔"

زہرا نے کہا:" خدا وُہ دِن جلد لائے۔ اور میں اپنے ہاتھوں سے اُس قلعے پر اسلام کا پرچم لہراؤں۔ ناہید میں حیران ہوں کہ میرے خیالات میں اتنا بڑا تغیر کیونکر آگیا۔ مجھے اچھوتوں سے سخت نفرت تھی۔ ایک دن میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ جھیل پر گئی۔ وہاں ایک اچھوت لڑکا نہا رہا تھا۔ ہم نے اُسے پتھر مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ اور ایک دِن ایک نیچ ذات مسافر ہمارے باغ کے پاس سے گزرا۔ اُس نے نیچے گرے ہوئے چند آم اُٹھا لئے۔ اور ہمارے نوکروں نے اُسے آٹھ پہر تک ایک درخت کے

ساتھ باندھے رکھا۔ مَیں کئی دفعہ وہاں سے گزری۔ اور تم حیران ہو گی، کہ اُسے بھُوکا اور پیاسا دیکھ کر مجھے ذرا رحم نہ آیا۔ اب اگر مَیں وہاں گئی، تو آس پاس کی بستیوں کے تمام اچھُوتوں کو دعوت دُونگی کہ آؤ ہمارے باغ کے آم کھاؤ۔ ہماری جھیل میں نہاؤ اور ہمارے کوئیں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پیو۔ اُن کی سب سے بڑی حسرت ہمارے مندروں میں آ کر ہمارے دیوتاؤں کی پُوجا کرنا تھی اور مَیں اُنہیں یہ پیغام دُوں گی کہ مُسلمان اِس مُلک میں وُہ عبادت گاہیں تعمیر کرنے کے لئے آئے ہیں جن میں ایک اچھوت برہمن کے ساتھ بلکہ اُس سے آگے کھڑا ہو سکتا ہے۔"

ناہید نے کہا۔ "خدا تمہاری خواہش پُوری کرے۔"

(۵)

قلعے کو تمام فوج کی ضرورت کے لئے تنگ دیکھ کر محمد بن قاسم نے آدھی فوج کے لئے قلعے سے باہر خیمے نصب کروا دیئے۔ اپنی فوج کے زخمیوں کی طرح اُس نے بھیم سنگھ کی فوج کے زخمی سپاہیوں کو بھی خیموں میں جگہ دی۔ اور اپنی فوج کے طبیبوں اور جراحوں کو حکم دیا کہ وُہ دشمن کی فوج کے زخمیوں کے علاج میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔ محمد بن قاسم خود بھی علمِ جراحت اور طبابت میں خاصی دسترس رکھتا تھا۔ وہ صبح و شام زخمیوں کے خیموں میں چکر لگاتا۔ اور فرداً فرداً سب کا حال پُوچھتا اور اُنہیں تسلّی دیتا۔ دشمن کے زخمیوں سے تبادلۂ خیالات کے لئے وہ سعد کو اپنا ترجمان بنا کر ساتھ لئے پھرتا۔ انہیں ملول و مغموم دیکھ کر وُہ کہتا "تم بہت جلد اچھے

ہو جاؤ گے۔ یہ مت سمجھو کہ تم ہماری قید میں ہو۔ تندرست ہونے کے بعد تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔"

وہ اس کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہتے "بھگوان کے لئے آپ ہمیں شرمسار نہ کریں۔ ہمیں آپ کو اس قدر تکلیف دینے کا حق نہیں۔ آپ آرام کریں۔"

وہ جواب دیتا "نہیں یہ میرا فرض ہے۔"

بھیم سنگھ کے ساتھ محمد بن قاسم کو گہری دلچسپی تھی۔ وہ دونو وقت خود اس کے زخم دیکھتا اور اپنے ہاتھوں سے مرہم پٹی کرتا۔ ناصر الدین اور زبیر ہر طریقے سے اس کی دلجوئی کرتے۔ بھیم سنگھ نے ابتدا میں یہ سمجھا کہ یہ سلوک اس کے ساتھیوں کو ورغلانے کے لئے مسلمانوں کی ایک چال ہے لیکن تین چار دن کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ یہ تصنّع اور بناوٹ نہیں بلکہ محمد بن قاسم اور اس کے ساتھی فطرتاً عام انسانوں سے مختلف ہیں۔

اس کے زخم زیادہ خطرناک نہ تھے لیکن بہت سا خون بہ جانے کی وجہ سے اس کے جسم میں نقاہت آچکی تھی۔ محمد بن قاسم کے علاج اور زبیر اور ناصر الدین کی تیمارداری کی بدولت وہ چوتھے دن چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔

پانچویں دن حسب معمول نمازِ عشاء کے بعد محمد بن قاسم سعد کے ساتھ زخمیوں کے خیموں کا چکر لگاتا ہوا بھیم سنگھ کے خیمے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹا خواب کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا "نہیں نہیں مجھے دوبارہ اس

کے مقابلے پر نہ بھیجئے۔ وہ انسان نہیں دیوتا ہے۔ آپ قیدیوں کو چھوڑ دیجئے وہ آپ کی خطا معاف کر دے گا۔ نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔ راجہ کے پاپ کی سزا پرجا کو کیوں ملے ۔۔ مجھے موت کا ڈر نہیں لیکن میری جان لے کر تم آنے والی مصیبت کو نہیں ٹال سکتے ۔ ظالم ۔۔۔ بزدل۔ اُف! بھگوان ۔۔۔ !"

بھیم سنگھ نے کپکپا کر آنکھیں کھولیں اور حیرت زدہ ہو کر سعد اور محمد بن قاسم کی طرف دیکھنے لگا۔ محمد بن قاسم نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے تھے ۔ بھیم سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے یہ ظاہر کرتے تھے کہ خواب کی حالت میں وہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔

محمد بن قاسم نے آگے بڑھ کر اُس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہے ۔ زخم میں تکلیف تو نہیں؟"

اُس نے اپنے ہونٹوں پر مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں۔"

محمد بن قاسم نے کہا۔ "میری فوج کل صبح یہاں سے کوچ کرنے والی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ بعض مصلحتیں مجھے یہاں زیادہ دیر قیام کی اجازت نہیں دیتیں ورنہ میں چند دن اور تمہاری تیمارداری کرتا۔ بہر صورت میں پانچ سو سپاہی اس قلعے میں چھوڑ کر جا رہا ہوں ۔ وہ تم لوگوں کا خیال رکھیں گے ۔ تمہاری فوج کے جو زخمی تندرست ہو چکے ہیں انہیں

کل اپنے گھروں کو جانے کی اجازت ہو گی۔ تم جب تک گھوڑے کی سواری کے قابل نہیں ہوتے۔ یہیں ٹھہرو۔"

بھیم سنگھ نے کہا: "آپ کا مطلب ہے کہ آپ تمام قیدیوں کو رہا کر دیں گے؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا: "ہمارا مقصد لوگوں کو قیدی بنانا نہیں بلکہ ہم انہیں ایک استبدادی حکومت سے نجات دلا کر ایک ایسے نظام سے آشنا کرنا چاہتے ہیں جس کا بنیادی اصول مساوات ہے۔ آپ کے سپاہی ہمیں غیر ملکی حملہ آور سمجھ کر ہمارے مقابلے میں آئے تھے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ہماری جنگ وطن کے نام پر نہیں۔ قوم کے نام پر نہیں، ہم سندھ پر عرب کا تفوق نہیں چاہتے۔ ہم روئے زمین کے تمام انسانوں کی بہتری کے لئے ایک عالمگیر انقلاب چاہتے ہیں۔ ایک ایسا انقلاب جو مظلوم کا سر اونچا رکھنے کے لئے ظالم کی لاٹھی چھیننا چاہتا ہے۔ ہماری جنگ راجوں اور مہاراجوں کی جنگ نہیں۔ انسانوں اور بادشاہوں کی جنگ ہے۔ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم سندھ کے راجہ کا تاج اتار کر اپنے سر پر رکھ لیں۔ ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی شخص تاج و تخت کا مالک ہو کر دنیا پر اپنا قانون نافذ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ تاج اور تخت خود غرض انسانوں کے تراشے ہوئے بت ہیں، اور وہ قانون جو صرف ان بتوں کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے بنایا گیا ہو، انسانوں کو ہمیشہ دو جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک ظالم، دوسری مظلوم۔ تم ان جماعتوں کے لئے راجا اور پرجا کے الفاظ استعمال کرتے ہو۔ سندھ کے راجہ نے ہمارے جہاز

لُوٹ کر عورتوں اور بچّوں کو اِس لئے قیدی بنایا کہ وہ تاج و تخت کا مالک ہوتے ہوئے ہر انسان پر ظلم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا۔ اور اب وہ ہمارا مقابلہ صرف اِس لئے کرے گا کہ اُسے ظلم کی تلوار چھن جانے کا خطرہ ہے، اور یہ سپاہی ہمارے مقابلے میں اِس لئے آئے ہیں کہ انہیں ظلم کی اعانت کا معاوضہ ملتا ہے۔ اِن بے چاروں سے وہی کام لیا گیا ہے جو انسان سواری کے جانوروں سے لیتے ہیں۔ یہ مجبور تھے ایک استبدادی نظام کی وجہ سے اِن کے لئے زندگی کی راہیں تنگ تھیں۔ اور یہ معمولی معاوضہ لے کر ظلم کی اعانت کے لئے اپنی جانیں تک بیچ ڈالنے کے لئے تیار تھے انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ جس انقلاب کی راہ میں یہ رُکاوٹ بننا چاہتے ہیں، وُہ ان کی بہتری کے لئے ہے۔ انہیں ہماری طرف سے خوفزدہ کیا گیا تھا اب فتح کے بعد مَیں نہ خود ظالم بننا چاہتا ہوں نہ انہیں مظلوم بنانا چاہتا ہوں۔"

بھیم سنگھ نے کہا، "تو آپ کو یہ یقین ہے کہ یہ لوگ واپس جا کر راجہ کی فوجوں میں دوبارہ شامل نہیں ہو جائیں گے؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "مَیں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ واپس جا کر ان کا طرزِ عمل کیا ہوگا۔ لیکن مجھے اِن لوگوں سے کوئی خدشہ نہیں۔ مجھے خدا کی رحمت پر بھروسہ ہے کبھی بلند مقصد کے لئے لڑنے والوں کی قوّت بڑھتی ہے کم نہیں ہوتی۔ اِس سے پہلے کئی اقوام اپنے بادشاہوں کی حمایت میں ہمارے ساتھ لڑ چکی ہیں۔ لیکن جب اُنہیں یہ احساس ہُوا

کہ ہمارے پاس ایک بہتر نظام ہے تو وہ ہمارے ساتھ مل گئیں۔ آپ کے سپاہیوں میں سے وہ لوگ جنہیں خدا نے حق و باطل میں تمیز کی توفیق دی ہے وُہ یقیناً واپس جا کر ظلم کی ناؤ کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش نہیں کریں گے اور جو دوبارہ ہمارے مقابلے پر آنے کی جرأت کریں گے اُنہیں ایک دو اُدھر کے بعد اطمینان ہو جائے گا کہ ہماری تلواریں کُند ہونے والی نہیں۔"

بھیم سنگھ نے کہا "آپ تاج اور تخت کے دشمن ہیں۔ اور آپ انسان پر انسان کی حکومت کے قائل نہیں۔ لیکن جب تک کوئی حکومت نہ ہو مُلک میں امن کیسے رہ سکتا ہے؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا "اگر استبداد کا ڈنڈا مظلوم کی آواز اس کے گلے سے نہ نکلنے دے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مُلک میں امن قائم ہو گیا ہے۔ مَیں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہم دُنیا میں انسان کا قانون نہیں بلکہ خدا کا قانون چاہتے ہیں"

بھیم سنگھ نے جواب دیا "قانون خواہ کوئی ہو، اُسے نافذ کرنے والا بہرحال کوئی انسان ہو گا۔ اور وہ راجہ اور بادشاہ نہ بھی کہلائے تو بھی وہ حکمران ضرور ہو گا۔ اور جب تک دُنیا میں سرکش لوگ موجود ہیں ایسے قانون کی حفاظت طاقت کے ڈنڈے کے بغیر ممکن نہیں۔"

محمد بن قاسم نے کہا "یہ درست ہے لیکن اس قانون کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ اسے نافذ کرنے والی جماعت صالحین کی جماعت ہو۔ جب تک ہم صالحین کی جماعت سے تعلق رکھیں گے، خدا اپنے قانون کی حفاظت کا کام

ہم سے لے گا۔ کل اگر تمہارے ملک سے کوئی قوم صالحین کی جماعت بن جائے تو اِس قانون کے نفاذ کی ذمہ داری وہ سنبھال لے گی لیکن طاقت کا ڈنڈا اُسے اپنے اقتدار کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ اِس قانون کی حفاظت کے لئے استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔ مسلمانوں کے امیر اور دوسری اقوام کے بادشاہوں میں یہ فرق ہے کہ وہ طاقت کا ڈنڈا ظالم کے خلاف مظلوم کی اعانت کے لئے استعمال کرتے ہیں اور بادشاہ اسے فقط اپنے دائمی تسلط کے لئے استعمال کرتے ہیں۔"

بھیم سنگھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا۔ "تو کیا مجھے بھی اِن لوگوں کے ساتھ واپس جانے کی اجازت ہوگی؟"

"مَیں شاید پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم تندرست ہونے کے بعد جب چاہو جا سکتے ہو۔"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "مَیں سفر کے قابل ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو مَیں کل ہی روانہ ہو جاؤں۔"

"ابھی تک تمہارے زخم ٹھیک نہیں ہوئے۔ لیکن اگر تم کل ہی جانا چاہو تو مَیں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

بھیم سنگھ پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "لیکن آپ کو شاید معلوم نہ ہو۔ مَیں سندھ کے سینا پتی کا لڑکا ہوں اور میرا واپس جا کر فوج کے ساتھ شامل ہو جانا آپ کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ اِس لئے اگر آپ مجھے چھوڑنے سے پہلے مجھ سے یہ وعدہ لینا چاہتے ہیں کہ مَیں دوبارہ آپ

کے مقابلے پر نہ آؤں تو میں اس شرط پر جانے کے لئے تیار نہیں۔"

"میں نے تم کو ایسا وعدہ کرنے کے لئے نہیں کہا۔ ہاں میں تمہیں فقط ایک بات کہوں گا۔ تم راجہ داہر کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ اب اروڑ ہم سے دُور نہیں۔ اگر اُس نے عرب قیدیوں کے ساتھ بُرا سلوک کیا تو اُس کے لئے اچھا نہ ہوگا۔"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "میں یہ وعدہ کرتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ جب اُسے میرے زخمی سپاہیوں کے ساتھ آپ کے سلوک کا پتہ چلے گا، تو وہ یقیناً متاثر ہوگا۔"

"میں نیکی کا بدلہ نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اُس کی آنکھوں سے غرور کی پٹی اُتار دو اور اُسے یہ بتا دو کہ وہ ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑا ہے۔ ہاں اس گفتگو کے دَوران میں میں نے شاید کوئی تلخ بات کہہ دی ہو۔ اگر تمہیں کسی بات سے رنج پہنچا ہو تو مجھے ایک انسان سمجھ کر درگزر کرنا۔"

محمد بن قاسم یہ کہہ کر خیمے سے باہر نکل آیا۔ بھیم سنگھ بار بار اپنے دِل میں یہ کہہ رہا تھا۔ "تم انسان نہیں دیوتا ہو!"

صبح کا ستارہ

(۱)

چند دن بعد محمد بن قاسم کی فوج دیبل سے چند کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال چکی تھی۔ رات کے تیسرے پہر محمد بن قاسم نے اٹھ کر نمازِ تہجد ادا کی اور زبیر کو ساتھ لے کر لشکرگاہ کا ایک چکّر لگایا۔ دن بھر کے تھکے ماندے سپاہی گہری نیند سو رہے تھے۔ پہرہ دار اپنی اپنی جگہ پر چوکس کھڑے تھے۔ سمندر کی نمی سے لدی ہوئی ہوا میں چند ساعتیں سونے کی وجہ سے محمد بن قاسم اپنے اعضا میں کسل محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے زبیر سے کہا۔ "آؤ زبیر! اس ٹیلے پر چڑھیں۔ دیکھیں اس کی چوٹی پر پہلے کون پہنچتا ہے۔ ہوشیار! ایک — دو — تین!"

دونوں بھاگتے ہوئے ٹیلے کی چوٹی کے قریب پہنچے۔ محمد بن قاسم زبیر سے چند قدم آگے جا چکا تھا۔ لیکن اُوپر سے پہرے دار نے آواز دی "ٹھیرو! کون ہے؟"

محمد بن قاسم نے رُک کر جواب دیا۔ "محمد بن قاسم"۔

پہرے دار نے آواز پہچان کر کہا "سالارِ اعظم آپ مطمئن رہیں۔ ہم اپنے فرائض سے غافل نہیں"۔

اتنی دیر میں زبیر محمد بن قاسم سے آملا۔

محمد بن قاسم نے سمندر کی تر و تازہ ہوا میں چند سانس لئے اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سولہویں رات کی چاندنی میں ستاروں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ فضا میں اِدھر اُدھر اُڑنے والے جگنو صبح کے چراغ نظر آتے تھے۔ چاند کی روشنی نے نیلگوں سمندر کو ایک چمکتا ہوا آئینہ بنا دیا تھا۔ مشرق سے صبح کا ستارہ نمودار ہوا۔ محمد بن قاسم نے زبیر کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"زبیر! دیکھو یہ ستارہ کس قدر اہم ہے۔ لیکن اس کی زندگی کتنی مختصر ہے یہ دُنیا کو ہر صبح آفتاب کی آمد کا پیام دینے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ سُورج کے چہرے سے تاریکی کا نقاب اُلٹ کر اپنے چہرے پر ڈال لیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو اہمیت اسے حاصل ہے وُہ دوسرے ستاروں کو حاصل نہیں۔ اگر یہ بھی دوسرے ستاروں کی طرح تمام رات چمکتا تو ہماری نگاہوں میں اس کا رُتبہ اس قدر بلند نہ ہوتا۔ ہم تمام رات آسمان پر کروڑوں ستارے دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ ستارہ ہمارے لئے اُن سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ہے۔ عام ستاروں کی موت و حیات ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بالکل اُن انسانوں کی طرح جو دُنیا میں چند سال ایک بے مقصد زندگی بسر کرنے کے بعد مر جاتے ہیں۔ جو زندگی کے ساتھ آخری دم تک چمٹنے کی کوشش کرتے ہیں، اور دُنیا کو اپنی

موت وحیات کا مفہوم بتانے سے قاصر رہتے ہیں۔ زبیر مجھے اِس ستارے کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ اس کی زندگی جس قدر مختصر ہے اُسی قدر اُس کا مقصد بلند ہے۔ دیکھو یہ دُنیا کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ میری عارضی زندگی پر اظہارِ تأسف نہ کرو۔ قدرت نے مجھے سُورج کا ایلچی بنا کر بھیجا تھا اور میں اپنا فرض پُورا کر کے جا رہا ہوں۔ کاش! میں بھی اِس مُلک میں آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے صبح کے ستارے کا فرض ادا کر سکوں"۔

زبیر محمد بن قاسم کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک بچے کی سی معصومیت، چاند کی سی دلفریبی، سُورج کا سا جاہ وجلال اور صبح کے ستارے کی سی رعنائی اور پاکیزگی تھی۔

چند قدم کے فاصلے سے ایک پہرے دار نے آواز دی "ٹھہرو کون ہے؟"

نیچے سے جواب آیا "میں ہوں سعد"

محمد بن قاسم نے چند قدم آگے بڑھ کر سعد کو سندھی لباس میں ٹیلے پر چڑھتے ہوئے دیکھ کر پہرہ داروں کو آواز دی۔ "اسے میری طرف آنے دو!"

سعد نے ٹیلے پر چڑھ کر پڑاؤ کی طرف اُترنا چاہا۔ لیکن پہرہ دار نے اُس کا راستہ روکتے ہوئے محمد بن قاسم کی طرف اشارہ کیا اور کہا "پہلے اس طرف جاؤ"۔

سعد نے بے پروائی سے جواب دیا "نہیں میں سپہ سالار کو دیکھے بغیر کسی سے بات کرنے کے لئے تیار نہیں"۔

محمد بن قاسم نے آواز دی "سعد میں اِدھر ہوں"۔

سعد نے چونک کر محمد بن قاسم کی طرف دیکھا اور آگے بڑھا۔

محمد بن قاسم نے سوال کیا "کہو کیا خبر لائے؟"

سعد نے جواب دیا "دیبل کی حفاظت کرنے والی فوج کی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ سندھ کے باقی شہروں سے مزید کمک کے انتظار میں قلعہ بند ہو کر لڑنے کی کوشش کریں گے"۔

محمد بن قاسم نے کہا "کیا یہ ممکن ہے کہ اگر ہم اس جگہ دو تین دن قیام کریں تو وہ شہر سے پیش قدمی کر کے ہم پر حملہ کر دیں"۔

سعد نے جواب دیا "اس بات کے کوئی آثار نہیں۔ وہ لس بیلا کا پہاڑی قلعہ فتح ہو جانے کے بعد ناہموار زمین پر لڑنا اپنے لئے مفید خیال نہیں کرتے"۔

محمد بن قاسم نے کہا "تو ہمیں کسی تاخیر کے بغیر پیش قدمی کر دینی چاہیئے"۔

(۲)

دیبل کے محاصرے کو پانچ دن گزر چکے تھے۔ اس دوران میں محمد بن قاسم کی فوج نے دبابوں کی مدد سے متعدد بار شہر کی فصیل پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ لکڑی کے دبابے جب شہر پناہ کے قریب پہنچتے، راجہ کے سپاہی اُن پر جلتا ہوا تیل انڈیل دیتے اور مسلمانوں کو آگ کے شعلوں میں پیچھے ہٹنا پڑتا۔ محمد بن قاسم اپنے ساتھ ایک بہت بڑی منجنیق لایا تھا جسے پانچ سو آدمی کھینچتے تھے۔ اِس منجنیق کا نام "عروس" مشہو

ہو چکا تھا۔ پہاڑی راستے کے نشیب و فراز کا خیال کرتے ہوئے عروس کو سمندر کے راستے دیبل کے قریب لا کر خشکی پر اُتارا گیا۔ اور محاصرے کے پانچویں دن محمد بن قاسم کے سپاہی اُسے دھکیل کر شہر پناہ کے سامنے لے آئے۔ اس سے قبل چھوٹے چھوٹے منجنیق شہر کی فصیل کو چند مقامات سے کمزور کر چکے تھے۔ شہر کے سپاہی عروس کی غیر معمولی ضخامت سے اُس کی اہمیت کا اندازہ لگا کر گھبرا گئے۔ شام سے پہلے عروس سے چند وزنی پتھر شہر میں پھینکے گئے اور راجہ نے یہ محسوس کیا کہ دیبل کی مضبوط فصیل زیادہ عرصہ اس مہیب ہتھیار کے سامنے نہ ٹھہر سکے گی۔

چھٹے روز علی الصبح محمد بن قاسم نے عروس کی مدد سے شہر پر سنگباری شروع کی۔ شہر کے درمیان ایک مندر کے بلند گنبد پر ایک سُرخ رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ مندر کے گنبد کی طرح یہ جھنڈا بھی تمام جھنڈوں سے اُونچا تھا۔ محمد بن قاسم کو اِس جھنڈے کی اہمیت کا احساس ہوا، اور ایک روایت کے مطابق دیبل کے گورنر کے ہاتھوں ستائے ہوئے ایک برہمن نے شہر سے فرار ہو کر محمد بن قاسم کو اطلاع دی کہ جب تک یہ جھنڈا نہیں گرتا، شہر کے لوگ ہمت نہیں ہاریں گے۔

محمد بن قاسم کو منجنیق کے استعمال میں غیر معمولی مہارت تھی۔ چنانچہ اُس نے عروس کا رُخ درست کر کے سپاہیوں کو پتھر پھینکنے کا حکم دیا۔ بھاری پتھر کی ضرب نے گنبد کے ٹکڑے اُڑا دیئے اور اُس کے ساتھ سُرخ جھنڈا بھی نیچے آ رہا۔

اس گنبد کے مسمار ہونے اور جھنڈے کے گرنے سے راجہ کے توہم پرست سپاہیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ تاہم اُنہوں نے شام تک مسلمانوں کی فوج کو قلعے کے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ شام کے دھندلکے میں فصیل کے تیراندازوں کی مدافعت کمزور ہونے لگی۔ محمد بن قاسم نے ایک فیصلہ کن حملے کا حکم دیا۔ اور اُس کے سپاہی اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے دبابوں، سیڑھیوں اور کمندوں کی مدد سے قلعے کی دیواروں پر چڑھنے لگے۔

راجہ کی فوج نے رات کے تیسرے پہر تک مقابلہ کیا لیکن اتنی دیر میں مسلمانوں کی فوج کے سینکڑوں سپاہی فصیل پر چڑھ چکے تھے اور منجنیق کی سنگ باری کی بدولت قلعے کی دیوار بھی ایک مقام سے ٹوٹ چکی تھی۔

راجہ داہر نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہی شہر کا مشرقی دروازہ کھلوا دیا۔ اور ہاتھیوں کی مدد سے فوج کے لئے راستہ صاف کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ مسلمان شہر پناہ کے چاروں طرف منقسم ہونے کی وجہ سے دروازے پر موثر مزاحمت نہ کر سکے۔ ہاتھی مشرقی دروازے کے سامنے اُن کے مورچے توڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اور اُن کے پیچھے راجہ کی تیس ہزار فوج لڑتی بھڑتی نکل گئی۔ محمد بن قاسم کی فوج نے چاروں طرف سے سمٹ کر دروازے پر حملہ کر دیا۔ اور باقی سپاہیوں کے راستے میں مضبوط صفیں کھڑی کر دیں۔ اُنہوں نے راجہ کی محبت سے زیادہ اپنے انجام سے خوفزدہ ہو کر باہر نکلنے کا راستہ صاف کرنے کے لئے چند زوردار حملے کئے۔ لیکن مسلمانوں نے

آن کی آن میں دروازے کے سامنے لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ وہ بد دل ہو کر پیچھے ہٹے اور مسلمانوں کی فوج پانی کے ایک زبردست ریلے کی طرح شہر کے اندر داخل ہو گئی۔

اتنی دیر میں کئی دستے مختلف راستوں سے شہر پناہ کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

راجہ کی بچی کھچی فوج نے چاروں اطراف سے اللہ اکبر کے نعرے سُن کر ہتھیار ڈال دیئے۔

(۳)

محمد بن قاسم نے اپنی فوج کے ساتھ دیبل کے گورنر کے محل میں صبح کی نماز ادا کی اور طلوع آفتاب کے وقت دیبل کے دہشت زدہ باشندے اپنے مکانوں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر فاتح افواج کے سترہ سالہ سپہ سالار کا جلوس دیکھ رہے تھے۔ بیلا کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے جن اسیرانِ جنگ کو آزاد کیا تھا اور جن زخمیوں کی مرہم پٹی کی تھی وہ عوام کو ہندوستان میں ایک نئے دیوتا کی آمد کا پیغام دے چکے تھے۔ اُس کی کم سنی، شجاعت، عفو اور رحم کے متعلق ایسی داستانیں مشہور ہو چکی تھیں، جن کی صداقت پر استبدادی حکومت کے ستائے ہوئے عوام اعتبار کرنے کو تیار نہ تھے۔ گزشتہ چند دن میں دیبل کے شہریوں کو راجہ کی فوج کے سپاہی سخت اذیتیں دے چکے تھے۔ دیبل میں راجہ کی فوجوں کی آمد کے بعد اُن کے گھر اپنے گھر نہ تھے۔ سپاہی رات کے وقت شراب کے نشے میں بدمست ہو کر لوگوں کے

گھروں میں گھستے اور لوٹ مار کر کے نکل آتے۔ صبح کے وقت شرم وحیا کی دیویاں پھٹے ہوئے پیرہن اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ بازاروں میں گشت لگانے والے افسروں کو اپنی مظلومیت کے قصے سناتیں۔ لیکن اُنہیں شرمناک قہقہوں کے سوا کوئی جواب نہ ملتا۔

اپنے راجہ کی فوج کا یہ سلوک دیکھ کر دیبل کے باشندے محمد بن قاسم کے عفو ورحم کے متعلق کئی داستانیں سُننے کے باوجود فاتح لشکر سے نیک سلوک کی توقع رکھنے کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن جب محمد بن قاسم کی فوج اپنے سالار کی طرح نگاہیں نیچی کئے دیبل کے ایک بازار سے گزر رہی تھی، اُن کے شبہات آہستہ آہستہ دُور ہونے لگے اور مردوں کے علاوہ عورتیں بھی مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر کھڑی ہو گئیں۔ جب محمد بن قاسم شہر کا چکر لگانے کے بعد دوبارہ محل کے قریب پہنچا۔ ایک نوجوان لڑکی نے بھاگ کر اُس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ اور ہونٹ بھینچتے ہوئے محمد بن قاسم کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ خوبصورت چہرے پر خراشوں کے نشان تھے۔ آنکھیں غم وغصہ کے باعث سُرخ تھیں۔ محمد بن قاسم کو وہ گلاب کے ایک ایسے پھول سے مشابہ نظر آئی جسے کسی کے بے رحم ہاتھوں نے مسل ڈالا ہو۔

اُس نے ترجمان کی وساطت سے کہا "خاتون! اگر یہ میرے کسی سپاہی کا فعل ہے تو میں اُسے تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل کروں گا۔"

لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔ اُس کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھوں

سے آنسوؤں کے دھارے پھوٹ نکلے۔

ایک عمر رسیدہ اور باوضع آدمی آگے بڑھا اور اُس نے ہاتھ باندھ کر کہا "اَن داتا! یہ اُن کئی معصوم لڑکیوں میں سے ایک ہے جو راجہ کے سپاہیوں کی بربریت کا شکار ہو چکی ہیں۔ آپ سے انصاف مانگنے آئی ہے"!

ناصرالدین نے اِس عمر رسیدہ شخص کی ترجمانی کرتے ہوئے محمد بن قاسم کو یہ بتایا کہ یہ دیبل کا پروہت ہے۔

محمد بن قاسم نے جواب دیا "آپ میرے سامنے ہاتھ نہ باندھیں اس لڑکی کی داد رسی میرا سب سے پہلا فرض ہے۔ راجہ کے بارہ ہزار سپاہی ہماری قید میں ہیں۔ آپ اسے وہاں لے جائیں۔ اگر مجرم اُن میں سے کوئی ہوا تو میں اُسے آپ کے حوالے کردوں گا۔ ورنہ میں اِس ملک کی آخری حدود تک اس کا تعاقب کروں گا"

لڑکی نے کہا "میرا مجرم دیبل کا گورنر ہے۔ اُس نے پہلے میرے پتا کو قید کر لیا تھا اور مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ " یہاں تک کہہ کر اُسکی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے پھر ایک بار آنسو بہنے لگے۔ محمد بن قاسم نے اپنے ایک سالار کو بلا کر کہا "میں دیبل کے تمام قیدیوں کو آزاد کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ تم قید خانے کے دروازے کھلوا دو"

(۴)

اگلے دن دیبل کے سب سے بڑے مندر کا پروہت پجاریوں کے سامنے عرب کے ایک نوجوان کے روپ میں بھگوان کے ایک نئے اوتار کی

آمد کا پرچار کر رہا تھا۔ اور دیبل کا سب سے بڑا سنگ تراش دیبل کے محسن کے لئے محبت اور عقیدت کے جذبات سے سرشار ہو کر شہر کے بڑے مندر کی زینت میں اضافہ کرنے کے لئے عرب کے کمسن سالار کی مورتی تراش رہا تھا۔ محمد بن قاسم نے جنگ میں مقتولین کے ورثا کے لئے معقول وظائف مقرر کئے۔ ناصر الدین کو دیبل کا گورنر مقرر کیا اور ایک گراں رقم اُس مندر کی مرمت کے لئے منظور کی جو منجنیق کے پتھر کا نشانہ بن کر مسمار ہو چکا تھا۔

دس دن کے بعد اُس نے نیرون کا رُخ کیا۔ اِس عرصہ میں اُس کے حسنِ سلوک سے دیبل کے باشندوں پر اُس کی تلوار کے زخم مندمل ہو چکے تھے اور اُسے اُن میں سے اکثر کے قلوب پر مکمل فتح حاصل ہو چکی تھی۔ دیبل سے رخصت کے وقت ہزاروں مردوں، عورتوں اور بوڑھوں نے احسان مندی کے آنسوؤں کے ساتھ اُسے الوداع کہی۔ اُس کی فوج میں دیبل کے پانچ ہزار سپاہی شامل ہو چکے تھے۔

محمد بن قاسم نے رخصت ہونے سے پہلے زبیر، ناہید، خالد اور زہرا کو ناصر الدین کے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت دی لیکن اُنہوں نے شہر کے محلات میں آرام کرنے کی بجائے جنگ کے میدانوں میں بے آرامی کے دن اور راتیں کاٹنے کو ترجیح دی۔ تاہم زبیر اور خالد نے محمد بن قاسم کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے، ناہید اور زہرہ کو دیبل میں چھوڑ دیا۔

سِندھ کا نیا سپہ سالار

(۱)

نیرون کے قلعے کے ایک وسیع کمرے میں راجہ داہر ایک سونے کی کرسی پر رونق افروز تھا۔ اودھے سنگھ، سندھ کی افواج کا سیناپتی اور جے سنگھ، سندھ کا ولی عہد اُس کے سامنے کھڑے تھے۔ اودھے سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! اگر اجازت ہو تو بھیم سنگھ کو اندر بُلا لوں!"

راجہ نے تلخ لہجہ میں جواب دیا۔ "میں اُس کی صُورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگر وہ تمہارا بیٹا نہ ہوتا تو میں اُسے مست ہاتھی کے آگے ڈلوا دیتا۔"

اودھے سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! وہ بے قصور ہے۔ اگر ہم پچاس ہزار فوج کے ساتھ دیبل کی حفاظت نہیں کر سکے تو وہ بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اُس کا راستہ کیسے روک سکتا تھا؟"

"لیکن وہ یہ دعویٰ لے کر گیا تھا کہ وُہ دشمن کو پہاڑی علاقہ سے آگے نہیں گزرنے دے گا۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ اگر دشمن کی فوج ہمارے بیس ہزار سپاہیوں کے پتھروں کی بارش میں دب کر نہ رہ گئی تو وہ واپس آ کر مُنہ نہیں دکھائے گا۔"

"مہاراج! مَیں نے کبھی اُس کی تائید نہیں کی۔ مجھے دشمن کی شجاعت کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ اگر وہ دیبل میں ہماری پچاس ہزار فوج کے تیروں کی بارش میں کمندیں ڈال کر فصیل پر چڑھ سکتے تھے تو بیس ہزار سپاہیوں کے پتھر انہیں پہاڑیوں پر قبضہ جمانے سے نہیں روک سکتے تھے!"

راجہ نے گرج کر کہا۔ "میرے سامنے دیبل کے پچاس ہزار سپاہیوں کا نام نہ لو۔ اُن میں نصف کے قریب دیبل کے ڈرپوک تاجر تھے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ پرتاب رائے نے دیبل کے خزانے سے سپاہیوں کی بجائے بھیڑیں پال رکھی ہیں۔"

اودھے سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! مَیں شروع سے اِس بات کے خلاف تھا کہ آپ دیبل جائیں۔ راجہ کا شکست کھا کر بھاگنا فوجوں پر بہت بُرا اثر ڈالتا ہے۔"

راجہ نے کہا۔ "بھگوان کا شُکر ہے کہ مَیں نے تمہارا کہا نہیں مانا۔ ورنہ یہ تیس ہزار فوج بھی یہاں بچ کر نہ پہنچتی۔"

اودھے سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! اگر آپ بھاگنے میں جلد بازی سے کام نہ لیتے تو ....."

راجکمار جے سنگھ نے اُودھے سنگھ کا فقرہ پُورا نہ ہونے دیا اور چِلّا کر کہا۔ "اُودھے سنگھ ہوش میں آکر بات کرو۔ مہاراج کو اِس لئے دیبل چھوڑنا پڑا کہ اُس کے ساتھی تمہاری طرح نکمّے اور بُزدِل تھے۔"

اُودھے سنگھ کی قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ تاہم اُس نے

ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "راجکمار آپ جانتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ مہاراج کی عزت کسی اور کے دل میں نہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بھیم سنگھ بزدل نہیں۔ وہ آپ کے ساتھ کھیلا ہے۔"

"وہ بزدل نہیں لیکن بیوقوف ضرور ہے۔ پھر بھی میں پتاجی سے کہوں گا کہ اُسے یہاں حاضر ہونے کا موقع دیں۔"

راجہ نے جے سنگھ کی طرف دیکھا اور پھر اُودھے سنگھ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "بلاؤ اُسے۔"

اُودھے سنگھ نے دروازے پر ایک سپاہی کو اشارہ کیا اور وُہ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں بھیم سنگھ اندر داخل ہُوا۔ اور آداب بجا لانے کے بعد ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

راجہ نے پُوچھا۔ "تم شکست کے بعد سیدھے دیبل کیوں نہ پہنچے؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "مہاراج! مجھے یہ علم نہ تھا کہ آپ دیبل پہنچ جائیں گے۔ اور مَیں نے آپ سے چند ضروری باتیں عرض کرنے کے لئے نیرون پہنچنا ضروری خیال کیا۔"

"لیکن تمہارا فرض تھا کہ تم رہی سہی فوج کے ساتھ دیبل پہنچتے!"

"مہاراج کو شاید معلوم نہیں کہ مَیں زخمی ہونے کے بعد چند دن دشمن کے قبضے میں رہا۔ اور جب مَیں آزاد ہُوا میرے ساتھ صرف چند زخمی سپاہی تھے اور انہیں کسی محفوظ جگہ پہنچانا میرا فرض تھا۔"

راجہ نے کہا۔ "بھیم سنگھ! دیبل اور بیلا کی جنگوں میں ہماری شکست

کے ذمہ دار فقط تم ہو۔ اگر تم پہاڑوں میں دشمن کا راستہ روک سکتے تو ہمیں دیبل میں ناکامی کا مُنہ نہ دیکھنا پڑتا۔ میں نے تمہارے باپ کی مرضی کے خلاف تمہیں یہ موقع دیا تھا۔ اب میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ آئندہ کوئی مہم تمہارے سپرد نہ کی جائے۔"

بھیم سنگھ نے جواب دیا "مہاراج! میں خود بھی کوئی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے تیار نہیں۔"

راجہ نے آنکھیں پھاڑ کر بھیم سنگھ کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں کہا "تو یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

اودھے سنگھ نے اپنے بیٹے کے جواب پر پریشان ہو کر کہا "مہاراج بھیم سنگھ کا مطلب یہ ہے کہ اسے بڑے عہدے کی ضرورت نہیں۔ وہ آپ کی فتح کے لئے ایک سپاہی کی حیثیت میں لڑنا بھی اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہے۔ بھیم سنگھ! ان داتا تم سے خفا ہیں اُن کے پاؤں پکڑ لو۔"

بھیم سنگھ نے جواب دیا "پتا جی! ان داتا کی تعظیم سر آنکھوں پر لیکن میں ان کے سامنے جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ میں زخمی تھا اور دشمن کی فوج کے سپہ سالار نے اپنے ہاتھوں سے میری مرہم پٹی کی۔ میری جان بچائی اور مجھ سے دوبارہ اپنے مقابلے پر نہ آنے کا وعدہ لئے بغیر آزاد کر دیا۔ مجھے یہاں پہنچنے کے لئے اپنا گھوڑا دیا۔"

اودھے سنگھ نے پھر مداخلت کی "مہاراج! ہمارا دشمن بہت ہوشیار ہے۔ اُس کا خیال یہ ہو گا کہ وہ اِس طرح چاپلوسی کر کے بھیم سنگھ کو ورغلا سکے گا

لیکن اُسے کیا معلوم کہ بھیم سنگھ کے باپ دادا آپ کے نمک خوار ہیں۔ اور اس کی رگوں میں راجپوت کا خون ہے۔ اور یہ آپ کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے گا۔"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "پتاجی اگر وہ میری جان نہ بچاتا تو میرے خون کا آخری قطرہ میدانِ جنگ میں بہہ چکا ہوتا۔ مَیں نہیں جانتا کہ اُس نے میری جان کس نیت سے بچائی ہے۔ لیکن مَیں اب اُس کے خلاف ہتھیار نہیں اُٹھا سکتا۔"

بھیم سنگھ نے اپنی تلوار اُتار کر راجہ کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "مہاراج یہ مجھے آپ نے عطا کی تھی۔ لیجئے۔"

راجہ غصّے سے کانپنے لگا۔ اور راجکمار جے سنگھ نے بھیم سنگھ کے ہاتھ سے تلوار چھینتے ہوئے کہا۔ "بزدل! کمینہ!!"

اُودھے سنگھ کہہ رہا تھا۔ "بھیم سنگھ تمہیں کیا ہو گیا۔ مہاراج سے معافی مانگو۔ وہ تمہاری تقصیر معاف کر دیں گے۔ بھیم سنگھ! مجھے شرمسار نہ کرو۔ دُنیا کیا کہے گی۔ تم تو کہتے تھے کہ تم مہاراج کو جنگ کے متعلق ایک ضروری مشورہ دینے کے لئے آئے ہو۔" مہاراج! مہاراج!! میرا بیٹا بے قصور ہے۔ دشمن نے اس پر جادو کر دیا ہے۔"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "ہاں مہاراج! اُس نے مجھ پر جادو کر دیا ہے اگر آپ نے اُسے سمجھنے کی کوشش نہ کی تو کسی دن اُس کا جادو تمام سندھ پر چھا جائے گا۔ مہاراج! مَیں آپ کو اُس کے جادو سے بچنے کا طریقہ بتانے

کے لئے آیا تھا۔"

اُودھے سنگھ نے چلّا کر کہا۔ "بھیم سنگھ جاؤ، بھگوان کے لئے جاؤ۔"

راجہ نے کہا۔ "اُودھے سنگھ تم اب خاموش رہو۔ تمہارا بیٹا ہماری اجازت سے یہاں آیا ہے اور ہماری اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا۔ ہاں بھیم سنگھ تم ہمیں دشمن کے جادو سے بچنے کا طریقہ بتا رہے تھے۔"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! وہ یہ ہے کہ آپ عرب اور سراندیپ کے قیدیوں کو دشمن کے حوالے کر دیں۔ ورنہ ہمارے خلاف جو طوفان عرب سے اُٹھا ہے وہ مجھے رُکنے والا نظر نہیں آتا۔"

راجہ اچانک کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تم اب دشمن کے طرفدار بن کر مجھ پر اُس کی طاقت کا رُعب بٹھانے کے لئے آئے ہو؟"

بھیم سنگھ نے اطمینان سے جواب دیا۔ "مہاراج آپ دیبل میں اُسے دیکھ چکے ہیں۔"

راجہ نے چلّا کر کہا۔ "دیبل۔ دیبل۔ میرے سامنے دیبل کا ذکر نہ کرو۔ وہاں مندر کا گنبد گر جانے سے تمہارے جیسے بزدل سپاہیوں نے ہمت ہار دی تھی۔"

"مہاراج! میں بزدل نہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بزدل ہوں۔ کوئی ہے؟"

اودھے سنگھ نے ہاتھ باندھ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مہاراج! مہاراج!! اس کی خطا معاف کیجئے۔ ہم سات پشتوں سے آپ کے خاندان

کی خدمت کر رہے ہیں۔"

راجہ نے جھلا کر جواب دیا۔ "مجھے تمہارے خاندان کی خدمات کی ضرورت نہیں"۔

پندرہ بیس سپاہی ننگی تلواریں لئے کمرے میں داخل ہوئے اور راجہ کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ راجہ نے بھیم سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے لے جاؤ اور نیرون کے قید خانے کی سب سے تاریک کوٹھڑی میں رکھو۔"

اودھے سنگھ نے کہا۔ "مہاراج اس کی خطا معاف کیجئے یہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔"

جے سنگھ نے آگے بڑھ کر راجہ کے کان میں کچھ کہا۔ اور اس نے اودھے سنگھ کو جواب دیا۔ "تم بھی اس کے ساتھ جا سکتے ہو۔ سندھ کو تمہارے جیسے سپہ سالار کی ضرورت نہیں۔"

عقب کے کمرے کا پردہ اٹھا اور لاڈھی رانی جلدی سے راجہ کے قریب آکر کہنے لگی۔ "مہاراج! آپ کیا کر رہے ہیں۔ اودھے سنگھ فوج کا سینا پتی ہے اور فوج اس کے ساتھ برا سلوک برداشت نہ کرے گی۔"

جے سنگھ نے جلدی سے جواب دیا۔ "جب فوج کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ باپ بیٹا دشمن کے ساتھ ملے ہوئے ہیں وہ سب کچھ برداشت کرے گی۔"

رانی نے کہا۔ "بیٹا! دشمن سر پر کھڑا ہے۔ یہ آپس میں پھوٹ ڈالنے کا وقت نہیں۔"

جے سنگھ نے جواب دیا "دشمن کی آخری منزل دیبل تھی۔ وہ دریائے سندھ کبھی عبور نہیں کر سکے گا۔ پتاجی آپ فکر نہ کریں۔ چند دنوں میں ملتان سے لے کر قنوج تک تمام راجے اور سردار ہماری مدد کے لئے پہنچ جائیں گے اور ہم دشمن کو ایسی شکست دیں گے جو اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہو گی۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ ان دونوں کو یہاں رکھنے کی بجائے ارور بھیج دیا جائے۔ سپاہیو! کیا دیکھتے ہو۔ تم نے مہاراج کا حکم نہیں سُنا؟ انہیں لے جاؤ۔"

سپاہی آگے بڑھے لیکن اُودھے سنگھ نے اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے اپنی تلوار اُتاری اور جے سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا "یہ لیجئے۔ یہ سیناپتی کی تلوار ہے۔ مجھے دشمن پر سندھ کی فوج کی فتح سے زیادہ کسی اور بات کی خواہش نہیں۔"

جے سنگھ نے اُس کے ہاتھ سے تلوار پکڑنے کی بجائے چھینتے ہوئے کہا "فتح کے لئے ہمیں تمہاری دُعاؤں کی ضرورت نہیں۔"

شام کے وقت اودھے سنگھ اور بھیم سنگھ چند سپاہیوں کی حراست میں ارور کا رُخ کر رہے تھے۔ اور نیرون کے مندروں میں فوج کے نئے سیناپتی جے سنگھ کی فتح کے متعلق دُعائیں ہو رہی تھیں۔

(۲)

راجہ کے حکم کے مطابق بھیم سنگھ اور اُودھے سنگھ کو ارور کے قید خانے کی ایک زمین دوز کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔ اِس کوٹھڑی میں ایک قیدی

پہلے ہی موجود تھا۔ اُس نے دونئے قیدیوں کو دیکھتے ہی ٹوٹی پھوٹی سندھی زبان میں کہا: "جگہ تنگ ہے۔ تاہم ہم تینوں گزارہ کر سکتے ہیں۔ تم کون ہو اور یہاں کیسے آئے؟"

بھیم سنگھ اور اُودھے سنگھ نے جواب دینے کی بجائے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قیدی کو دیکھنے کی کوشش کی۔

قیدی نے کہا: "شاید آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے لیکن آپ بہت جلد تاریکی میں دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے۔ بیٹھ جائیے آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا، تو آپ دونو شاید باپ بیٹا ہیں؟"

اُودھے سنگھ اور بھیم سنگھ تاریکی میں ہاتھ پھیلا کر سنبھل سنبھل کر پاؤں اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے اور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

قیدی نے پھر کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی میری طرح بے گناہ ہیں معاف رکھنا۔ شاید آپ کو میری باتیں ناگوار محسوس ہوں۔ لیکن کئی مہینوں سے مَیں نے کسی انسان سے بات نہیں کی۔ اِس لئے آپ کو دیکھ کر میرے دل میں اپنی بپتا سنانے اور آپ کی سُننے کی خواہش کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ مَیں ابتدائی چھ مہینے اس تہ خانہ سے اُوپر ایک کشادہ کمرے میں تھا۔ وہاں میرے ساتھ آپ کے مُلک کے چھ اور قیدی تھے۔ مَیں نے آپ کی زبان اُنہیں سے سیکھی تھی۔ اگرچہ مجھے اس زبان پر عبور حاصل نہیں ہوا۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ مَیں اپنا مطلب بیان کر سکتا ہوں۔ آپ میری باتیں سمجھتے ہیں نا!"

بھیم سنگھ نے کہا: "تم اچھی خاصی سندھی جانتے ہو۔"

قیدی نے بھیم سنگھ کی متجسس نگاہیں دیکھ کر کہا۔ "شاید آپ مجھے ابھی تک اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے۔ مَیں قریب آجاتا ہوں"۔

قیدی نے ایک کونے سے اُٹھ کر بھیم سنگھ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں، اب آپ مجھے دیکھ سکیں گے ـــ لیکن مَیں عرب کا ایک مسلمان ہوں۔ آپ کو میرا قریب بیٹھنا ناگوار تو نہیں؟"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "تم عرب ہو؟ لیکن عرب کے قیدی تو برہمن آباد میں تھے"؟

قیدی نے جواب دیا۔ "وُہ کوئی اَور ہوں گے۔ مَیں شروع سے اس قید خانے میں ہوں"۔

اودھے سنگھ نے پُوچھا۔ "تم سراندیپ سے آئے تھے؟ اور تمہارا جہاز دیبل کے قریب ڈوبا تھا۔ اور تمہارا نام ابوالحسن ہے؟"

قَیدی نے جلدی سے جواب دیا۔ "ڈُوبا نہیں، ڈبویا گیا تھا۔ اور ہاں آپ برہمن آباد کے عرب قیدیوں کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ اِس مُلک میں کیسے آئے؟ میرے جہاز سے تو صرف چار آدمی بچے تھے۔ دو زخمی تھے، وہ دیبل سے ارور تک پہنچنے سے پہلے ہی جان بحق ہو گئے۔ تیسرا جس کے زخم معمولی تھے وہ میرے ساتھ اِس قید خانے میں مر گیا تھا"۔

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "تمہارے جہاز کے بعد سراندیپ سے دو اَور جہاز آئے تھے۔ دیبل کے گورنر نے انہیں بھی گرفتار کر لیا تھا"۔

"وہ یہاں کیا لینے آئے تھے؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "وہ سراندیپ سے اپنے مُلک جا رہے تھے"۔

"آپ اُن میں سے کسی کا نام جانتے ہیں؟"

"اُن جہازوں کے کپتان کو میں جانتا ہوں، اُس کا نام زبیر ہے اور وہ آزاد ہو چکا ہے"

"زبیر؟ سراندیپ میں اس نام کا کوئی عرب نہ تھا وہ شاید کسی اور کے جہاز ہوں گے؟"

بھیم سنگھ نے کہا "زبیر کو بصرہ کے حاکم نے عرب کی بیوہ عورتیں اور لاوارث بچے لانے کے لئے سراندیپ بھیجا تھا"

قیدی نے بے تاب سا ہو کر کہا "عورتیں اور بچے؟ آپ اُن میں سے کسی کا نام جانتے ہیں؟"

"اُن میں سے ایک نوجوان کا نام خالد ہے لیکن وہ قیدی نہیں"

"خالد! خالد!! میرا بیٹا!!! وہ کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت دیبل میں ہوگا"

"دیبل میں؟ وہاں وہ کیا کرتا ہے۔ سچ کہو تم نے اُسے دیکھا ہے؟"

"میں نے اُسے لس بیلا میں مسلمانوں کی فوج کے ساتھ دیکھا تھا اور اب وہ دیبل فتح کر چکے ہیں"

ابوالحسن پر تھوڑی دیر کے لئے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یکے بعد دیگرے بھیم سنگھ اور اُودے سنگھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "سچ کہو میرے ساتھ مذاق نہ کرو"

اُودے سنگھ بولا۔ "وہ جن کے ساتھ قدرت مذاق کر رہی ہو۔

دوسروں کے ساتھ مذاق کرنے کی جرأت نہیں سکتے۔ مسلمانوں کی فوج دیبل فتح کر چکی ہے۔ اور اُسے یہاں پہنچتے ہوئے دیر نہیں لگے گی۔"

ابوالحسن دیر تک کوئی بات نہ کر سکا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ خوشی کے آنسو۔ تشکر کے آنسو۔ لیکن اچانک اُس نے بھیم سنگھ کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "سراندیپ میں میری بیوی اور ایک بیٹی بھی تھی۔ تم اُن کے متعلق کچھ جانتے ہو؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "آپ کی بیوی کے متعلق مجھے کوئی علم نہیں، شاید وہ برہمن آباد کے قیدیوں کے ساتھ ہو۔ لیکن جب میں لس بیلا میں زخمی ہونے کے بعد مسلمانوں کی قید میں تھا۔ زبیر کے ساتھ خالد کی بہن کی شادی ہوئی تھی۔"

"تو سلمیٰ بھی اُن کے ساتھ ہوگی۔ وہ یقیناً اُن کے ساتھ ہوگی۔"

اودھے سنگھ نے پوچھا۔ "سلمیٰ کون ہے؟"

"میری بیوی۔ آپ مجھے یہ بتایئے کہ مسلمانوں کی فوج سندھ پر کب اور کیسے حملہ آور ہوئی؟"

اودھے سنگھ نے اس کے جواب میں مختصراً محمد بن قاسم کے حملے کے واقعات بیان کئے۔ بھیم سنگھ نے ذرا تفصیل کے ساتھ یہ داستان دوہرائی۔ اور اس کے بعد ابوالحسن نے اپنی آپ بیتی سنائی۔ غرض شام تک یہ تینوں قیدی گہرے دوست بن گئے اور قید سے رہا ہونے کی تدابیر سوچنے لگے۔

(۳)

دیبل سے نیرون کی طرف محمد بن قاسم کی پیش قدمی کی خبر ملنے پر راجہ داہر نے اپنے سرداروں اور فوج کے عہدہ داروں سے مشورہ طلب کیا۔ سب نے جے سنگھ کی اس تدبیر سے اتفاق کیا کہ عربوں سے فیصلہ کن جنگ دریائے سندھ کے پار برہمن آباد کے قریب لڑی جائے۔ نیرون میں صرف اس قدر فوج رکھی جائے جو چند دن کے لئے محمد بن قاسم کی پیش قدمی روکنے کے لئے کافی ہو۔ اور اس عرصہ میں راجہ اور سیناپتی کو برہمن آباد میں ایک زبردست فوج تیار کرنے کا موقع مل جائے گا۔

موسم گرما شروع ہو چکا تھا اور راجہ داہر کو یہ بھی توقع تھی کہ طغیانی کے دنوں میں دریائے سندھ کی سرکش موجیں دیکھ کر محمد بن قاسم آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کریگا۔ اور اُسے سندھ کے طُول و عرض سے نئی افواج فراہم کرنے کے علاوہ ہمسایہ ریاستوں سے مدد حاصل کرنے کا موقع مل جائےگا۔ چنانچہ اس نے نیرون کے ایک بااثر برہمن کو جو شہر کا سب سے بڑا پروہت ہونے کے علاوہ فوجی معاملات میں بھی کافی دسترس رکھتا تھا، نیرون کی حفاظت کے لئے منتخب کیا۔ اور اُس کے پاس آٹھ ہزار سپاہی چھوڑ کر جے سنگھ اور باقی فوج کے ہمراہ برہمن آباد کا رُخ کیا +

محمد بن قاسم کی فوج نے اس پروہت کی توقع سے پانچ دن پہلے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ منجنیق کے بھاری پتھروں کی بارش سے شہر کی مضبوط فصیل لرز اُٹھی اور تیسرے دن جب دبابوں کی مدد سے شہر پناہ پر حملے

کرنے والی فوج کے مقابلے میں شہر کے محافظین کی قوتِ مزاحمت جواب دے رہی تھی، شہر کے باشندوں کو احساس ہوا کہ راجہ نے اس پروہت کی فوجی قابلیت کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔ چوتھے دن محمد بن قاسم کی فوج شہر پر ایک فیصلہ کُن حملے کی تیاری کر رہی تھی کہ شہر کا دروازہ کھلا اور چند پروہت صلح کا جھنڈا لہراتے ہوئے باہر نکلے۔

شہر پر قبضہ کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے نیرون کے باشندوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا، جس کی بدولت وہ دیبل کے باشندوں کے قلوب مسخر کر چکا تھا۔ نیرون کا نظم و نسق ٹھیک کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے سیون کا رُخ کیا۔ سیون کا گورنر راجہ داہر کا بھتیجا باج رائے تھا۔ اور شہر کی زیادہ آبادی برہمن پروہتوں اور تاجر پیشہ لوگوں پر مشتمل تھی۔ ایک ہفتہ کے محاصرہ کے بعد باج رائے رات کے وقت شہر سے بھاگ نکلا۔ اور شہر کے باشندوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سیون کی فتح کے بعد محمد بن قاسم کے بعض آزمودہ کار سالاروں نے اُسے مشورہ دیا کہ اب دریا عبور کر کے برہمن آباد کا رُخ کیا جائے۔ تاکہ راجہ کو مزید تیاری کے لئے وقت نہ ملے۔ لیکن محمد بن قاسم نے جواب دیا کہ دریا کے اِس کنارے پر سوستان ایک اہم شہر ہے اور اس وقت جب کہ راجہ کی تمام کوشش برہمن آباد کا محاذ مضبوط بنانے پر لگی ہوئی ہے ہم نیرون اور سیون کی طرح سوستان کو بھی نہایت آسانی سے فتح کر سکیں گے۔ اگر ہم دیبل سے براہِ راست برہمن آباد کی طرف پیش قدمی کرتے تو نیرون اور

سیوِن کی افواج کو اپنے راجہ کے جھنڈے تلے جمع ہونے کا موقع مل جاتا ہماری فتوحات راجہ کی طاقت میں کمی اور ہماری فوج کی تعداد میں اضافہ کر رہی ہیں۔ مفتوح شہروں کی کچھ فوج تتر بتر ہو جاتی ہے۔ کچھ ہمارے ساتھ مل جاتی ہے اور باقی تھوڑی بہت جو پسپا ہو کر راجہ کے پاس پہنچتی ہے وہ اپنے ساتھ ایک شکست خوردہ ذہنیت لے کر جاتی ہے۔ اور وہ فوج جس کے ایک فیصدی سپاہی بھی شکست خوردہ ذہنیت رکھتے ہوں خواہ وہ لاکھوں کی تعداد میں ہو ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جب ہم سندھ کی حدود میں داخل ہوئے تھے ہماری تعداد ۱۲ ہزار تھی اور اب دیبل اور بیلا کے نقصانات کے باوجود ہماری تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ ہے اور ہمارے سندھی ساتھیوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اُن کی وہ تلواریں جو حق کے مقابلے میں کند ثابت ہوئیں باطل کے مقابلے میں کافی تیز ہیں۔"

محمد بن قاسم کے دلائل سُن کر فوج کے تمام عہدہ دار اُس کے ہم خیال ہو گئے۔ باج رائے سیوِن سے فرار ہو کر سوستان میں جاٹوں کے راجہ کاکا کے پاس پناہ لے چکا تھا۔ راجہ کاکا راجہ داہر کا زبردست حلیف تھا۔ اُس کی شجاعت کی داستانیں سندھ کے طول و عرض میں مشہور تھیں۔ تاہم دیبل، نیرون اور سیوِن میں محمد بن قاسم کی شاندار فتوحات نے اُسے کسی حد تک خوفزدہ کر دیا تھا۔ سوستان کی فصیل کافی مضبوط تھی لیکن اُس نے قلعہ بند ہو کر لڑنے والی فوج کے لئے حملہ آوروں کے منجنیق اور دبابے خطرناک سمجھتے ہوئے کھلے میدان میں لڑنے کو ترجیح دی۔

(۴۴)

محمد بن قاسم یلغار کرتا ہُوا سِوستان پہنچا۔ تو کاکا کی فوج شہر سے باہر صف بستہ ہو کر حملے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ کاکا نے شجاعت سے زیادہ اپنے جوشیلے پن اور جلد بازی کا ثبوت دیا۔ اور محمد بن قاسم کو جنگ کی تیاری کا موقع دینا مناسب نہ سمجھتے ہوئے اچانک حملہ کر دیا۔ محمد بن قاسم نے حملے کی شدت دیکھ کر قلب لشکر کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ کاکا کی فوج اِس جنگی چال کو نہ سمجھ سکی۔ اور وہ فتح سے پُر اُمید ہو کر دیوانہ وار لڑتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کاکا کو اپنی غلطی کا اُس وقت احساس ہُوا جب حریف کے لشکر کے قلب سے پسپا ہونے والے دستے اچانک رُک کر ایک آہنی دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے۔ اور بازوؤں کے سوار آندھی کی طرح اُس کی فوج کے عقب میں جا پہنچے۔ کاکا کی فوج چاروں اطراف سے ایک زوردار حملے کی تاب نہ لا سکی۔ باج رائے میدان سے بھاگ نکلنے کی کوشش میں مارا گیا۔ اُس کی موت نے کاکا کی فوج کے بہت سے سپاہیوں کو بد دِل کر دیا۔ کاکا نے کچھ دیر فوج کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن جب اپنی شکست کے متعلق کوئی شبہ نہ رہا تو وہ بھی اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ ایک طرف سے گھیرا ڈالنے والی فوج کی صفیں توڑ کر بھاگ نکلا۔ لیکن محمد بن قاسم کے سواروں نے تعاقب کر کے اُسے پھر ایک بار گھیرے میں لے لیا۔ اور اُس نے رہے سہے ساتھیوں سمیت ہتھیار ڈال دیئے +

جب اُسے محمد بن قاسم کے سامنے لایا گیا۔ تو اُس نے حیران ہو کر

پوچھا۔" اس فوج کے سپہ سالار آپ ہیں ؟"

محمد بن قاسم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔" ہاں میں ہوں"۔

کاکا نے اور زیادہ متعجب ہو کر محمد بن قاسم کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا۔" آپ نے میرے لئے کیا سزا تجویز کی ہے؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔" سندھ پر حملہ کرنے کے بعد تم دوسرے آدمی ہو جسے میں نے ایک بہادر سپاہی کی طرح لڑتے دیکھا ہے میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو میں بھیم سنگھ کے ساتھ کر چکا ہوں۔ تم آزاد ہو"

کاکا نے جواب میں کہا" اور اس آزادی کی مجھے کیا قیمت ادا کرنا ہوگی؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔" ہم آزادی کی قیمت وصول کرنے کے لئے نہیں آئے۔"

" تو آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟"

" ظلم کا ہاتھ روکنے اور مظلوم کا سر اونچا کرنے کے لئے!"

کاکا نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا" اگر آپ کو یقین ہے کہ میں ظالم ہوں تو آپ مجھے آزاد کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

" اس لئے کہ مغلوب انسان پر تشدد اسے سرکشی کے لئے ابھارتا ہے۔ اسے اصلاح کی طرف آمادہ نہیں کرتا"

کاکا نے دیر تک سوچنے کے بعد کہا" میں نے سنا تھا کہ آپ بہت بڑے جادوگر ہیں۔ آپ دشمن کو دوست بنانے کے ڈھنگ جانتے ہیں

کیا مجھے بھی آپ کے دوستوں میں جگہ مل سکتی ہے ؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

محمد بن قاسم نے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں پہلے بھی تمہارا دشمن نہ تھا!"

راجہ داہر کی آخری شکست

(۱)

راجہ کاکا نے چند دنوں میں اپنی بچی کھچی فوج دوبارہ منظم کی اور محمد بن قاسم کے ساتھ شامل ہو گیا۔ محمد بن قاسم نے یہاں سے برہمن آباد کا رُخ کیا۔ اور برہمن آباد سے چند کوس دُور دریا کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں اُسے دریا عبور کرنے کی تیاریوں میں چند دن لگ گئے۔ اِس مرحلہ پر سعد (گنگو) اُس کے لئے ایک بہت بڑا مددگار ثابت ہؤا۔ اُس کے ساتھی دریا کے کنارے دُور دُور تک ماہی گیروں کی بستیوں میں سندھ کے نجات دہندہ کی آمد کا پیغام لے کر پہنچے اور چند دنوں میں کئی ملاح اپنی کشتیوں سمیت محمد بن قاسم کی اعانت کے لئے آ جمع ہوئے۔ لیکن دریا عبور کرنے سے پہلے محمد بن قاسم کے گھوڑوں میں ایک وبا پھوٹ نکلی۔ اور چند دنوں میں گھوڑوں کی ایک خاصی تعداد ہلاک ہو گئی۔ حجاج بن یوسف نے یہ خبر سنتے ہی بصرہ سے دو ہزار اونٹوں پر سرکہ لاد کر بھیج دیا اور یہ سرکہ اس خطرناک بیماری کے لئے مفید ثابت ہؤا۔

جون ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر دریائے سندھ عبور کر لیا۔

راجہ داہر قریباً دو سو ہاتھیوں کے علاوہ اپنی فوج میں پچاس ہزار سواروں اور کئی پیدل دستوں کا اضافہ کر چکا تھا۔ جون کے آخری دنوں میں دریا زوروں پر تھا۔ اور اُسے اُمید نہ تھی کہ محمد بن قاسم اُسے عبور کرنے میں اِس قدر مستعدی سے کام لے گا۔ اُس نے اپنے لشکر کو فوراً پیش قدمی کا حکم دیا اور محمد بن قاسم کی فوج کے مستقر سے دو کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا۔

چند دن دونوں افواج کے گشتی دستوں کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ بالآخر ایک شام محمد بن قاسم نے ایک فیصلہ کُن جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ رات کے وقت عشاء کی نماز کے بعد اُس نے مشعل کی روشنی میں اپنی بیوی کے نام یہ خط لکھ کر قاصد کے حوالے کیا۔

"رفیقۂ حیات!

خدا تمہیں ایک مجاہد کی بیوی کا عزم اور حوصلہ عطا کرے۔ میں صبح دشمن کی بے شمار فوج کے ساتھ ایک فیصلہ کُن جنگ لڑنے جا رہا ہوں اور یہ مکتوب تمہارے ہاتھوں تک پہنچنے سے پہلے سندھ کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہوگا۔ میرا دِل گواہی دیتا ہے کہ خدا مجھے فتح دے گا۔ مجھے اپنے سپاہیوں پر ناز ہے اور ان

سپاہیوں سے زیادہ عرب کی اُن ماؤں پر ناز ہے جن
کا دُودھ اُن کی رگوں میں خُون بن کر دوڑ رہا ہے۔ جنہوں
نے انہیں بچپن میں لوریاں دیتے وقت بدر و حنین کی
داستانیں سُنائی ہیں۔ مجھے اُن بیویوں پر ناز ہے جن کی
فرض شناسی نے اُن کے شوہروں کو غازیوں کی زندگی
اور شہیدوں کی موت کی تمنّا کرنا سکھایا ہے۔ جن کی محبت
نے ان کے پاؤں میں زنجیریں پہنانے کی بجائے انہیں
تسخیرِ عالم کا سبق دیا ہے اور مجھے اطمینان ہے کہ جب تک
اِن مجاہدوں کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ نہیں بہ جاتا۔
یہ اسلام کا جھنڈا سرنگوں نہ ہونے دیں گے۔

مَیں تمہاری اور اماں کی جُدائی سے کبھی پریشان
نہیں ہُوا۔ مَیں تمہاری یاد سے غافل نہیں لیکن جب
مَیں اپنے ساتھ ہزاروں اُن نوجوانوں کو دیکھتا ہوں جو
خدا کی راہ میں صبر اور شکر کے ساتھ اپنی بیویوں، ماؤں
اور دُوسرے عزیزوں کی جُدائی برداشت کر رہے ہیں تو
مجھے اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ مَیں اُن میں سے ایک
ہوں۔ پچھلی جنگوں میں جو نوجوان شہید ہو چکے ہیں، اُن
میں سے بعض کی ماؤں نے مجھ سے خط لکھ کر یہ پوچھا ہے
کہ اُن کے بیٹوں کا خون ایڑیوں پر تو نہیں گرا۔ اور اگر

میں شہید ہو جاؤں تو مجھے توقع ہے کہ میری ماں بھی میرے ساتھیوں سے یہی سوال پوچھے گی۔

میں تم سے یہ وعدہ کر چکا ہوں کہ جب تک بیوہ عورتیں اور یتیم بچے رہا نہ ہوں گے میں اپنی رفتار سست نہ ہونے دوں گا۔ اور میں یہ وعدہ پورا کروں گا۔ اور تم مجھ سے وعدہ کر چکی ہو کہ تم میری شہادت پر آنسو نہیں بہاؤ گی اپنا وعدہ پورا کرنا۔ امی جان کو میرا مؤدبانہ سلام کہنا میں اُن کی طرف ایک علیحدہ خط لکھ رہا ہوں۔

تمہارا محمدؐ"

دُوسرا خط ماں کے نام لکھنے کے بعد محمد بن قاسم میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

(۷)

صبح کی نماز کے بعد مسلمانوں کی فوج کیل کانٹے سے لیس ہو کر صفوں میں کھڑی ہو گئی۔ اور محمد بن قاسم نے گھوڑے پر سوار ہو کر ایک پُر جوش تقریر کی:۔

"خدا اور رسولؐ کے سپاہیو! آج تمہاری شجاعت تمہارے ایمان اور تمہارے ایثار کے امتحان کا دن ہے۔ دشمن کی تعداد سے نہ گھبرانا۔ تاریخ شاہد ہے کہ کفر و اسلام کے تمام گزشتہ معرکوں میں باطل کے علمبردار حق پرستوں کے

مقابلے میں ۔۔۔ زیادہ تھے ۔ اور حق پرستوں نے ہمیشہ یہ ثابت کیا کہ فوج کا طاقت کی راز افراد کی تعداد میں نہیں بلکہ اُن کے ایمان کی پختگی اور ان کے مقاصد کی بلندی میں ہے۔ ہماری جنگ کسی قوم کے خلاف نہیں، کسی مُلک کے خلاف نہیں۔ بلکہ دُنیا کے تمام اُن سرکش انسانوں کے خلاف ہے جو خدا کی زمین پر فساد پھیلاتے ہیں۔ ہم رُوئے زمین پر اپنی حکومت نہیں بلکہ خدا کی حکومت چاہتے ہیں۔ ہم اپنی سلامتی اور اپنے ساتھ دُنیا کے تمام انسانوں کی سلامتی چاہتے ہیں۔ اور خدا کی زمین پر سلامتی کا راستہ صرف اسلام ہے۔ یہ وُہ دین ہے جو دُنیا سے آقا اور غلام، گورے اور کالے، عربی اور عجمی کی تمیز مٹاتا ہے۔ ہمارا مقصد اس دین کی تبلیغ ہے، اور اس مقصد کے لئے جینا اور مرنا دُنیا کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد اس مقصد کے لئے لڑے، اور خدا نے اُن کی مٹھی بھر جماعت کے سامنے دُنیا کے بڑے بڑے جابر اور قاہر شہنشاہوں کی گردنیں جُھکا دیں۔

عرب کے شہسوارو! تمہیں اپنے مقدر پر فخر کرنا چاہئیے کہ خدا نے اپنے دین کی اشاعت کیلئے تمہیں منتخب کیا۔ تم نے خدا کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگائی، اور خدا

نے تمہیں ارض و سما کی نعمتوں سے مالا مال کر دیا۔ وہ وقت یاد کرو جب خدا نے اپنے تین سو تیرہ بے سر و سامان بندوں کو بہترین ہتھیاروں سے مسلح ایک ہزار سے زیادہ فوج پر فتح دی تھی۔ قادسیہ، یرموک اور اجنادین کے میدانوں میں حق کی ایک تلوار کے مقابلے میں باطل کی دس اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ تلواریں بے نیام ہوئیں لیکن خدا نے ہمیشہ حق پرستوں کو فتح دی۔ خدا آج بھی تمہاری مدد کرے گا۔ لیکن یاد رکھو! قدرت کے فیصلے اٹل ہیں۔ قدرت صرف اُن کی مدد کرتی ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ تم اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوئے بغیر خدا کے انعامات کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ قدرت کا دستِ شفقت صرف اُن کی طرف دراز ہوتا ہے۔ جو تیروں کی بارش میں سینہ سپر ہوتے ہیں۔ جو خندقوں کو اپنی لاشوں سے پاٹتے ہیں۔ قدرت کے انعامات صرف ان اقوام کے لئے ہیں جن کی تاریخ کا ہر صفحہ شہیدوں کے خون سے رنگین ہو!

یاد رکھو! بنی اسرائیل بھی خدا کی لاڈلی اُمت تھی۔ لیکن جب وہ راہِ حق میں جہاد کی ذمہ داری خدا اور اُس کے پیغمبر کو سونپ کر آرام سے بیٹھ گئے تو قدرت نے انہیں دھتکار دیا۔ اور انہیں آج اُس زمین پر جائے پناہ

نہیں ملتی جس پر کسی زمانے میں اُن کے اقبال کے پرچم لہراتے تھے۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ تم بھی بنی اسرائیل کی طرح اپنی کتابِ زندگی سے جہاد کا باب خارج کر دو۔

میرے دوستو اور بزرگو! آج تمہارے لئے ایک آزمائش کا دن ہے۔ تمہیں بدر و حنین کے مجاہدوں کی سنّت ادا کرنی ہے۔ تمہیں قادسیہ اور یرموک کے شہیدوں کے نقشِ قدم پر چل کر دکھانا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ آج کے دن فتح کے لئے خدا نے جس جماعت کو منتخب کیا ہے، وہ تم ہو۔ مجھے یقین ہے کہ حق کی تلواروں کے سامنے سندھ کا لوہا روم و ایران کے لوہے کے مقابلے میں سخت ثابت نہ ہوگا۔ ظالم لوگ کبھی بہادر نہیں ہوتے لیکن میں پھر ایک بار تمہیں یہ ہدایت کرتا ہوں کہ حق کی راہ کو کفر کے کانٹوں سے پاک کرتے وقت یہ خیال رکھنا کہ تم کوئی بے ضرر پودا اور کوئی جھکتا ہوا پھول بھی اپنے پاؤں سے نہ مسل ڈالو۔ گرے ہوئے دشمن پر وار نہ کرنا۔ عورتوں، بچّوں اور بوڑھوں پر تمہارا ہاتھ نہ اُٹھے۔ میں جانتا ہوں کہ سندھ کے راجہ نے عرب عورتوں اور بچّوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ انتقام کا جذبہ تمہیں کہیں ظلم پر آمادہ نہ کر دے۔ خدا کے

قانون میں توبہ کرنے والوں کے لئے ہر وقت رحم کی گنجائش ہے۔ دشمن کو مغلوب کرو اور اس پر یہ ثابت کر دو کہ ہماری غیرت خدا کی غیرت ہے اور ہماری تلوار خدا کی تلوار ہے لیکن جب وہ اپنی شکست کا اعتراف کرے اور تم سے پناہ مانگے تو اسے اٹھا کر گلے لگا لو اور کہو کہ اسلام کی رحمت کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں۔

تم جانتے ہو کہ اس دنیا میں کسی انسان کو اتنا نہیں ستایا گیا جس قدر کفارِ مکہ نے پیغمبرِ اسلام کو ستایا تھا۔ ظلم کے ترکش میں کوئی ایسا تیر نہ تھا جس سے ان کے مقدس جسم کو مجروح کرنے کی کوشش نہ کی گئی۔ رحمۃ اللعالمین کی آنکھوں کے سامنے اُن کے جانثاروں کے سینوں پر تپتے ہوئے پتھر رکھے گئے، اور جب آپؐ نے ہجرت کی، تو بھی ظالموں نے آپ کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مدینے کی جنگوں میں آپؐ کے کئی جاں نثار شہید ہوئے۔ لیکن فتح مکہ کے بعد اپنے دشمنوں کے ساتھ جو سلوک حضور نے کیا۔ اُس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اور یہ اُس نیک سلوک کا نتیجہ تھا کہ آپؐ کے بدترین دشمن آپؐ کے بہترین جاں نثار بن گئے آج ترکستان اور افریقہ میں ہر اُس ملک کے باشندے جو کبھی زمانے میں ہمارے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے اسلام کی فتح

کے لئے ہمارے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سندھ بلکہ یہ سارا ہندوستان کسی دن ایران، شام اور مصر کی طرح دینِ حق کی فتح کے لئے ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ میرے دوستو! آج ہماری منزل برہمن آباد ہے۔ آؤ ہم فتح کے لئے دُعا کریں۔"

محمد بن قاسم نے یہ کہہ کر ہاتھ اُٹھائے اور دُعا کی: "اے جزا اور سزا کے مالک! ہم تیرے دین کی فتح چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے اسلاف کا جذبہ عطا کر۔ رب العٰلمین حشر کے دن ہماری ماؤں کو شرمسار نہ کرنا۔ ہمیں غازیوں کی زندگی اور شہیدوں کی موت عطا کر۔"

(۳)

شام تک سندھ کی فوج راجہ داہر کے علاوہ تیس ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کر پسپا ہو چکی تھی۔ فوج کے وہ دستے جنہیں تیسرے پہر ہی اپنی شکست کا یقین ہو چکا تھا۔ ارور کا رُخ کر چکے تھے۔ باقی فوج نے راجہ داہر کے قتل ہو جانے پر ہمت ہار دی اور برہمن آباد کا رُخ کیا۔

مسلمان کچھ دیر اُن کا تعاقب کرنے کے بعد کیمپ کی طرف لوٹ آئے۔ اس جنگ میں مسلمان زخمیوں اور شہیدوں کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب تھی۔ سپاہی زخمیوں کو میدان سے اُٹھا اُٹھا کر قطاروں میں لٹا رہے تھے۔ اور محمد بن قاسم جراحوں کی جماعت کے ساتھ اُن کی مرہم پٹی میں مصروف تھا۔ زبیر ایک زخمی کو پیٹھ پر اُٹھائے ہوئے محمد بن قاسم کے قریب پہنچا۔

اور اُسے زمین پر لٹاتے ہوئے محمد بن قاسم سے مخاطب ہوا۔ "آپ ذرا اسے دیکھ لیں۔ یہ بہت بُری طرح زخمی ہوا ہے۔"

محمد بن قاسم نے جلدی سے اُٹھ کر زخمی کے قریب پہنچتے ہوئے کہا:۔ "کون؟ سعد!"

سعد کا چہرہ خون سے رنگا ہوا تھا۔ محمد بن قاسم نے کپڑے سے اُس کا مُنہ پونچھنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس نے محمد بن قاسم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "اب اس کی ضرورت نہیں۔ مَیں صرف آخری بار آپ کو دیکھنا چاہتا تھا۔"

زبیر اور محمد بن قاسم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خالد چند قدم کے فاصلے پر زخمیوں کو پانی پلا رہا تھا۔ زبیر نے اُسے آواز دی، اور وہ بھاگتا ہوا سعد کے پاس پہنچا۔ "چچا تم . . . " اُس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

سعد نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اور خالد اُسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔

سعد نے کہا۔ "مجھے اب مَوت کا ڈر نہیں۔ لیکن مَیں بہت گنہگار ہوں۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ خدا مجھے معاف کر دے گا؟"

محمد بن قاسم نے کہا۔ "شہیدوں کا خون اُن کے تمام گناہ دھو دیتا ہے۔"

سعد نے خالد کی طرف دیکھا، اور نحیف آواز میں کہا۔ "بیٹا! زہرا کا خیال رکھنا۔ اور زبیر تمہیں ناہید کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔" تھوڑی

دیر تک اُس نے بچے بعد دیگرے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اور محمد بن قاسم کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اُس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ سعد نے چند اُکھڑے ہوئے سانس لینے کے بعد خالد اور محمد بن قاسم کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اتنی دیر میں سعد کے چند رفیق بھی اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ محمد بن قاسم نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ کہا۔ اور اپنے ہاتھ سے اُس کی آنکھیں بند کر دیں۔

(۴)

محمد بن قاسم اُٹھ کر پھر زخمیوں کی طرف متوجہ ہونا چاہتا تھا کہ ایک سوار اپنے آگے ایک زخمی کو لادے ہوئے اس کے قریب پہنچا۔ محمد بن قاسم نے اُسے دیکھتے ہی سوال کیا۔ "بھیم سنگھ تم!...... یہ کون ہے؟"

ایک سپاہی نے زخمی کو گھوڑے سے اُتار کر نیچے لِٹا دیا۔ بھیم سنگھ نے گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔ "خالد اپنے باپ کی طرف دیکھو!"

خالد سر جھکائے سعد کے قریب بیٹھا تھا۔ اُس نے چونک کر پیچھے دیکھا اور زخمی کو دیکھتے ہی ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ بھاگ کر اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ "ابّا! میرے ابّا!!"

زخمی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ بھیم سنگھ کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ انہیں کہاں سے لائے؟ یہ کیسے زخمی ہوئے؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "میں، پتاجی اور یہ اروڑ کے قید خانے سے ایک فوجی افسر کی مدد سے فرار ہوئے تھے۔ جب ہم یہاں پہنچے تو راجہ کی فوج

فرار ہو رہی تھی۔ انہوں نے پتاجی کے سمجھانے کے باوجود سپاہیوں کے ایک گروہ پر حملہ کر دیا۔ میں اور پتاجی نے مجبوراً ان کا ساتھ دیا۔ پتاجی ایک تیر کھا کر گھوڑے سے گر پڑے اور ایک ہاتھی کے پاؤں تلے کچلے گئے"۔ یہاں تک کہہ کر بھیم سنگھ خاموش ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا" اور یہ بے تحاشا آگے بڑھتے گئے۔ پانچ چھ سپاہیوں کو مارنے کے بعد یہ زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑے۔ اِن کی آخری خواہش یہ تھی کہ میں اپنے بیٹے سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ انہیں اچھی طرح دیکھیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ابھی تک زندہ ہیں"۔

محمد بن قاسم نے چند سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا" تم اُن کے ساتھ جاؤ اور ان کے پتاجی کی لاش اُٹھا لاؤ"۔ اور خود ابوالحسن کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

" انہیں غش آ گیا ہے۔ پانی لاؤ"

ایک سپاہی نے اپنے مشکیزے سے پانی کا گلاس بھر کر پیش کیا۔ اور محمد بن قاسم نے ابوالحسن کا منہ کھولتے ہوئے اُسے پانی کے چند گھونٹ پلا دیئے۔ ابوالحسن نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں۔ لیکن خالد کو پہچانتے ہی اُس پر تھوڑی دیر کے لئے پھر غشی طاری ہو گئی۔ اُسے دوبارہ ہوش میں لانے کے بعد محمد بن قاسم نے اُس کے سینے کے زخم کی مرہم پٹی کی۔

خالد سے ابوالحسن کا پہلا سوال یہ تھا" تمہاری امی کہاں ہے؟"

"وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" خالد گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ابوالحسن نے اپنے چہرے پر ایک دردناک مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! گھبراؤ نہیں۔ مَیں سمجھ گیا، وہ زندہ نہیں۔ ناہید کہاں ہے؟"

"وہ دیبل میں ہے"۔

"تو تمہاری بیوی بھی وہیں ہوگی۔ کاش! مَیں موت سے پہلے انہیں دیکھ سکتا۔ لیکن وہ بہت دُور ہیں اور مَیں فقط چند گھڑیوں کا مہمان ہوں!"

محمد بن قاسم نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ مَیں ابھی انہیں بُلا بھیجتا ہوں۔ انشاءاللہ وہ ڈاک کے گھوڑوں پر پرسوں تک یہاں پہنچ جائیں گی"۔

ابوالحسن نے احسان مندانہ نگاہوں سے محمد بن قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شکریہ! لیکن مَیں شاید پرسوں تک زندہ نہ رہوں"۔

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "آپ کا زخم زیادہ خطرناک نہیں۔ اور اگر قدرت کو آپ کی ملاقات منظور ہے تو وہ ہو کر رہے گی"۔

چوتھے روز طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر بعد ابوالحسن کے بستر کے گرد محمد بن قاسم، خالد اور زبیر کے علاوہ ناہید اور زہرا بھی موجود تھیں۔ ناہید اور زہرا نے شام کے وقت اس جگہ پہنچنے کے بعد سفر میں تھکاوٹ سے چُور ہونے کے باوجود زبیر اور خالد کی طرح ساری رات ابوالحسن کی تیمارداری میں کاٹی تھی۔

نزع سے کچھ دیر پہلے ناہید اور زہرا کی طرح خالد کی آنکھوں میں

بھی آنسو دیکھ کر ابوالحسن نے کہا "بیٹا! میں اپنے لئے اِس سے بہتر موت کی دُعا نہیں کرسکتا تھا۔ موت پر آنسو بہانا دُنیا کی ایک رسم ہے۔ لیکن شہادت کی موت کے لئے اِس رسم کو پورا کرنا شہادت کا مذاق اُڑانا ہے۔ اس طرح ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف نہ دیکھو۔ مجھے آنسوؤں سے نفرت ہے۔ زندگی کی کٹھن منازل میں ایک مسلمان کی پُونجی آنسو نہیں، خون ہے"

خالد نے آنسو پُونچھ ڈالے اور کہا "اباجان مجھے معاف کرنا"

دوپہر کے وقت ابوالحسن نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

برہمن آباد سے اروڑ تک

(۱)

برہمن آباد پہنچ کر جے سنگھ نے چاروں طرف ہرکارے دوڑائے۔ راجہ داہر کی شکست سے پہلے ملتان سے لے کر راجپوتانہ تک کئی راجہ اور سردار اپنی اپنی افواج کے ساتھ اُس کی مدد کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ لیکن نیرون کی فتح کے بعد جب محمد بن قاسم نے برہمن آباد کا رُخ کرنے کی بجائے سیون اور سوستان کی طرف پیش قدمی شروع کی، تو انہیں یہ اطمینان ہو گیا کہ برہمن آباد کے قریب فیصلہ کُن جنگ لڑنے کے لئے ابھی کافی وقت ہے۔ جُون میں دریا بھی زوروں پر تھا۔ اور کسی کو یہ اُمید نہ تھی کہ محمد بن قاسم اسے عبُور کرنے کے لئے پانی اُتر جانے کا انتظار نہیں کرے گا۔ اِس لئے اُنہوں نے راستے کی منازل نہایت سکون اور اطمینان سے طے کیں۔ راجہ داہر کو بذاتِ خود اپنے اندازے سے بہت پہلے محمد بن قاسم کے مقابلے میں صف آرا ہونا پڑا، اور دُور دراز سے آنے والے بہت کم مددگار وقت پر پہنچ سکے۔

سندھ کی افواج کی شکست اور اُس سے زیادہ راجہ داہر کی مَوت کی غیر متوقع خبر نے اُن میں سے اکثر کو بددل کر دیا، اور وہ جے سنگھ کی مدد کے لئے

برہمن آباد پہنچنے کی بجائے واپس ہونے لگے۔ جے سنگھ ان لوگوں کی مدد کے بھروسے پر ایک اور فیصلہ کن جنگ لڑنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ چنانچہ اُس نے یہ مشہور کر دیا کہ راجہ داہر مرا نہیں۔ وہ شکست کھانے کے بعد جنوبی ہند کے راجاؤں کی مدد حاصل کرنے کے لئے جا چکا ہے، اور چند دنوں تک اپنے ساتھ ایک لشکرِ جرّار لے کر برہمن آباد پہنچ جائے گا۔ جے سنگھ کے ہرکاروں نے مایوس ہو کر لوٹنے والے راجوں اور سرداروں کو یہ خبر پہنچائی، تو وہ آخری فتح میں حصّہ دار بننے کی امید پر یکے بعد دیگرے اُس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔

محمد بن قاسم کے پاس یہ خبریں پہنچیں، تو اُس نے فوراً پیش قدمی کی۔ جے سنگھ کے جھنڈے تلے قریباً پچاس ہزار سپاہی جمع ہو چکے تھے۔ اُس نے شہر سے باہر نکل کر محمد بن قاسم کا مقابلہ کیا۔ محمد بن قاسم کی فوج میں بھی سندھ کے عوام کے علاوہ کئی سردار شامل ہو چکے تھے۔ ان سرداروں کی قیادت بھیم سنگھ کے سپرد تھی۔ برہمن آباد کی دیواروں کے باہر گھمسان کا رن پڑا۔ جے سنگھ کے راجپوت ساتھی نہایت بہادری کے ساتھ لڑے لیکن سندھی سپاہی عربوں کے جھنڈے تلے اپنے ہم وطنوں کی ایک بہت بڑی تعداد دیکھ کر بد دِل ہو گئے۔ بھیم سنگھ کے بعض پرانے ساتھیوں نے اُس کی آواز پر لبّیک کہا۔ اور جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی مسلمانوں کی فوج کے ساتھ آملے۔ پھر بھی جے سنگھ کو نئے مددگاروں کی فوج کی تعداد پر بھروسہ تھا۔ اور اُس نے بہادری سے مقابلہ کیا۔ تیسرے پہر

سندھی افواج کے پاؤں اُکھڑ گئے، اور جے سنگھ بیس ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کر جنوب کی طرف بھاگ نکلا۔

(۲)

برہمن آباد کے شاہی محل کے ایک کمرے میں راجہ داہر کی سب سے چھوٹی اور سب سے زیادہ محبوب رانی سنہری مسند پر رونق افروز تھی۔ رانی کا نام لاڈھی تھا۔ اُس کے خوبصورت چہرے پر حزن وملال کے آثار تھے۔ چند خادمائیں اور اُمراء اردگرد ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

پرتاب رائے سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا کمرے میں داخل ہوا۔ اور رانی کے قریب پہنچ کر آہستہ سے بولا۔ "مہارانی جے سنگھ کو شکست ہو چکی ہے، اور دشمن تھوڑی دیر میں شہر پر قبضہ کرنے والا ہے۔ اب ہمارے لئے بھاگ نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہم سُرنگ کے راستے نکل سکتے ہیں۔"

رانی نے تُرشروئی سے جواب دیا۔ "شکست کے متعلق میرے پاس اطلاع لانے کے لئے محل کی عورتیں کافی تھیں۔ تم میدان چھوڑ کر کیوں آئے؟"

"مہارانی کی حفاظت میرا فرض تھا۔ اب باتوں کا وقت نہیں، چلئے میں نے سُرنگ کے دوسرے سرے پر گھوڑوں کا انتظام کر دیا ہے۔ آپ کسی خطرے کا مقابلہ کئے بغیر اَرور پہنچ سکتی ہیں۔"

رانی نے تنک کر کہا۔ "میں تمہارے جیسے بزدل کی حفاظت میں جان بچانے پر ایک بہادر دشمن کے ہاتھوں موت کو ترجیح دوں گی۔"

پرتاپ رائے نے کھسیانا ہو کر کہا۔ "یہ میرے ساتھ انصاف نہیں۔ مَیں آپ کا ایک وفادار خادم ہوں"

"تمہارے لئے انصاف کا وقت آچکا ہے" یہ کہتے ہوئے رانی مسند سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

پرتاپ رائے نے پریشان ہو کر کہا۔ "مہارانی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ مَیں آپ کی بھلائی کی بات کہتا ہوں"

رانی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا "تم اس مُلک کے سب سے بڑے دشمن ہو۔ سندھ پر یہ مصیبت تمہاری وجہ سے آئی۔ مہاراج کو عربوں کے ساتھ جنگ مُول لینے کے لئے تم نے ورغلایا۔ جے رام کو تم نے ہمارا دشمن بنایا۔ بھیم سنگھ اور اودھے سنگھ جیسے بہادر سپاہی تمہاری وجہ سے دشمن کے ساتھ جا ملے۔ پچھلی جنگ کے میدان میں سب سے پہلے بھاگنے والے تم تھے۔ اور اب تم میری جان بچانے کے لئے نہیں، بلکہ اپنی جان کے خوف سے مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ عرب عورتوں پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ اِس لئے ہماری وجہ سے شاید وُہ تمہیں بھی چھوڑ دیں"

پرتاپ رائے نے کہا "مہارانی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ سُنیئے! دشمن قلعے میں داخل ہو رہا ہے۔ اب وُہ کوئی دم میں اِدھر آنے والا ہے۔ اگر آپ کو اُس کی قید کی ذِلّت کا خوف نہیں تو مَیں جاتا ہوں"

پرتاپ رائے نے یہ کہہ کر واپس مڑنا چاہا لیکن رانی نے بڑھ کر

اُس کا رستہ روک لیا۔ اور ایک چمکتا ہوا خنجر دکھاتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو! ابھی تک تمہارا فیصلہ نہیں ہوا۔"

پرتاپ رائے نے لوگوں کو ننگی تلواروں کے ساتھ اپنے گرد جمع ہوتے دیکھا۔ تو ایک طرف جست لگا کر تلوار سونت لی۔ رانی ایک درباری کے ہاتھ سے تلوار لے کر آگے بڑھی، اور بولی ۔" بزدل تمہارے ہاتھ تلوار اُٹھانے کے لئے نہیں، چُوڑیاں پہننے کے لئے بنائے گئے ہیں۔"

پرتاپ رائے نے ایک زخمی درندے کی طرح رانی پر حملہ کیا لیکن وہ اچانک کترا کر ایک طرف ہو گئی۔ پیشتر اس کے کہ پرتاب رائے دوسری بار تلوار اُٹھاتے چار تلواریں اُس کا سینہ چھلنی کر چکی تھیں۔"

(۳۱)

قلعے میں چاروں طرف اللہ اکبر کے نعرے سُنائی دے رہے تھے۔ رانی نے محل کے بالاخانے کے برآمدے میں کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ قلعے کے دروازے پر سندھ کے پرچم کی بجائے اسلامی پھریرا لہرا رہا تھا۔ نیچے کشادہ صحن میں مسلمانوں کی فوج جمع ہو رہی تھی۔ سب سے آگے ایک نوجوان سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اور سندھ کے بے شمار سپاہی "محمد بن قاسم کی جے" کے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک درباری نے سفید گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "محمد بن قاسم وُہ ہے۔"

رانی اپنے اِردگرد جمع ہونے والوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دے کر خود ایک ستون کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ ایک بوڑھے سردار نے آگے بڑھ کر کہا: "مہارانی

اب بھی بھاگ نکلنے کا وقت ہے۔"

رانی نے ایک سپاہی کے ہاتھ سے تیر کمان چھین کر محمد بن قاسم کی طرف نشانہ باندھتے ہوئے کہا "بھاگنے والے راجوں اور رانیوں کے لئے اِس دُنیا میں کوئی جگہ نہیں۔"

لیکن اچانک کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی، اور رانی کی توجہ تھوڑی دیر کے لئے دائیں ہاتھ ایک دروازے کی طرف مبذول ہوگئی۔ بھیم سنگھ چند سرداروں کے ہمراہ نمودار ہوا۔ رانی نے اُسے دیکھ کر مُنہ پھیر لیا، اور دوبارہ محمد بن قاسم کی طرف نشانہ باندھنے لگی۔ نیچے سے چند سپاہیوں نے شور مچایا، اور محمد بن قاسم اچانک ایک طرف جُھک گیا۔ پیشتر اس کے کہ بھیم سنگھ بھاگ کر رانی کا ہاتھ روکتا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ رانی نے اپنا وار خالی دیکھ کر دُوسرا تیر چڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن بھیم سنگھ نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے کمان چھینتے ہوئے کہا۔ "مہارانی! آپ کیا کر رہی ہیں۔ بھگوان کا شکر ہے کہ تیر چلاتے وقت آپ کے ہاتھ کانپ رہے تھے، ورنہ آپ ایک فاتح لشکر کے انتقام کا تصور نہیں کرسکتیں۔ اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ان کے سپہ سالار کی موت اِس فوج کا حوصلہ پست کرسکتی ہے۔ تو آپ غلطی پر ہیں۔ یہ فوج وہ نہیں جو سپہ سالار کی مَوت کے بعد میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ اُن کا ہر سپاہی سپہ سالار ہے۔"

رانی نے جذبات کی شدّت سے آبدیدہ ہوکر بھیم سنگھ کی طرف دیکھا اور کہا "بھیم سنگھ اب تم کیا چاہتے ہو۔ کیا اب تک تم اپنا بدلہ نہیں لے چکے؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ عرب قیدی کہاں ہیں۔ قید خانے سے صرف سراندیپ کے ملاح ملے ہیں۔ مجھے وہاں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ عرب قیدی راجہ کی موت کے بعد اس محل میں لائے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے اُن کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا ہوگا۔ لیکن مجھے پہرہ دار نے بتایا ہے کہ پرتاپ رائے بھی آپ کے پاس ہے اور مجھے ڈر ہے کہ آپ نے کہیں اُس کے کہنے میں آکر اُن کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی ہو۔"

رانی نے کہا۔ "فرض کرو اگر میں نے کوئی بدسلوکی کی ہے تو؟"

"مسلمان عورتوں پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔ لیکن پرتاب رائے کو شاید وہ قابلِ معافی نہ سمجھیں۔"

رانی نے کہا۔ "اگر میں نے اُنہیں اپنے حکم سے قتل کروا دیا ہو تو؟"

بھیم سنگھ نے چونک کر جواب دیا۔ "تو میں یہ سمجھوں گا کہ سندھ کو ابھی اور بُرے دن دیکھنے ہیں۔ لیکن مجھے آپ سے یہ اُمید نہیں۔ میں محمد بن قاسم کو بتا چکا ہوں کہ آپ نے ہمیشہ قیدیوں کے متعلق مہاراج اور پرتاب رائے کے خطرناک ارادوں کی مخالفت کی ہے، اور وہ اس کے لئے آپ کے احسان مند ہیں۔"

رانی نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اگر میں اُن قیدیوں کو دشمن کے حوالے کر دوں تو وہ یہاں سے واپس چلا جائے گا؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "فاتح لشکر کو کوئی شرط ماننے پر مجبور نہیں

کیا جا سکتا۔ ہمیں اُس کے ساتھ مصالحت کے جو مواقع ملے تھے وہ ہم نے طاقت کے نشے میں ضائع کر دیئے ہیں۔ اور اب تو وہ اپنی فتوحات کے سیلاب کو ہندوستان کی آخری سرحد تک لے جانا چاہتے ہیں۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ ارور پر حملہ کریں گے؟"

"ہاں وہ شاید دو چار دن کے اندر اندر ہی ارور کی طرف پیش قدمی کر دیں۔ اور میں اس لئے بھی آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں کہ ارور کی حفاظت راجکمار فوفی کر رہا ہے۔ اور آپ شاید یہ پسند نہ کریں کہ وہ مسلمانوں کے گھوڑوں کے سُموں کے نیچے کچلا جائے۔ قیدیوں کو محمد بن قاسم کے حوالے کر کے آپ اُس کی جان بخشی کروا سکتی ہیں۔ اُس کے پاس جس قدر سپاہی ہوں گے، اُس سے زیادہ سپاہی اب محمد بن قاسم کی فوج میں سندھ سے شامل ہو چکے ہیں۔ راجکمار جس قدر بہادر ہے اُسی قدر ناتجربہ کار۔ وہ عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اُس کی جان صرف اسی صورت میں بچ سکتی ہے کہ وہ ہتھیار ڈال دے۔"

رانی نے کچھ تھوڑی دیر کے تذبذب کے بعد کہا "میں نے سُنا ہے کہ عربوں کو دولت کا بہت لالچ ہے اگر وہ واپس جانے پر رضامند ہوں تو میں انہیں برہمن آباد کے علاوہ ارور کا خزانہ بھی دے سکتی ہوں۔"

بھیم سنگھ نے جواب دیا "وہ ایک اصول کے لئے لڑتے ہیں۔ یہاں تجارت کے لئے نہیں آئے۔"

"تمہارے دل میں عربوں کے لئے بہت عزت ہے۔" اُنہوں نے

تم پر کیا جادو کیا؟"

بھیم سنگھ نے چند قدم آگے بڑھ کر پیچھے اشارہ کرتے ہوئے کہا "جادو؟ ادھر دیکھئے۔ اُن کے جادو نے کس پر اثر نہیں کیا؟"

رانی نے پیچھے نگاہ دوڑائی۔ شہر کے سرکردہ سردار اور پروہت محمد بن قاسم کے گرد گھیرا ڈال کر اُس کے پاؤں چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور وہ گھوڑے سے نیچے کھڑا انہیں ہاتھوں کے اشاروں سے منع کر رہا تھا۔

بھیم سنگھ نے کہا "مہارانی دیکھا آپ نے، یہ وہ لوگ ہیں، جو چند ساعتیں پہلے اُسے اپنا بدترین دشمن سمجھتے تھے جب وہ ہمارے ملک پر حملہ آور ہوا تھا اُس کے پاس کُل دس بارہ ہزار سپاہی تھے، اور اب ہمارے اپنے مُلک سے تیس چالیس ہزار کے لگ بھگ سپاہی اُس کی فوج میں شامل ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس جسم کے بچاؤ کے لئے ڈھالیں ہیں۔ لیکن محبت اور اخلاق سے دِلوں کے قلعے فتح کرنے والے حملہ آور کا کوئی علاج نہیں۔ سندھ کی آیندہ نسلیں محمد بن قاسم کو اپنے دشمن کی بجائے اپنے بہترین دوست کے نام سے یاد کریں گی۔ آپ جانتی ہیں کہ میں بزدِل نہیں۔ میں شکست کھا کر زندہ واپس آنے کی نیت سے لس بیلا نہیں گیا تھا۔ لیکن کاش! وہ مجھے اُس وقت اُٹھا کر اپنے سینے سے نہ لگاتا جب میں زخموں سے چور تھا۔ اُس نے مجھے موت کے مُنہ سے چھینا۔ میرے زخموں پر مرہم رکھا۔ میری تیمارداری کی۔ اور میں نے محسوس

کیا کہ دُنیا کی کوئی طاقت ایسے دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

میں مہاراج کے پاس اِس لئے آیا کہ انہیں آگ میں کُودنے سے بچاسکوں۔ لیکن میرے اور پتاجی کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو مسلمان اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی نہیں کرتے۔ اب بھی میرے دل میں اپنی قوم کا درد ہے اور میں آپ کے پاس اِس لئے آیا ہوں کہ آپ کے بیٹے کو تباہی سے بچاسکوں۔ اگر قیدی آپ کے قبضے میں ہیں تو انہیں میرے حوالے کر دیجئے۔ وہ آپ کے محل کے دروازے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ آپ یہاں ہیں" اُنہوں نے حکم دیا کہ کوئی سپاہی محل میں پاؤں نہ رکھے۔"

رانی نے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا: "آؤ میرے ساتھ"۔

بھیم سنگھ اپنے ساتھیوں کو وہاں ٹھہرنے کا حکم دے کر رانی کے پیچھے ہولیا۔ رانی اُسے پہلے اُس کمرے میں لے گئی۔ جہاں پرتاب رائے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ جب رانی نے یہ بتایا کہ پرتاب رائے اُس کی خواہش سے قتل ہوا ہے۔ تو بھیم سنگھ نے کہا: "بھگوان کا شکر ہے کہ آپ کو دوست اور دشمن کی تمیز ہو گئی ہے۔"

رانی نے جواب دیا: "میں اسے شروع سے اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ لیکن کاش مہاراج میری بات مانتے۔ اب اگر تم عرب قیدیوں کو دیکھنا چاہتے ہو تو کونے کے کمرے میں موجود ہیں۔ مہاراج نے اپنی زندگی میں میرا کہا نہ مانا۔ اُن کی موت کے بعد میں نے قیدیوں کو اپنے پاس مہمان رکھا

ہے۔ لیکن یہ مسلمانوں کو خوش کرنے کی نیت سے نہ تھا بلکہ میں شروع سے یہ محسوس کر رہی تھی کہ اُن کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ پرتاب رائے نے انہیں قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور اگر اُس کا بس چلتا تو وہ دریغ نہ کرتا۔"

بھیم سنگھ نے کہا: "بزدل ہمیشہ ظالم ہوتے ہیں۔ قیدی اب کیا محسوس کرتے ہیں؟"

رانی نے جواب دیا: "جہاں تک میرا بس چلا ہے میں نے انہیں کوئی تکلیف نہیں دی۔ چلو تم دیکھ لو۔"

بھیم سنگھ نے کہا: "کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ محمد بن قاسم خود یہاں آ کر دیکھ لے۔ اُسے بہت تشویش ہے۔"

رانی نے جواب دیا: "جاؤ لے آؤ اُسے۔"

(۴)

رانی کی رہنمائی میں محمد بن قاسم، زبیر، خالد، ناہید اور زہرا کے علاوہ چند سالار محل کے کونے کے کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ علی خالد کو دیکھتے ہی بھاگ کر اُس کے ساتھ لپٹ گیا۔ رانی اس سے پہلے خود اُنہیں اپنی شکست اور مسلمانوں کی فتح کا حال سنا چکی تھی۔ خالد اور زبیر یکے بعد دیگرے مردوں سے بغلگیر ہوئے۔ عورتوں نے ناہید کے ساتھ گلے مل کر تشکر کے آنسو بہائے۔ محمد بن قاسم نے بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ مردوں سے یکے بعد دیگرے مصافحہ کیا اور عورتوں کو تسلی دی۔ اور سب سے آخر میں رانی سے مخاطب ہوا۔ "نیک دل

خاتون! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

رانی نے پہلی دفعہ محمد بن قاسم کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں یہ گواہی دے رہی تھیں کہ یہ الفاظ رسمی نہیں۔

محمد بن قاسم نے خالد اور زبیر سے کہا: "میرے لئے ابھی بہت سا کام باقی ہے۔ تم انھیں اپنے ساتھ لے کر قیام گاہ میں پہنچ جاؤ۔"

رانی نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ اِس محل میں رہ سکتے ہیں۔"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "شکریہ! لیکن آپ کو تکلیف ہوگی۔"

رانی نے کہا: "اگر میں آپ کی قید میں نہیں تو کل ارور چلی جاؤنگی۔ اور یہ سارا محل آپ کے لئے خالی ہوگا۔"

محمد بن قاسم نے کہا۔ "آپ کو یہ کیسے شک ہوا کہ مسلمان مہمان نوازی کا بدلہ یوں دیا کرتے ہیں۔ آپ اگر ارور جانا چاہتی ہیں تو میں برہمن آباد کے چند سردار آپ کے ساتھ بھیج سکتا ہوں۔"

رانی نے سر سے پاؤں تک محمد بن قاسم [illegible] دیکھا اور کہا۔

"اگر میں ارور چلی جاؤں تو کیا وہاں آپ کی افواج میرا تعاقب نہ کریں گی؟"

محمد بن قاسم نے کہا: "ارور ظلم کی بادشاہت کا آخری قلعہ ہے۔ اور میں اُسے فتح کرنے کا ارادہ ترک نہیں کر سکتا۔ میں وہاں ایسے قید خانے کا حال سن چکا ہوں جن میں ابوالحسن جیسے کئی اور قیدی دم توڑ رہے ہیں۔"

رانی نے کہا: "لیکن ابوالحسن تو فرار ہو چکا ہے اور ارور کے قید خانے

میں باقی قیدی ہماری رعایا ہیں۔ اُن کے متعلق سوچنا ہمارا کام ہے۔ اگر آپ کا قانون ہمارے قانون سے اچھا ہے تو اُسے اپنے ملک میں چلائیے ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیجئے۔ عربوں کے ساتھ بدسلوکی کی ہمیں کافی سے زیادہ سزا مل چکی ہے۔"

"لیکن ہم یہ دعوےٰ لے کر اُٹھے ہیں کہ ملک خدا کے ہیں اور قانون بھی خدا کا ہونا چاہئے۔ ہم راجہ اور رعیّت کی تفریق مٹا کر تمام انسانوں کو ایک سطح پر لانا چاہتے ہیں۔ ہم جبر و استبداد کی بجائے عدل و انصاف کی حکومت چاہتے ہیں۔"

رانی نے کہا "لیکن راجہ اور رعیّت کا جھگڑا تو ہندوستان کی ہر سلطنت میں ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ جس طرح باقی ہندوستان میں انسانوں کا قانون نظر انداز کرتے ہیں، اِس طرح اَرور کو بھی اپنی حالت پر چھوڑ دیں؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا "آپ کو ہمارے متعلق غلط فہمی ہے۔ اَرور ہماری آخری منزل نہیں۔ مَیں ہندوستان کی آخری حدود تک اِس انقلاب کا پیغام لے جانا چاہتا ہوں۔ سندھ سب سے پہلے ہماری توجہات کا مرکز اس لئے بنا کہ یہاں ستم رسیدہ انسانیت کی دبی ہوئی آواز ہمارے کانوں تک سب سے پہلے پہنچی۔"

رانی نے پھر غور سے محمد بن قاسم کی طرف دیکھا اور کہا "تو آپ تمام ہندوستان کو فتح کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں؟"

"ہاں میں تمام ہندوستان پر اسلام کی فتح چاہتا ہوں اور یہ ایک خواب نہیں"۔

رانی نے کہا" یونان سے سکندر بھی یہی ارادہ لے کر آیا تھا، اور آپ اُس سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں"۔

"لیکن سکندر بادشاہوں کے مقابلہ میں شہنشاہ بن کر آیا تھا۔ اُس کا مقصد لوگوں کو بادشاہوں کی غلامی سے آزادی دلوانا نہ تھا۔ بلکہ اُنہیں اپنا غلام بنانا تھا۔ میں خدا کی زمین پر انسان کی بادشاہت سے منکر ہوں۔ اُسے اپنی طاقت پر بھروسہ تھا، مجھے دین کی صداقت پر بھروسہ ہے۔ اُسے انسانوں کی مدد کا بھروسہ تھا لیکن مجھے اللہ کی مدد کا بھروسہ ہے۔ اُس کی سب سے بڑی شکست یہ تھی کہ اُس کے اپنے سپاہی اُس سے بگڑ گئے اور میری سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ جو لوگ کل تک میرے دشمن تھے، آج میرے ساتھی ہیں۔ اور یہ میری فتح نہیں، اسلام کی صداقت کی فتح ہے"۔

رانی نے مایوس ہو کر کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اَرور پر ضرور حملہ کریں گے؟"

"یہ میرا فرض ہے"۔

رانی نے ملتجی ہو کر کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ برہمن آباد اور اَرور کے درمیان کوئی ایسی خندق نہیں جسے آپ پاٹ نہ سکیں۔ لیکن اگر آپ مجھے کسی نیک سلوک کی مستحق سمجھتے ہیں، تو میرے بیٹے پر رحم کریں۔ وہ آپ کا آخری دم تک مقابلہ کرے گا۔ آپ مجھے اَرور جا کر اُسے

سمجھانے کا موقع دیں۔ اُسے جے سنگھ نے یہ یقین دلایا ہے کہ مہاراج مرے نہیں، زندہ ہیں۔ میں اُسے یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اب مقابلے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن آپ کو یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ اُس کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد آپ اُس سے کوئی بدسلوکی نہیں کریں گے۔ وہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اگر آپ کو اُس کا سندھ میں رہنا ناگوار ہو تو میں اُسے کہیں دُور لے جاؤں گی۔"

محمد بن قاسم نے کہا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ ہوگی۔ بلکہ حق کے مقابلے میں باطل کی علمبرداری سے دستکش ہو جانے کے بعد ہم اُسے قابلِ احترام سمجھیں گے۔ آپ کب جانا چاہتی ہیں؟"

"میں علی الصباح روانہ ہو جاؤں گی۔"

(۵)

سندھ کا دارالحکومت اگرچہ ارور تھا۔ لیکن برہمن آباد کی سیاسی اور فوجی اہمیت اُس سے کہیں زیادہ تھی۔ آبادی کے لحاظ سے بھی یہ شہر سندھ کا سب سے بڑا شہر تھا۔ فتح کے بعد محمد بن قاسم نے جو خطوط حجاج بن یوسف اور خلیفہ ولید کو بھیجے، اُن میں اُس نے لکھا کہ سندھ کی قوتِ مدافعت عملی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ ارور کے متعلق اُسے یقین ہے کہ وہاں کی افواج لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیں گی۔ اور اگر اُنہوں نے مزاحمت کی بھی، تو یہ معرکہ سندھ کے باقی معرکوں کے مقابلے میں نہایت غیر اہم ہوگا۔ سندھ کا آخری اور غالباً مضبوط ترین شہر ملتان ہے۔ اور اُس کی مذہبی تقدیس

کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاید پنجاب کے بعض راجے بھی ملتان کے سندھی حاکم کا ساتھ دیں۔ لیکن اُسے خدا کی مدد پر بھروسہ ہے۔ برہمن آباد کی فتح سے پہلے محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف کی ہدایات موصول ہو چکی تھیں کہ وہ دشمن کی بیجا ناز برداری نہ کرے۔ لیکن محمد بن قاسم نے ان خطوط کے جواب میں اِس بات کی وضاحت کی کہ سندھ کے باشندے ترکستان اور سپین کے باشندوں سے بہت مختلف ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ اُن سے نیک سلوک کے بعد اُسے اُن سے بغاوت کی توقع نہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کل تک جو سپاہی اُس کے خلاف شمشیر بکف تھے، آج اُس کے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔

(۶)

رانی لاڈھی برہمن آباد کے چند سرداروں کی معیت میں ارور پہنچی۔ اُس نے اپنے بیٹے کی یہ غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کی، کہ اُس کا باپ زندہ ہے۔ لیکن ننھی کی سوتیلی ماں نے ہتھیار ڈال دینے کی تجویز کی مخالفت کی اور اُسے طعنہ دیا کہ تمہاری ماں ملیچھ دشمن کی آلۂ کار بن چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی شہر کے ایک پروہت نے یہ مشہور کر دیا کہ رانی لاڈھی مسلمان سپہ سالار سے ہم کلام ہو کر اپنا دھرم بھرشٹ کر چکی ہے[1] مختلف زبانوں کی حاشیہ آرائی کے ساتھ یہ خبر شہر میں آگ کی طرح

---

[1] اس واقعہ کی آڑ لے کر بعض تاریخ دان یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لاڈھی دیوی قبولِ اسلام کے بعد محمد بن قاسم سے شادی کر چکی تھی اور اُس کا اسلامی نام عائشہ تھا (دیکھو صفحہ ۴۰۹)

پھیل گئی۔ ارور کے چند عہدہ دار پرتاب رائے کے رشتہ دار تھے۔
اُن میں سے ایک نے پرتاب رائے کے قتل کا انتقام لینے کے لئے بھرے

(بہ سلسلہ گزشتہ) لیکن یہ داستان زیادہ تر اُن مغربی تاریخ دانوں کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہے جو ہر بڑے آدمی کے ساتھ عشق کی ایک داستان منسوب کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی ایک اور داستان بھی محمد بن قاسم کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ محمد بن قاسم نے ارور کی فتح کے بعد راجہ داہر کی دو لڑکیاں خلیفہ ولید کے پاس بھیج دی تھیں۔ اور ایک لڑکی نے اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کی نیت سے ولید کو محمد بن قاسم کے خلاف یہ کہہ کر مشتعل کر دیا کہ نعوذ باللہ محمد بن قاسم اُسے دربارِ خلافت میں بھیجنے سے پہلے اُس کے دامنِ عصمت پر دھبہ لگا چکا ہے اور ولید نے غضب ناک ہو کر محمد بن قاسم کو قتل کروا دیا۔ اور اُس کے بعد جب اُس لڑکی نے یہ بتایا کہ اُس نے محض انتقام لینے کے لئے یہ قِصّہ تراشا تھا تو ولید نے اُسے بھی قتل کروا دیا۔ پہلا قِصّہ یوں بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ لاڈھی دیوی قبولِ اسلام کے بعد مسلمانوں کی پناہ میں آ چکی تھی اور امیرِ عساکر کی بیوی ہونے کی حیثیت میں اُس کا منصب ہرگز ایسا نہ تھا کہ وہ ارور میں مخبر بن کر جاتی۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اُس کے دل میں اپنے بیٹے کے لئے بہت بڑی تڑپ تھی تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا نوجوان جو سترہ سال کی عمر میں ہندوستان فتح کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ ارور کی ادنیٰ سی مہم سے کترا کر اپنی نو مسلم بیوی ارور کے بھرے دربار میں بھیج دیتا بخصوصاً اُن حالات میں جب کہ ارور کی رائے عامہ اُس کے قبولِ اسلام پر سخت مشتعل ہو سکتی تھی۔

دوسرے قِصّے کے راوی وہ تاریخ دان ہیں جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ خلیفہ ولید محمد بن قاسم سے پہلے راہیِ مُلکِ عدم ہو چکا تھا۔

دربار میں یہ کہہ دیا کہ رانی نے اُسے محمد بن قاسم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قتل کیا ہے۔ اِن تمام واقعات نے ففی کو اپنی ماں کے خلاف غضبناک کر دیا۔ اور اُس نے لاڈھی رانی سے کہا:" کاش تم میری ماں نہ ہوتیں"۔

رانی کو اپنے اکلوتے بیٹے سے یہ توقع نہ تھی۔ یہ الفاظ ایک نشتر کی طرح اُس کے سینے میں اُتر گئے۔ اُس نے یکے بعد دیگرے اپنے بیٹے، اپنی سوکن اور حاضرین دربار کی طرف دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں چلائی:۔

"بیٹا شرم کرو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ اگر ان لوگوں کی مدد سے مجھے تمہاری کامیابی کی ذرّہ بھی اُمید ہوتی۔ تو میں تمہیں بصرہ تک۔ دشمن کا تعاقب کرنے کا مشورہ دیتی۔ لیکن یہ لوگ کمینے بھی ہیں اور بُزدل بھی۔ جو تمہارے باپ کے ساتھ وفا نہ کر سکے، وہ تمہارے ساتھ وفا نہیں کریں گے۔ جو دشمن لاکھوں سپاہیوں کو شکست دے چکا ہے اُس کے سامنے تمہارے دس بیس ہزار سپاہی نہیں ٹھہر سکتے۔ سندھ کی آدھی فوج اُس کے ساتھ مل چکی ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے ان سے زیادہ غیور سرداروں کو مسلمانوں کے سپہ سالار کے پاؤں پر ہاتھ رکھتے دیکھ چکی ہوں۔ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ تم ہار مان لو۔ ورنہ یاد رکھو، یہ لوگ عین موقع پر تمہیں دھوکا دیں گے۔ اس وقت زیادہ جوش وہ لوگ دکھا رہے ہیں جنہیں ابھی تک دشمن کا سامنا کرنے کا موقع نہ ملا"۔

ففی نے جوش میں آکر کہا:۔ "ماتا! خاموش رہو۔ میرے ساتھی مرتے دم تک میرا ساتھ دیں گے"۔

"تو بیٹا یاد رکھو۔ اس جنگ میں انہیں موت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا"

ایک ماہ کے بعد جب محمد بن قاسم برہمن آباد کے انتظامات سے فارغ ہو کر ارور کی طرف پیش قدمی شروع کر چکا تھا۔ ففی کو یہ معلوم ہوا کہ مرتے دم تک اس کا ساتھ دینے کا دعوے کرنے والے۔ سرداروں کے متعلق رائی کا اندازہ صحیح تھا۔

محمد بن قاسم کی فوج نے ابھی نصف راستہ طے کیا تھا کہ ایک شام ففی کو معلوم ہوا کہ اس کے چند سردار پانچ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ راتوں رات شہر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔

جب محمد بن قاسم کی فوج ارور سے فقط ایک منزل کے فاصلے پر تھی۔ ارور سے اور تین ہزار سپاہی رات کے وقت شہر کے دروازے کھلا پا کر سیڑھیوں کی مدد سے فصیل پر سے اتر گئے۔

ففی کا دل ٹوٹ گیا۔ اور اس نے رہی سہی فوج کے ساتھ راہ فرار اختیار کی۔

محمد بن قاسم نے ایک نو مسلم سندھی سردار کو شہر کا حاکم مقرر کیا اور چند دن کی تیاری کے بعد ملتان کی طرف پیش قدمی کی ۔

اُن کا دیوتا

(۱)

مُلتان کے محاصرہ کے دوران میں محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف کی وفات کی خبر ملی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے اپنی بیوی کا مکتوب ملا جس میں اُس نے اپنے باپ کی موت کا ذکر کرنے کے بعد محمد بن قاسم کی ماں کے متعلق لکھا کہ اُن کی صحت پھر خراب ہو گئی ہے۔ لیکن اُن کی یہ خواہش ہے کہ آپ ہندوستان میں اپنا کام ختم کئے بغیر گھر آنے کا ارادہ نہ کریں۔ زبیدہ نے اپنے متعلق لکھا۔ میں اُن ہزاروں بیویوں سے مختلف نہیں جن کے شوہر سندھ، ترکستان اور اندلس میں برسرِ پیکار ہیں، اور سندھ کے سپہ سالار کی بیوی ہوتے ہوئے میرا یہ فرض ہے کہ میں آپ کی جُدائی کو عام سپاہیوں کی بیویوں کی نسبت زیادہ صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ آپ نے لکھا تھا کہ ملتان کی فتح کے بعد ہمیں اپنے پاس منگوا لیں گے۔ لیکن والدہ کی صحت شاید آئندہ چند مہینے انہیں سفر کی اجازت نہ دے۔ مجھے ڈر ہے کہ گھر کے متعلق آپ کی تشویش، آپ کی فتوحات

کی رفتار پر اثر انداز نہ ہو۔ انتہائی تکلیف کے وقت آپ کی فتح کی خبر سُن کر اُن کے چہرے پر رونق آجاتی ہے۔ جب کبھی اُن کا جی اُداس ہوتا ہے تو مَیں اُن کے مُنہ سے یہ دُعا سُنتی ہوں "یا اللہ! مجھے قرونِ اُولیٰ کے مجاہدین کی ماؤں کا صبرو استقلال دے"۔ اور جب کبھی وہ مجھے غمگین دیکھتی ہیں تو یہ کہتی ہیں۔ "زبیدہ! تم ایک مجاہد کی بیوی ہو"۔ ناہید اور زہرا کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ مجھے ان بہنوں پر رشک آتا ہے جو ہر روز سندھ کے میدانوں میں مجاہدوں کے گھوڑوں سے اُڑنے والی گرد دیکھتی ہیں۔ بصرہ میں اُن عورتوں اور بچّوں کا انتظار ہو رہا ہے جنہیں آپ نے برہمن آباد کے قید خانہ سے آزاد کروایا ہے۔ اُنہیں کب بھیجیں گے؟ مَیں اس سے زیادہ اَور کیا دُعا کر سکتی ہوں کہ آپ کا ہر قدم بلندی کی طرف ہو اور میری نگاہ کا ہر آسمان آپ کے سمندِ اقبال کے پاؤں چُومے"۔

چند دنوں کی مزاحمت کے بعد ملتان کے باشندوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور محمد بن قاسم، امیر داؤد نصر کو ملتان کا امیرِ اعلیٰ مقرر کر کے ارور کی طرف واپس ہوًا۔ راستے میں اُسے خبر ملی کہ قنوج[1] کا راجہ ہری چندر راجکمار جے سنگھ کو پناہ دے کر سندھ پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی محمد بن قاسم یلغار کرتا ہوًا ارور پہنچا اور وہاں قیام کئے بغیر قنوج پر چڑھائی کر دی۔ سندھ اور راجپوتانہ کی سرحد پر دونوں افواج کا

---

[1] یہ قنوج جنوبی ہند کا مشہور شہر نہیں بلکہ موجودہ اودھے پور کے قریب اُس زمانے کی ایک طاقتور ریاست کا دارالحکومت تھا۔

سامنا ہوا۔ راجہ ہری چندر جے سنگھ کی زبانی یہ سُن کر اُس کی اعانت کے لئے آمادہ ہوا تھا کہ بیرونی حملہ آوروں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں لیکن جب اُس نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ محمد بن قاسم کی جے کے نعرے لگانے والے سندھی عربوں سے کہیں زیادہ ہیں تو وُہ جے سنگھ کو کوستا ہوا میدان چھوڑ کر واپس بھاگ گیا۔ جے سنگھ کے بعض ساتھیوں نے اُسے محمد بن قاسم کی طرف صُلح کا ہاتھ بڑھانے کا مشورہ دیا۔ لیکن اُس نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر بھی اُن کا یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ اور جنوب کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ صرف دو سرداروں نے اُس کا ساتھ دیا اور باقی محمد بن قاسم کی پناہ میں چلے آئے۔

اس کے بعد محمد بن قاسم سندھ کے انتظامات درست کرنے اور سندھ کی ہمسایہ ریاستوں پر چڑھائی کرنے سے پہلے اپنی افواج کو ازسرِنو منظم کرنے کے لئے ارور واپس چلا آیا۔ بصرہ سے ایک قاصد اُس کی آمد سے ایک دِن پہلے ارور پہنچ چکا تھا۔ اُس نے محمد بن قاسم کو دیکھتے ہی کہا۔ "سالارِ اعظم! مَیں ایک بہت بُری خبر لایا ہوں۔"

محمد بن قاسم کے پُرسکون چہرے پر تفکرات کے ہلکے سے آثار پیدا ہوئے اور اُس نے اپنے ہونٹوں پر ایک غمگین مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "یہ خبر میری ماں کے متعلق تو نہیں ؟"

ایلچی نے اثبات میں سر ہلایا اور جیب سے ایک خط نکال کر محمد بن قاسم کے ہاتھ میں دے دیا۔ محمد بن قاسم نے جلدی سے خط کھول کر پڑھا

اور اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہہ کر گردن جھکا لی۔

شام کے وقت شاہی محل کے اُس حصّے میں جسے محمد بن قاسم نے اپنے قیام کے لئے منتخب کیا تھا، شہر کے معززین کے علاوہ ہزاروں آدمی جمع ہو رہے تھے۔ جن کی نگاہوں میں فاتح سندھ ایک نیک دل بھائی اور ایک رحم دل باپ کا رُتبہ حاصل کر چکا تھا۔ محمد بن قاسم کی ماں کی موت پر وہ پروہت اظہارِ افسوس کر رہے تھے، جو اُسے اِس دیوتاؤں کی سرزمین پر ایک نیا دیوتا خیال کرتے تھے۔

محمد بن قاسم نے محل سے باہر نکل کر ایک مختصر سی تقریر میں ان سب کا شکریہ ادا کیا۔

رات کے وقت اُس نے مشعل کی روشنی میں پھر ایک بار زبیدہ کا مکتوب پڑھا اور اُس کی نگاہیں دیر تک اُن الفاظ پر مرکوز رہیں "بسترِ مرگ پر امی جان کے آخری الفاظ یہ تھے: میری روح جسم کی قید سے آزاد ہو کر اُن میدانوں پر پرواز کر سکے گی جہاں میرا بیٹا اسلام کی فتوحات کے جھنڈے نصب کر رہا ہے!"

(۲)

تین ماہ کے بعد محمد بن قاسم عرب سپاہیوں کے علاوہ ایک لاکھ سندھی نومسلم اور اُن غیر مسلم سپاہیوں کو فوجی تربیت دے چکا تھا جو اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود باقی تمام ہندوستان کی آخری حدود تک اُس کم سن سالار کی فتوحات کے پرچم لہرانا انسانیت کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔

جس کے عدل وانصاف نے اُسے مفتوحہ علاقے کے ہر باشندے کی نگاہ میں ایک دیوتا بنا دیا تھا۔ وہ اُسے اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے، اور باقی ہندوستان کے لئے ایسے نجات دہندہ کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

ایک دن آرور کے ایک مشہور سنگ تراش نے دیبل کے ایک چوراہے میں اپنا شاہکار نمائش کے لئے رکھ دیا۔ یہ سنگِ مرمر کی ایک مورتی تھی جس کے نیچے یہ الفاظ کندہ تھے "وہ دیوتا جس نے اس ملک میں عدل اور مساوات کی حکومت قائم کی۔"

دیبل کے ہزاروں باشندے اس مورتی کے گرد جمع ہو گئے، اور مورتی کو پاؤں سے لے کر سر تک پھولوں میں ڈھانپ دیا۔ دیبل کے بہت سے سردار اس مورتی کو اپنے گھر کی زینت بنانے کے لئے سنگتراش کو منہ مانگے دام دینے کے لئے تیار تھے۔ لیکن شہر کے پروہتوں کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ محمد بن قاسم جیسے دیوتا کی مورتی کا مقام سرداروں کے محل نہیں بلکہ ہمارے مندر ہیں۔ سنگ تراش نے بھی اپنے شاہکار کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ اسے کسی مندر میں جگہ دی جائے۔ پروہتوں نے اس کے لئے بدھ کا ایک پرانا مندر منتخب کیا۔

شام کے وقت مورتی کو مندر کی طرف لے جاتے ہوئے شہر کے پروہتوں اور عوام کا جلوس شاہی محل کے سامنے سے گزرا بھیم سنگھ نے بھاگ کر محمد بن قاسم کو اطلاع دی کہ لوگ آپ کی مورتی مندر میں نصب کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں۔

محمد بن قاسم پریشان ہو کر محل سے باہر نکلا۔ جلوس اُسے محل کے دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑا دیکھ کر رُک گیا۔ شہر کے بڑے پروہت نے آگے بڑھ کر کہا:۔ "یہ لوگ آپ کی اس سے زیادہ عزت نہیں کر سکتے۔ یہ ایک سنگ تراش کا کمال ہے۔ لیکن آپ کی تصویر جو اُن کے دلوں میں ہے اِس مُورتی سے کہیں زیادہ حسین ہے"۔

محمد بن قاسم نے بلند آواز میں ہجوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیرو! مَیں تُم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔

ناقوس اور شہنائیوں کی صدائیں بند ہو گئیں۔ اور مجمع پر ایک سکوت طاری ہو گیا۔ محمد بن قاسم نے اپنی تقریر میں اصنام پرستی کے متعلق اسلام کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی اور اختتام پر عوام سے یہ اپیل کی۔ "مجھے گنہگار نہ کرو۔ میری اگر کوئی خوبی ہے تو وہ اسلام کی عطا کی ہوئی ہے۔ اگر اسلام کا پیرو کار ہو کر مَیں انسانیت کی کوئی اچھی مثال بن سکتا ہوں، تو یہ دروازہ سب کے لئے کھُلا ہے۔ تم میری پُوجا نہ کرو۔ بلکہ اُس کی پُوجا کرو جس نے مجھے بنایا ہے۔ جس کی مَیں عبادت کرتا ہوں، جس کا دین ہر انسان کو عدل، مساوات اور حُرّیت کا سبق دیتا ہے"۔

لوگ جذبات سے مغلوب تھے لیکن مُورتی کے مقابلے میں وہ جیتے جاگتے دیوتا کے حکم کی تعمیل سے انکار نہ کر سکے۔ جب محمد بن قاسم نے یہ کہا کہ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر رُوحانی تکلیف ہوئی ہے تو سنگ تراش نے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا:۔ "ایک سنگ تراش صرف مُورتی بنا کر

اپنے جذبات کا اظہار کر سکتا ہے۔ میں نے دیوتاؤں کے نام سُنے تھے اور اُن کی مختلف خیالی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ مگر اب آپ کو دیکھنے کے بعد مجھے یقین ہو چکا ہے کہ میں خواہ کسی دیوتا کی تصویر بناؤں۔ اُس کی شکل و صورت وہی ہو گی جو آپ کی ہے۔ میرا بیٹا بیلا کی جنگ میں زخمی ہؤا تھا۔ آپ نے دوسرے زخمیوں کی طرح اُس کی بھی تیمارداری کی اور اُس کے زخم اچھّے ہو گئے۔ لیکن یہاں پہنچ کر وہ بیمار ہو گیا۔ اور چند دن کے بعد چل بسا۔ مرتے وقت وہ آپ کے اُس رومال کو چوم رہا تھا جو آپ نے اُس کے زخم پر باندھا تھا اور مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ مَیں آپ کی مُورتی بناؤں گا۔ لیکن آپ کو برہم دیکھ کر شاید اُس کی آتما کو بھی دُکھ ہو۔ مَیں اپنے بیٹے کے دیوتا کی پُوجا کرنے کی بجائے اُس کا حکم ماننا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر آپ کا حکم ہے تو مَیں یہ مُورتی توڑنے کے لئے تیار ہوں"۔

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہو گا"۔

"احسان؟ یوں نہ کہیئے۔ اِس مُورتی کے ٹُوٹ جانے کے بعد بھی مَیں آپ کو ایک دیوتا ہی سمجھوں گا۔ اور سندھ کے ہزاروں انسان بھی آپ کو دیوتا ہی خیال کریں گے"۔

محمد بن قاسم نے کہا۔ "لیکن میری تمنّا فقط یہ ہے کہ مَیں اس مُلک میں انسانیت کا ایک خادم ہونے کی حیثیت میں پہچانا جاؤں"۔

سنگ تراش نے سینے پر پتھر رکھ کر تیشے کی ایک ضرب سے مُورتی

کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ لیکن ہجوم اِن ٹکڑوں کو جواہرات کا انبار سمجھ کر اُن پر ٹوٹ پڑا۔

اِس واقعہ کے بعد اَرور کے ہزاروں باشندے اسلام کی تعلیم کے ساتھ دلچسپی لینے لگے۔ اور سندھ کے طول و عرض میں نومسلموں کی تعداد میں آئے دِن اضافہ ہونے لگا۔

(۳)

اَرور سے چند سالار رخصت پر جا رہے تھے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ واپسی پر اپنے بال بچوں کو ساتھ لا کر مستقل طور پر سندھ میں آباد ہو جائیں۔

محمد بن قاسم نے زبیدہ کو لکھا کہ وہ بصرہ سے سندھ آنے والی خواتین کے ساتھ چلی آئے۔ اور بصرہ کے حاکم کو بھی یہ لکھا کہ اُسے باقی عورتوں کے ساتھ سپاہیوں کی حفاظت میں ارور تک پہنچانے کا انتظام کرے۔ اس کے بعد وہ چند دن راجپوتانہ اور پنجاب کی تسخیر کے لئے نقشے بنانے میں مصروف رہا۔ چند دن کے غور و خوض کے بعد اُس نے پنجاب سے پہلے راجپوتانہ کو مسخر کرنا ضروری خیال کیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ زبیدہ کی آمد تک راجپوتانہ کی مہم سے فارغ ہو آئے۔ اور اُس کے بعد ملتان کو اپنا مستقر بنا کر پنجاب کا رُخ کرے۔ چنانچہ اُس نے بصرہ جانے والے سپاہیوں کے رخصت ہونے کے سات دِن بعد ایک شام شہر سے باہر فوجی مستقر میں اپنی فوج کے سامنے مختصر سی تقریر کرنے کے بعد اُنہیں یہ حکم دیا کہ وہ علی الصّباح کوچ کے لئے تیار رہیں۔

لیکن ایک مغربی مؤرخ کے قول کے مطابق "محمد بن قاسم کا آفتاب اقبال عین دوپہر کے وقت غروب ہو رہا تھا" صبح کی نماز کے بعد جب ارور کے باشندے پڑاؤ میں جمع ہو کر محمد بن قاسم کو الوداع کہہ رہے تھے، اور عورتیں آگے بڑھ بڑھ کر سپاہیوں کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال رہی تھیں۔ اچانک ایک طرف سے اُڑتی ہوئی گرد دکھائی دی اور آن کی آن میں پچاس عرب مسلح سوار نمودار ہوئے۔ محمد بن قاسم ایک سفید گھوڑے پر فوج کی صفوں میں چکر لگا رہا تھا۔ دُور سے آنے والے سواروں کی رفتار دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اور وہ اپنے چند سالاروں کے ساتھ ایک طرف ہو کر آنے والے سواروں کی راہ تکنے لگا۔

ان سواروں کے ہمراہ محمد بن قاسم کے چند وہ سالار بھی تھے۔ جو ایک ہفتہ پہلے بصرہ کی طرف رخصت پر روانہ ہوئے تھے۔ ایک سوار نے آگے بڑھ کر محمد بن قاسم کو ایک خط پیش کرتے ہوئے کہا "یہ امیر المؤمنین سلیمان بن عبدالملک کا مکتوب ہے"۔

محمد بن قاسم نے چونک کر کہا "امیر المؤمنین ... سلیمان ......؟"

اُس نے جواب دیا "ہاں خلیفہ ولید وفات پا چکے ہیں"۔

محمد بن قاسم نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہہ کر جلدی سے خط کھول کر پڑھا اور کچھ دیر گردن جھکا کر سوچنے کے بعد قاصد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے سلیمان سے یہی توقع تھی۔ یزید بن ابو قبشہ کون ہیں؟

ایک ادھیڑ عمر آدمی نے گھوڑا آگے کیا "میں ہوں"۔

محمد بن قاسم نے اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر یزید بن ابو قبشہ کے ساتھ مصافحہ کیا اور کہا "آپ کو اس فوج کی قیادت مبارک ہو۔ میرے پاؤں امیر المومنین کی بیڑیاں پہننے کے لئے حاضر ہیں۔"

یزید بن ابو قبشہ محمد بن قاسم کی معصوم مسکراہٹ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس نے پڑاؤ میں اُن بے شمار سپاہیوں کی طرف دیکھا، جو کوچ کے لئے امیر عساکر کے حکم کے منتظر تھے۔ اُن سالاروں کی طرف دیکھا جو ولید کی موت اور سلیمان کی مسند نشینی کی خبر سُن کر محمد بن قاسم کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ یزید بن ابو قبشہ نے محسوس کیا کہ وہ خود ایک لاکھ جانبازوں کے قائد کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت میں کھڑا ہے۔ محمد بن قاسم کے یہ الفاظ کہ میرے پاؤں امیر المومنین کی بیڑیاں پہننے کے لئے حاضر ہیں اُس کے کانوں میں بار بار گونج رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ قدرت نے اُس کے کندھوں پر زمین و آسمان کا بوجھ لاد دیا ہے۔ محمد بن قاسم کی طرف اُس کی نگاہیں کئی بار اُٹھ اُٹھ کر جھکیں اور جھک جھک کر اُٹھیں۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، اُن سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ کئی بار الفاظ اُس کی زبان تک آ آ کر رُک گئے۔ بالآخر اُس نے کہا "میرے دوست قدرت نے یہ خدمت میرے حصّے میں لکھی تھی۔"

محمد بن قاسم نے جواب دیا "آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ فقط ایلچی ہیں۔ خالد انہیں محل میں لے چلو۔ اور زبیر تم سپاہیوں کو حکم دو کہ ہم نے آج کوچ کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔"

بھیم سنگھ نے آگے بڑھ کر کہا۔ " اگر اس خط میں کوئی راز کی بات نہ ہو تو ہم سب یہ جاننے کے لئے بے قرار ہیں کہ دربارِ خلافت سے آپ کو کیا حکم ملا ہے؟"

محمد بن قاسم نے خط محمد بن ہارون کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کو پڑھ کر سنا دیں گے۔"

(۴)

شام کے وقت اَرور کے ہر گلی کوچے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ حجاج بن یوسف کے خاندان کے ساتھ سلیمان کی پرانی دشمنی کی خبر مشہور ہو چکی تھی۔ ہر گھر میں سندھ کے نئے گورنر کی آمد اور محمد بن قاسم کی روانگی کا ذکر ہو رہا تھا۔ شہر کے ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے شاہی محل کے گرد جمع ہو کر شور مچا رہے تھے۔

نمازِ مغرب کے بعد محمد بن قاسم کی فوج کے تمام عہدہ دار محل کے ایک وسیع کمرے میں جمع ہوئے۔ محمد بن قاسم کو اُس کی مرضی کے خلاف اس اجتماع میں شریک ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اُس نے ایک مختصر سی تقریر میں کہا:-

"میں صبح دمشق روانہ ہو جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور اس فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ایک سپاہی کا سب سے پہلا فرض اطاعتِ امیر ہے۔ آپ اس حادثہ سے پریشان نہ ہوں اور اپنے نئے حاکم کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں۔ امیر المؤمنین سلیمان غالباً یہ دیکھنا چاہتے ہیں

کہ میرے دل میں اطاعتِ امیر کا جذبہ ہے یا نہیں۔ دمشق سے روانگی کے وقت وُہ مجھ سے بدظن ہو گئے تھے۔ لیکن یہ وُہ زمانہ تھا جب اُن پر کسی ذمہ داری کا بوجھ نہ تھا۔ اب وہ امیرالمؤمنین ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اُن کے مزاج میں تبدیلی آچکی ہو گی۔ بہت ممکن ہے کہ وہ مجھے ہندوستان میں اپنا ادھورا کام پُورا کرنے کے لئے واپس بھیج دیں۔ لیکن اگر مَیں اُن کی غلط فہمی دُور نہ کر سکا اور مجھے دوبارہ یہاں آنے کا موقع نہ دیا گیا، تو بھی یزید بن ابوقبشہ کی اطاعت تمہارا فرض ہو گا۔"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "آپ جو حکم دیں ہم ماننے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن سندھ کے تمام سرداروں کی رائے یہ ہے کہ آپ اُس وقت تک یہاں سے نہ جائیں، جب تک کہ آپ کو خلیفہ کی نیک نیتی کا یقین نہ ہو جائے۔ مَیں زبیر سے دمشق کے واقعات سُن چکا ہوں۔ اور میرا دِل گواہی دیتا ہے کہ سلیمان آپ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرے گا۔ ہم آپ کو سلیمان کی رعیّت نہیں سمجھتے بلکہ اپنے دلوں کا بادشاہ سمجھتے ہیں۔ ہم آپ کے اشارے پر آگ میں کُود سکتے ہیں۔ لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے آپ کو بیڑیاں پہنائی جائیں۔ آپ کے عرب ساتھیوں کے دلوں میں دربارِ خلافت کا احترام ہو تو ہو۔ لیکن ہم ایسے خلیفہ کا احترام کرنے کے لئے تیار نہیں جو سندھ کو اُس کے محسنِ اعظم سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ ہم زندگی اور موت میں آپ کا ساتھ دینے کا عہد کر چکے ہیں۔ اور یہ عہد ٹوٹنے والا نہیں۔ آپ سندھ میں رہیں۔

سندھ کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے عرب ساتھی اگر آپ کا ساتھ چھوڑ بھی دیں۔ تو بھی ہماری ایک لاکھ تلواریں آپ کی حفاظت کے لئے موجود ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ سندھ کا ہر بچہ اور بوڑھا خطرے کے وقت آپ پر جان قربان کرنے کو تیار ہو گا۔ بھگوان کے لئے آپ نہ جائیں اور کم از کم اُس وقت تک نہ جائیں جب تک ہمیں یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ سلیمان آپ کے ساتھ بدسلوکی نہیں کرے گا۔ اگر میرے الفاظ آپ پر اثر نہیں کرتے تو آپ اِس محل کے نیچے جھانک کر دیکھیں اور پھر یہ فیصلہ کریں کہ وہ ہزاروں یتیم جو آپ کو اپنا باپ سمجھتے ہیں، وُہ ہزاروں بُوڑھے جو آپ کو اپنا بیٹا سمجھتے ہیں اور وہ بیوائیں جو آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہیں، آپ پر کوئی حق رکھتے ہیں یا نہیں؟"

اختتام پر بھیم سنگھ کی آواز بھرّا گئی۔ حاضرین ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

زبیر نے کہا "آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سلیمان آپ کے ساتھ نیک سلوک نہیں کرے گا۔ آپ یہیں ٹھیریں اور مجھے امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع دیں۔ میری جان اس قدر قیمتی نہیں، لیکن سندھ اور عالم اسلام کو آپ کی ضرورت ہے"۔

محمد بن قاسم نے جواب دیا "میں اپنے ہر سپاہی کی جان کو اپنی جان سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہوں۔ اور بھیم سنگھ! تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ لیکن تم میری ذات

کو میرے مقصد سے زیادہ اہمیت دے رہے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ دربارِ خلافت سے میری بغاوت درحقیقت اُس عظیم الشان مقصد سے بغاوت ہوگی۔ جس کے لئے گزشتہ ایک صدی میں لاکھوں سرفروش اپنا خون بہا چکے ہیں۔ یہ ایک لاکھ انسان تمام ہندوستان کو فتح کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اور میری جان اس قدر اہم نہیں۔ کہ میں سندھ کی ایک لاکھ تلواروں کو عالمِ اسلام کی ایک لاکھ تلواروں سے ٹکرانے کی اجازت دے دوں۔ ایسی بغاوت میں میری فتح بھی مسلمانوں کی بدترین شکست کے مترادف ہوگی۔ کیا میں یہ گوارا کرسکتا ہوں کہ اس وقت ترکستان اور اُندلس میں جو ہماری افواج مصروفِ جہاد ہیں، وہ صرف اس لئے واپس بُلا لی جائیں کہ سندھ کے سپہ سالار نے اپنی جان کے خوف سے عالمِ اسلام کے خلاف بغاوت کردی ہے۔ اگر یہ سوال میری اور سلیمان کی ذات تک محدود ہوتا تو شاید میں اُس کے سامنے ہتھیار نہ ڈالتا۔ لیکن میں اُس قوم کے سامنے ہتھیار ڈال رہا ہوں جو سلیمان کو اپنا خلیفہ تسلیم کر چکی ہے۔ اگر میری موت مسلمانوں کو اتنے بڑے انتشار سے بچا سکے تو میں اُسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ تم یہ کہہ چکے ہو کہ تم میرے اشارہ پر جان تک قربان کرنے کے لئے تیار ہو۔ میں تم سے کوئی قربانی طلب کرنے کا حقدار نہیں۔ لیکن اگر تم یہ چاہتے ہو، کہ سندھ سے رخصت ہوتے وقت میرے دِل پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ اور میں اپنے دِل میں یہ اطمینان لے کر جاؤں کہ سندھ میں میرا کوئی کام ادھورا

نہ تھا تو تم جو دین عملاً قبول کر چکے ہو، اُس کا زبان کے ساتھ بھی اعلان کر دو۔ میری یہ دعوت اپنے تمام اُن احباب کے لئے ہے جو اِس جگہ موجود ہیں۔ تم جیسے لوگوں کے قبولِ اسلام کے بعد سندھ کا مستقبل کبھی محمد بن قاسم کا محتاج نہ ہو گا۔ اب عشاء کی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ اور آج میری حالت اُس مسافر کی سی ہے جو ایک لمبے سفر کے بعد منزل پر قدم رکھتے ہی سو جانا چاہتا ہو۔ مَیں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری ذات سے متاثر ہو کر فوراً کوئی فیصلہ کریں۔ لیکن اگر آپ دِل سے اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کر چکے ہیں تو مجھے آپ کا اعلان سُن کر رُوحانی مسرت ہو گی۔"

بھیم سنگھ نے بلند آواز میں کلمۂ توحید پڑھتے ہوئے کہا۔ "مَیں اگر اسلام کی خوبیوں کا معترف نہ بھی ہوتا تو بھی مَیں آپ کی دعوت پر انکار نہ کرتا۔ میرے نزدیک اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ جیسے لوگ مُسلمان ہیں۔"

محمد بن قاسم نے اُٹھ کر بھیم سنگھ کو سینے سے لگا لیا اور کہا "مسلمانوں میں تمہیں مجھ جیسے ہزاروں انسان ملیں گے۔"

آٹھ اور سرداروں نے بھیم سنگھ کی تقلید کی اور حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

جب یہ لوگ عشاء کی نماز ادا کرنے کے لئے کمرے سے باہر نکل رہے تھے، محل کے ایک اور کمرے سے اُرور کے بڑے پروہت کی

قیادت میں مسرّ زین شہر کا ایک وفد یزید بن ابو قبشہ سے ملاقات کے بعد واپس جا رہا تھا۔ اِس وفد کے ارکان مُرجھائے ہوئے چہروں کے ساتھ یزید کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور مسکراتے ہوئے باہر نکلے یزید اُن کے دیوتا کی جان بچانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اور وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ سندھ کے آفتاب کے گرد جمع ہونے والے بادل چھٹ چکے ہیں۔

پروہت اور اُس کے ساتھی محل سے باہر نکلے تو بے شمار لوگ اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ ہزاروں سوالات کے جواب میں پروہت نے فقط یہ کہا۔ کہ تم اپنے اپنے گھر جاؤ۔ سندھ کے مقدّر کے ستارے کی نحوست ٹل چکی ہے۔ تمہارا دیوتا تمہیں مِل جائے گا۔

سلیمان کا قیدی

(۱)

عشاء کی نماز کے بعد جب محمد بن قاسم اپنی قیام گاہ میں داخل ہو رہا تھا، تو یزید بن ابو قبشہ نے آواز دی۔ خالد، زبیر اور بھیم سنگھ ابوقبشہ کے ساتھ آرہے تھے۔ محمد بن قاسم دروازے پر رُک کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ یزید نے قریب پہنچ کر خالد زبیر اور بھیم سنگھ کو رخصت کیا۔ اور محمد بن قاسم کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اُس کے کمرے میں داخل ہُوا۔

کمرے میں مشعل جل رہی تھی۔ علی ایک کُرسی پر سو رہا تھا محمد بن قاسم نے یزید کو ایک کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اِس لڑکے کو میرے ساتھ بہت محبت ہے۔ یہ بھی برہمن آباد میں قید تھا۔"

یزید نے مسکراتے ہوئے کہا: "اِس سرزمین میں وہ کون ہے جسے آپ کے ساتھ محبّت نہیں!"

محمد بن قاسم نے کُرسی پر بیٹھتے ہوئے موضوعِ سخن بدلنے کی نیت سے کہا: "میں چاہتا تھا کہ رخصت ہونے سے پہلے آپ کو سندھ

کے تمام حالات بتا دوں۔ میرا ارادہ تھا کہ علی الصباح آپ سے ملوں لیکن یہ اچھا ہوا کہ آپ خود ہی آ گئے!

یزید نے کہا "میں آپ سے سندھ کے حالات پوچھنے نہیں آیا۔ میں آپ کو یہ بتلانے کے لئے آیا ہوں کہ آپ یہیں رہیں گے"۔

محمد بن قاسم نے جواب دیا "آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔ لیکن میں امیرالمؤمنین کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا"۔

"لیکن آپ نہیں جانتے کہ سلیمان آپ کے خون کا پیاسا ہے"۔

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے خون کے چند قطروں کے لئے عالمِ اسلام دو حصّوں میں تقسیم ہو جائے"۔

"آپ اِس عمر میں میری توقعات سے کہیں زیادہ دُور اندیش ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر میں خود جا کر سلیمان کو یہ بتاؤں کہ سندھ میں ایک لاکھ سے زیادہ سپاہی آپ کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے تو وُہ آپ کے خلاف یقیناً اعلانِ جنگ نہیں کرے گا"۔

"لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ میں اور میرے ساتھ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت مرکز سے کٹ کر علیحدہ ہو جائے گی۔ اور ہم اس دُنیا میں اجتماعی جدوجہد کے انعام سے محروم ہو جائیں گے۔ میں آپ کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ لامرکزیت دُنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو لے ڈوبتی ہے"۔

یزید نے کہا "میرے پاس شمانہ سے پہلے اَروڑ کے محترزین کا ایک

وفد آیا تھا۔ اور وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا دیوتا ہم سے نہ چھینئے۔ اگر سلیمان نے آپ کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی تو وہ تمام ہندوستان کو اُس کے خلاف مشتعل کردیں گے"۔

"آپ اِس بات کی فکر نہ کریں۔ میں انہیں سمجھالوں گا۔"

یزید محمد بن قاسم کا فیصلہ اٹل سمجھ کر خاموش ہو گیا۔ اِس کے بعد محمد بن قاسم نے اُسے سندھ کے تمام حالات بتائے۔ اور اِس مُلک کے باشندوں کے ساتھ رواداری برتنے اور مشکل کے وقت ناصرالدین والیِ دیبل اور بھیم سنگھ کی ہدایات پر عمل کرنے کی تاکید کی۔

یزید نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے صرف ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آپ سلیمان کے حکم کی تعمیل میں یہاں سے بیڑیاں پہن کر رخصت ہونے پر ضِد نہ کریں۔ اِس سے ہزاروں انسانوں کے دِل مجروح ہوں گے اور ممکن ہے کہ لوگ مشتعل بھی ہو جائیں"۔

"اگر آپ اِسی میں مصلحت سمجھتے ہیں تو میں ضِد نہیں کروں گا۔ ورنہ اپنے پیروں میں اطاعتِ امیر کی بیڑیاں پہنتے ہوئے میں فخر محسوس کرتا۔"

یزید نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک اور سوال پُوچھنا چاہتا ہوں۔ عرب سالاروں میں سے آپ کا بہترین دوست کون ہے؟"

"میرے سب دوست ہیں۔ لیکن جو شخص میری زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہے، وُہ زبیر ہے۔ وہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہے گا۔"

"نہیں میں اُسے ایک ضروری کام کے لئے فوراً مدینہ بھیجنا چاہتا ہوں"۔

"وہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔"

"مَیں آپ کے رخصت ہونے سے پہلے اُسے روانہ کر دینا چاہتا ہوں آپ اُسے میرے کمرے میں بھیج دیں۔"

محمد بن قاسم نے علی کو جگایا اور کہا۔ "انہیں ان کے کمرے میں چھوڑ آؤ اور زبیر کو اُن کے پاس بھیج دو۔"

(۲)

یزید کو اُس کے کمرے میں چھوڑ کر علی زبیر کو بُلانے کے لئے چلا گیا اور یزید مشعل کی روشنی کے سامنے بیٹھ کر خط لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد زبیر اندر داخل ہوا۔ یزید نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

زبیر دیر تک بیٹھا رہا۔ خط ختم کرنے کے بعد یزید اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ ایک لمبے سفر کے لئے تیار ہو جائیں۔ یہ خط پڑھ لیں۔"

یزید نے خط زبیر کے ہاتھ میں دے دیا۔ زبیر نے خط پڑھا۔ اور اُس کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر اُمّید کی روشنی جھلکنے لگی۔ یزید کا یہ خط حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے نام تھا۔ جس میں اُس نے محمد بن قاسم کو عالم اسلام کا جلیل القدر مجاہد ثابت کرنے کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ اُسے سلیمان کے انتقام سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ یزید کے مکتوب کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "محمد بن قاسم جیسے مجاہد بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ مَیں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے

بڑے آدمی دیکھے ہیں۔ لیکن اِس نوجوان کی عظمت کا میں صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔ جس نے سترہ برس کی عمر میں سندھ فتح کیا، اور اب اپنے ایک لاکھ بارہ ہزار جاں بازوں کی موجودگی میں خوشی سے اطاعتِ امیر کی بیڑیاں پہننے کے لئے تیار ہے۔ محمد بن قاسم اسلام کے جسم میں ایک ایسا دِل ہے جس کی ہر دھڑکن میرے جیسے انسانوں کی عمر بھر کی ریاضت سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ عالمِ اسلام کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان سے بچا سکتے ہیں۔"

زبیر نے خط پڑھ کر یزید کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کو یقین ہے کہ وہ سلیمان پر اثر ڈال سکیں گے؟"

"مجھے یقین ہے۔ تم جاؤ۔ وہ اِس وقت مدینہ میں ہیں۔ لیکن راستے میں ایک لمحہ ضائع نہ کرنا۔ سلیمان کے مُشیر جنہیں محمد بن قاسم کے ساتھ فقط اِس لئے عناد ہے کہ وہ حجاج بن یوسف کا داماد ہے، ہر ممکن کوشش کریں گے کہ اُس کے متعلق فوراً فیصلہ ہو جائے۔ سلیمان خود اتنے بااثر آدمی کو زیادہ دیر تک زندہ رکھنا خطرناک خیال کرے گا۔ عمر بن عبدالعزیز اگر مدینہ میں نہ ہوئے تو جہاں بھی وہ ہوں تم وہاں پہنچو۔ اور کوشش کرو کہ وہ محمد بن قاسم کی قسمت کا فیصلہ ہونے سے پہلے دمشق پہنچ جائیں۔ میرے نزدیک یہ مہم تمام ہندوستان کی فتح سے زیادہ اہم ہے۔"

زبیر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی جاتا ہوں۔"

"جاؤ خدا تمہاری مدد کرے۔"

زبیر یزید کے کمرے سے نکل کر بھاگتا ہُوا اپنے کمرے میں پہنچا۔ ناہید، خالد اور زہرا اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ تمام نے یک زبان ہو کر پُوچھا۔ "کیا خبر لائے؟"

"مَیں مدینے جا رہا ہوں۔" زبیر صرف اتنا کہہ کر عقب کے کمرے میں لباس تبدیل کرنے کے لئے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وُہ لباس تبدیل کر کے باہر نکلا۔ ناہید نے کوئی سوال پُوچھے بغیر کھونٹی سے تلوار اُتار کر اُس کے ہاتھ میں دے دی۔

خالد نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "مَیں بھی آپ کے ساتھ جاتا ہوں۔"

زبیر نے تلوار کمر کے ساتھ باندھتے ہوئے کہا۔ "نہیں تم ناہید اور زہرہ کو لے کر محمد بن قاسم کے ساتھ بصرہ پہنچ جاؤ۔"

زہرہ نے کہا۔ "بھیا مدینہ میں آپ کو کیا کام ہے؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "مَیں ایک اُیسے آدمی کے پاس یزید کا خط لے کر جا رہا ہوں جو محمد بن قاسم کو بچا سکتا ہے۔ خالد تم بصرہ پہنچ کر سیدھے محمد بن قاسم کے گھر چلے جانا اور زبیدہ کو تسلّی دینا۔ مجھے اُمید ہے کہ مَیں بھی بہت جلد وہاں پہنچ جاؤں گا۔ ناہید خدا حافظ! زہرا میری کامیابی کے لئے دُعا کرنا۔" زبیر یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

راستے میں محمد بن قاسم کا کمرہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اندر مشعل ٹمٹما رہی تھی۔ اُس نے دروازے پر رُک کر اندر جھانکا اور پھر کچھ سوچ

کر وبے پاؤں اندر چلا گیا۔ محمد بن قاسم گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک معصوم بچے کی سی مسکراہٹ جسے زبیر نیند کی حالت میں اکثر اُس کے ہونٹوں پر دیکھ چکا تھا، آج بھی اُس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ سرہانے کی طرف دیوار کی کھونٹی پر وہ تلوار لٹک رہی تھی۔ جس کے ساتھ کمسن سالار نے سندھ کے مضبوط قلعوں اور سندھ کے باشندوں کے قلوب کو مسخر کر لیا تھا۔

ایک نامعلوم جذبے کے ماتحت زبیر کا دِل دھڑکا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ آہستہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا "میرے بھائی! میرے دوست، میرے سالار! خدا حافظ!!!"

محل سے باہر نکلتے وقت زبیر اپنے سہمے ہوئے دِل کو بار بار یہ کہہ کر تسلی دے رہا تھا "نہیں نہیں، ہم ایک بار اور ضرور ملیں گے!"

(۳۱)

صبح کے وقت محل کے دروازے پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ محمد بن قاسم دروازے سے باہر نکلا۔ تو ہجوم نے اِدھر اُدھر سمٹ کر دروازے کے سامنے سیڑھیاں خالی کر دیں۔ فوج کے عہدہ دار، شہر کے معززین، اور پروہت آگے ۔۔۔ بڑھ بڑھ کر اُس کے ساتھ مصافحہ کرنے لگے۔ بھیم سنگھ کی باری آئی، تو وہ بے اختیار محمد بن قاسم کے ساتھ لپٹ گیا۔ اُس نے کہا "آپ نے میرا اسلامی نام تجویز نہیں کیا"

محمد بن قاسم نے جواب دیا "تم اگر پسند کرو، تو میں تمہارا نام سیف الدین رکھتا ہوں"

سیڑھیوں سے نیچے ایک سپاہی گھوڑا لیے کھڑا تھا۔ محمد بن قاسم نیچے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو یزید بن ابو قبشہ نے بھاگ کر باگ تھام لی۔ محمد بن قاسم کے احتجاج کے باوجود لوگ بھاگ بھاگ کر دیوانہ وار اُس کے پاؤں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔

گھوڑے پر سوار ہو کر محمد بن قاسم نے چاروں طرف دیکھا۔ اُسے کوئی آنکھ آنسوؤں سے خالی نظر نہ آئی۔ سفید ریش بوڑھے یہ محسوس کر رہے تھے کہ اُن کا عزیز ترین بیٹا اُن سے رخصت ہو رہا ہے۔ بیوہ عورتیں اور یتیم بچے یہ محسوس کر رہے تھے کہ قدرت اُن کا زبردست سہارا چھین رہی ہے۔ نوجوان لڑکیاں یہ کہہ رہی تھیں کہ اُن کی عفت اور عصمت کا نگہبان جا رہا ہے۔ غرض ارور کے در و دیوار پر حسرت برس رہی تھی۔

اپنے باپ کے اشارے سے شہر کے پروہت کی نوجوان لڑکی آگے بڑھی اور اُس نے محمد بن قاسم کو پھولوں کا ہار پیش کرتے ہوئے کہا۔ "میرے بھائی! میں ارور کی تمام کنیاؤں کی طرف سے یہ تحفہ تمہاری خدمت میں پیش کرتی ہوں۔"

محمد بن قاسم نے اُس کی طرف احسانمندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پھول قبول کر لیے۔

دیبل کے بازاروں سے سلیمان بن عبدالملک کے قیدی کا گھوڑا پھولوں کے ڈھیر روندتا ہوا نکلا۔ ارور کے باشندوں نے کسی شہنشاہ

کا جلوس اِس قدر شاندار نہ دیکھا تھا۔ کسی عزیز کی جُدائی پر اِس قدر آنسو نہ بہائے تھے۔ وہ ہاتھ جنہوں نے دو سال قبل فاتح سندھ کو اپنا بدترین دشمن سمجھ کر تیروں اور نیزوں کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اب اُس پر پھولوں کی بارش کر رہے تھے۔

علی، خالد، ناہید اور زہرا محمد بن قاسم کے ساتھ جانے والے چند اور سپاہیوں کے ساتھ پہلے ہی شہر سے باہر پہنچ چکے تھے۔ یہ قافلہ ساٹھ نفوس پر مشتمل تھا۔ ان میں چالیس وہ سپاہی تھے جو محمد بن قاسم کو پابہ زنجیر دمشق لے جانے کے لئے یزید بن ابوقبشہ کے ساتھ آئے تھے۔ واسط کا کوتوال مالک بن یوسف صالح کی سفارش سے ان کا سالار مقرر ہو کر آیا تھا۔ مالک بن یوسف کو صالح کی یہ ہدایت تھی، کہ وہ راستے میں محمد بن قاسم کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرے۔ مالک خود بھی حجاج بن یوسف کے خاندان کا پرانا دشمن تھا۔ لیکن اَرور پہنچ کر وہ یزید بن قبشہ کی طرح محمد بن قاسم کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس کے بعض ساتھی بھی، اَرور سے اُس کی روانگی کا منظر دیکھ کر اِس قدر متاثر ہوئے کہ وہ کھلے بندوں سلیمان کے غلط احکام پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ یزید نے اُنہیں رخصت کرتے وقت تاکید کی کہ تم انہیں عزت کے ساتھ بصرہ لے جاؤ۔ امیر المومنین کو میں جواب دے لوں گا۔

دوپہر کے وقت سیف الدین (بھیم سنگھ) اَرور کے پروہت

کے ساتھ ایک ٹیلے پر کھڑا دُور راستے کی گرد میں، ایک قافلے کو روپوش ہوتے دیکھ رہا تھا۔

پروہت نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "سندھ کا آفتاب دوپہر کے وقت غروب ہو رہا ہے۔"

غرُوبِ آفتاب

(۱)

حضرت عمر بن عبد العزیز رضؔ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد مسجد نبوی سے باہر نکل رہے تھے۔ اچانک ایک سوار دروازے پر آکر رُکا۔ سوار کا چہرہ گرد و غُبار میں اٹا ہُوا تھا۔ اُس کا چہرہ بھوک پیاس اور تھکاوٹ کی وجہ سے مُرجھایا ہُوا تھا۔ اُس نے عمر بن عبد العزیز کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کُچھ کہنے کی کوشش کی لیکن خشک گلے سے آواز نہ نکل سکی۔ وُہ گھوڑے سے اُتر کر خط نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈال کر عمر بن عبد العزیز رضؔ کی طرف بڑھا لیکن دو تین قدم اُٹھانے کے بعد لڑکھڑا کر زمین پر گِر پڑا۔ اور اُس کے ساتھ ہی تھکے ہوئے گھوڑے نے اپنے بوجھ سے آزاد ہوتے ہی زمین پر گرنے کے بعد ایک جُھرجھری لے کر دم توڑ دیا۔ یہ سوار زبیر تھا۔ لوگ اُسے اُٹھا کر مسجد کے ایک حُجرے میں لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سوار نے جب ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں۔ عمر بن عبد العزیز اُس کے مُنہ

پر پانی کے چھینٹے دے رہے تھے۔ اُس نے پانی کا پیالہ چھین کر پینے کی کوشش کی لیکن عمر بن عبدالعزیز نے کہا "تھوڑی دیر صبر کرو۔ تم پہلے ہی بہت زیادہ پانی پی چکے ہو۔ اب کچھ کھا لو۔ معلوم ہوتا ہے، تم نے کئی دن سے کچھ نہیں کھایا۔"

عمر بن عبدالعزیز کے اشارے سے ایک شخص نے زبیر کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ لیکن سوار نے کہا "نہیں مجھے صرف پانی کی ضرورت ہے۔" اور پھر چونک کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں پہلے ہی بہت وقت ضائع کر چکا ہوں۔ یہ خط۔۔۔ لیکن......!"

جیب خالی پا کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

عمر بن عبدالعزیز نے کہا "تمہارا خط میں پڑھ چکا ہوں۔ تمہارے گھوڑے کے دم توڑنے اور تمہارے بے ہوش ہو جانے سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم کوئی ضروری پیغام لائے ہو۔"

زبیر نے کہا۔ "تو آپ...... محمد بن قاسم کے لئے کچھ کریں گے؟"

"میں دمشق جا رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا اور سوال کیا "میرا گھوڑا تیار ہے؟"

اُس نے جواب دیا "جی ہاں!"

زبیر نے کہا "میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا "نہیں تم آرام کرو۔ تم گزشتہ سفر میں بہت نڈھال ہو چکے ہو۔"

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے نڈھال ہونے کی وجہ سفر کی کُلفت سے زیادہ میرے دل کی بے چینی تھی۔ اب یہاں ٹھہر کر انتظار کرنے میں مجھے سفر سے زیادہ تکلیف ہوگی"۔

عمر بن عبدالعزیز نے کہا "بہت اچھا۔ تم کھانا کھالو"۔

زبیر نے جلدی جلدی کھانے کے چند نوالے منہ میں رکھنے کے بعد پیٹ بھر کر پانی پیا اور اُٹھ کر بولا "میں تیار ہوں"۔

عمر بن عبدالعزیز نے ایک عرب کو دُوسرا گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور زبیر سے کہا "آپ تھوڑی دیر بیٹھ جائیے"۔

زبیر نے کہا "اگر آپ کا حکم نہ ہو تو میں کھڑا رہنے کو ترجیح دوں گا۔ بیٹھنے سے انسان پر نیند اور تھکاوٹ کا حملہ نسبتًہ زیادہ شدید ہوتا ہے"۔

ایک عرب نے پُوچھا "آپ نے راستے میں بالکل آرام نہیں کیا؟"

زبیر نے جواب دیا "دن کے وقت بالکل نہیں۔ اور رات کو بھی اُس وقت جب میں بے ہوش ہوجایا کرتا تھا"۔

عمر بن عبدالعزیز نے پُوچھا "تم نے راستے میں کتنے گھوڑے تبدیل کیے؟"

"ارور سے بصرہ تک ہر پانچ کوس پر سپاہیوں کی چوکیوں سے میں تازہ دم گھوڑا تبدیل کرتا رہا۔ لیکن بصرہ سے آگے وقت بچانے کے لیے میں نے سیدھا راستہ اختیار کرنا مناسب خیال کیا اور صحرائے عرب عبور کرتے ہوئے مجھے بعض اوقات ایک ہی گھوڑے پر کئی منازل طے کرنا پڑیں۔ اس سے پہلے میرے نیچے چار گھوڑے دم توڑ چکے ہیں"۔

عمر بن عبد العزیز نے کہا: لوگ محمد بن قاسم کی فتوحات کی داستانیں تعجب سے سُنا کرتے تھے۔ لیکن جس سپہ سالار کے پاس تمہارے جیسے سپاہی ہوں، اُس کے لئے کوئی قلعہ ناقابلِ تسخیر نہیں ہو سکتا"۔

خادم نے آکر اطلاع دی کہ گھوڑے تیار ہیں۔ زبیر اور عمر بن عبد العزیز حجرے سے باہر نکل کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے +

(۲)

سلیمان کو سندھ سے محمد بن قاسم کی اطلاع مِل چکی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ارور کی طرح مکران اور ایران کے ہر شہر کے باشندے راستے میں اُس کا پُرتپاک خیر مقدم کر رہے ہیں اور یزید نے سندھ سے لے کے عراق تک بغاوت کے خوف سے اُسے بیڑیاں پہنانے کی جرأت نہیں کی۔ اِن خبروں نے اسکی آتشِ انتقام پر تیل کا کام دیا۔ اُس نے اپنے تمام تیر دیکھے اور اُن میں سے جو سب سے زیادہ تیز اور جگر دوز تھا۔ اُسے محمد بن قاسم کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے اختیارات دے کر بصرہ روانہ کر دیا۔ یہ صالح تھا ۔۔ محمد بن قاسم کا بدترین دشمن!

بصرہ کے لوگ جس بے چینی اور بے قراری سے محمد بن قاسم کا انتظار کر رہے تھے۔ اُس سے صالح نے یہ اندازہ لگایا کہ اگر بصرہ میں محمد بن قاسم کے ساتھ بدسلوکی کی گئی تو لوگ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ وُہ محمد بن قاسم کو پابہ زنجیر بصرہ سے واسط لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن بصرہ کے عوام کا جوش وخروش دیکھ کر اُسے اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔

ایک شام محمد بن قاسم کا قافلہ بصرہ سے تین کوس کے فاصلے پر ایک بستی کے قریب پہنچا۔ بستی کے لوگوں کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ سندھ کا فاتح اور سلیمان کا قیدی ایک رات یہاں قیام کرے گا۔ بستی کے مرد، عورتیں اور بچے فوج کی چوکی کے سامنے کھڑے تھے۔ عورتیں محمد بن قاسم کے علاوہ اُس لڑکی کو دیکھنے کے لئے بیقرار تھیں۔ جس کی آواز نے سندھ کی تاریخ بدل ڈالی تھی۔ محمد بن قاسم کو دیکھتے ہی کئی نوجوان بھاگ کر اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ کئی ہاتھ بیک وقت اُس کے گھوڑے کی باگ تھامنے کے لئے بڑھے۔ عورتوں نے چوکی سے کچھ فاصلے پر ہی محمل بردار اونٹ ٹھہرا لیا۔ اور زہرا اور ناہید کو ایک مکان میں لے گئیں۔

چوکی کے محافظ سپاہیوں نے مالک بن یوسف کو بتایا کہ صالح راستے کی ہر بستی میں محمد بن قاسم کی آؤ بھگت کی خبریں سُن کر سخت مضطرب ہے۔ اور اُسے یہ خطرہ ہے کہ بصرہ کے لوگ شاید زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کریں۔ اُسے اِس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ وہاں ناہید کی آواز اُس کے حق میں بہت مضر ثابت ہو گی۔ اِس لئے اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ محمد بن قاسم کو سیدھا واسط پہنچایا جائے۔ وہ اِن لڑکیوں کو بھی بصرہ پہنچنے سے روکنا چاہتا ہے۔ شاید وہ صبح تک خود یہاں پہنچ جائے۔

چوکی کے سالار نے مالک کو صالح کا وہ خط دکھایا جس میں ہدایت تھی کہ محمد بن قاسم کو اُس کی آمد تک وہیں روکا جائے۔

گزشتہ سفر میں محمد بن قاسم کو قریب سے دیکھنے کے بعد مالک بن یوسف کو اُس کے ساتھ غایت درجہ کی عقیدت ہو چکی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ بصرہ کے لوگوں کا جوش و خروش سلیمان کو محمد بن قاسم کے متعلق اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دے گا۔ واسط ولید کی موت کے بعد پھر ایک بار خارجی عناصر کا مرکز بن چکا تھا۔ اور اُسے اُمید نہ تھی کہ وہاں سے محمد بن قاسم کے حق میں کوئی آواز اُٹھے گی۔

وہ عشاء کی نماز کے بعد کچھ دیر اپنے خیمے سے باہر پریشانی کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ بالآخر وہ ایک مضبوط ارادہ لے کر محمد بن قاسم کے خیمے میں داخل ہوا۔ محمد بن قاسم شمع کی روشنی میں بیٹھا کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔

مالک نے کہا "آپ کسی کے نام کوئی خط بھیجنا چاہتے ہیں، تو میں انتظام کر دوں؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "نہیں یہ خط نہیں۔ میں ایک نئی قسم کی منجنیق کا نقشہ تیار کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں اس سے پتھر زیادہ دُور اور زیادہ صحیح نشانے پر پھینکا جا سکے گا۔"

مالک نے جواب دیا "اس وقت آپ کو کچھ اپنے متعلق سوچنا چاہیے۔"

محمد بن قاسم نے جواب دیا "میں ایک فرد ہوں اور منجنیق ایک قوم کی ضرورت ہے۔ اگر مجھے قید کر لیا گیا تو آپ خود یہ نقشہ امیر المومنین کے پاس پہنچا دیں۔"

مالک نے جواب دیا "آپ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ آپ بصرہ کے

بجائے سیدھے واسط جا رہے ہیں"۔

محمد بن قاسم نے اطمینان سے جواب دیا: "مجھے پہلے ہی یہ خیال تھا کہ وہ مجھے بصرہ لے جانے کی غلطی نہیں کریں گے"۔

مالک نے کہا: "اب آپ اپنے متعلق فیصلہ کر سکتے ہیں۔ واسط کے بہت کم لوگ آپ کے حق میں آواز اُٹھائیں گے۔ لیکن آپ کے بصرہ پہنچ جانے پر ہزاروں مجاہد آپ پر جان دینے کے لئے تیار رہوں گے۔ صالح آج رات یا صبح کسی وقت یہاں پہنچ جائے گا۔ اور اس کے بعد ہماری ہر تدبیر بے سُود ہو گی۔ اس وقت ایک ہی صورت ہے۔ کہ آپ فوراً اِن لڑکیوں کو لے کر روانہ ہو جائیں۔ وہاں آپ ہر گھر کو اپنے لئے ایک قلعہ پائیں گے۔ اب اُٹھئے، یہ وقت بہت نازک ہے"۔

محمد بن قاسم نے جواب دیا: "میری جان بچانے کے لئے آپ کتنے مسلمانوں کی جانیں قربان کرنا جائز سمجھتے ہیں؟ کیا اس سے پہلے بصرہ کے لوگوں کی بغاوتوں نے عالمِ اسلام کو کافی نقصان نہیں پہنچایا؟ کیا میری تنہا جان اِس قدر قیمتی ہے کہ اُس کے لئے لاکھوں مسلمانوں کی تلواریں آپس میں ٹکرا جائیں۔ لاکھوں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہو جائیں؟ اگر میں عالمِ اسلام کو اس تباہی سے بچانے کے لئے قربان بھی ہو جاؤں۔ تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میری قربانی رائگاں جائے گی۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ خلافت اب ملوکیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ تاہم مسلمانوں کا سوادِ اعظم اُسے خلیفہ تسلیم کرنے کی غلطی کر

چُکا ہے۔ اور اس وقت میری بغاوت فقط خلیفہ سلیمان کے خلاف نہ ہوگی۔ بلکہ قوم کے سوادِ اعظم کے خلاف ہوگی۔ لیکن ممکن ہے کہ میری قربانی کے بعد جمہور مسلمین اپنی اس کمزوری کو محسوس کریں اور اُن میں ایک ایسا اجتماعی ضمیر پیدا ہو جائے جو سلیمان کو راہِ راست پر لے آئے۔ یا کم از کم سلیمان کے بعد وُہ انتخاب کے معاملہ میں اس قدر سخت ہو جائیں کہ سلیمان جیسوں کے لئے آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہ ہو۔ اگر میرے انجام سے متاثر ہو کر عوام نے یہ محسوس کیا، کہ وُہ امارت کو کسی کی خاندانی میراث تسلیم کرنے میں غلطی پر تھے، اور اُنہوں نے سلیمان کے بعد اُس کے کسی خاندانی وارث کے بجائے کسی صالح مسلمان کو خلیفہ منتخب کیا تو یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کے لئے قربان ہونا میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہوں"۔

مالک بن یوسف نے لاجواب ہو کر کہا "آپ کا فیصلہ اٹل ہے، میں ہار مانتا ہوں۔ لیکن اِن لڑکیوں کے متعلق آپ نے کیا سوچا؟ مجھے چوکی کے سپاہیوں سے معلوم ہوا ہے کہ صالح بصرہ کے لوگوں کے اشتعال کے خوف سے انہیں بھی واسط لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اُن کے بصرہ نہ پہنچنے سے لوگ زیادہ مشتعل ہوں گے بصرہ کے ہر گھر میں ناہید کا انتظار ہو رہا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ صالح کے یہاں پہنچنے سے پہلے انہیں بصرہ روانہ کر دیا جائے"؟

محمد بن قاسم نے کچھ سوچ کر جواب دیا "مجھے صرف اس بات کا

خیال ہے کہ ناہید زبیر کی بیوی ہے۔ اور صالح میری طرح زبیر کو بھی اپنا بدترین دشمن خیال کرتا ہے۔ تاہم مجھے یہ اُمید نہیں کہ وہ ناہید کے ساتھ کسی بدسلوکی کی جرأت کرے گا۔"

مالک نے جواب دیا۔ "میں کئی برس صالح کے ساتھ گزار چکا ہوں، وُہ انسان نہیں بلکہ سانپ ہے۔ اگر ان لڑکیوں کے متعلق اُس کے مُنہ سے ایک گستاخی کا لفظ نکل گیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے تمام ساتھی کٹ مرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ اِس لئے میرا مشورہ قبول کیجئے، اور اِن لڑکیوں کو خالد کے ساتھ بصرہ بھیج دیجئے۔ میں چند سپاہی بھی ساتھ دے دیتا ہوں۔ اور اگر آپ کو اسلام کا مستقبل بہت زیادہ عزیز ہے تو آپ انہیں ہدایت کر سکتے ہیں کہ وہ بصرہ میں کسی بغاوت کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔"

محمد بن قاسم کے دِل میں اچانک ایک خیال آیا اور اُس کے دِل میں بعض دبے ہوئے احساسات جاگ اُٹھے۔ وُہ اُٹھا اور بیقراری کی حالت میں خیمے کے اندر ٹہلنے لگا۔ مالک اُس کی حرکات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ محمد بن قاسم بار بار مٹھیاں بھینچ کر کسی زبردست ارادے کے خلاف جنگ کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ کمرے میں چند چکّر لگانے کے بعد وہ مالک سے کوئی بات کئے بغیر باہر نکل آیا اور ساتھ والے خیمے میں خالد کو آواز دی۔ خالد بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ تو اُس نے کہا۔ "خالد! ناہید اور زہرا کو بستی سے بُلا لاؤ۔ جلد ہی کرو۔"

خالد اُسی رفتار سے بھاگتا ہوا بستی کی طرف چلا گیا۔ اور محمد بن قاسم مالک کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ فوراً چار گھوڑے تیار کروائیں۔ نہیں پانچ۔ علی بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔"

مالک نے پُر اُمید ہو کر پوچھا۔ "تو آپ جا رہے ہیں؟"

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "اگر تمہاری اجازت ہو تو میں انہیں بصرہ چھوڑ آؤں۔ میں انشاء اللہ صبح تک واپس آجاؤں گا۔"

مالک نے جواب دیا۔ "آپ واپس آنے کا نام نہ لیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ سندھ کا رُخ کریں۔ میں چند دنوں میں آپ کی بیوی کو وہاں پہنچا دینے کا انتظام کروں گا۔"

محمد بن قاسم نے کہا۔ "میرے دوست! میرے متعلق بار بار غلط اندازہ نہ لگاؤ۔ میری شخصیت ایسی نہیں جو کہیں چھپ سکے۔ میں فقط چند لمحات کے لئے گھر جانا چاہتا ہوں۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ تم میرے وعدے کا اعتبار کرو۔ اگر صالح آج رات بصرہ سے روانہ نہیں ہو گیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اُس کے یہاں پہنچنے سے پہلے واپس آجاؤں گا۔"

"صالح جیسے آدمی ایسے حالات میں رات کے وقت سفر نہیں کیا کرتے۔ وہ دن کے وقت عراق کی زمین پر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ میں گھوڑے تیار کرتا ہوں۔ اگر آپ بصرہ پہنچ کر واپس آنے کا ارادہ تبدیل کر لیں تو میری فکر نہ کریں۔ میں آپ کے ساتھ ایک

سپاہی بھیج دیتا ہوں۔ آپ اُس کے ہاتھ پیغام بھیج دیں۔ مَیں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سندھ چلا جاؤں گا۔"

محمد بن قاسم نے ذرا تلخ ہو کر کہا۔" مالک تم مجھے بار بار نادم نہ کرو۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تو مَیں نہیں جاتا۔"

مالک نے کھسیانہ ہو کر کہا۔" نہیں نہیں۔ مَیں گھوڑوں کا انتظام کرتا ہوں۔ آپ تیار ہو جائیں۔" مالک یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد محمد بن قاسم، خالد، ناہید، زہرہ اور علی صبا رفتار گھوڑوں پر بصرہ کا رُخ کر رہے تھے۔ محمد بن قاسم نے راستے میں صالح سے ٹکر کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے بصرہ کی عام شاہراہ سے کترا کر ایک دوسرا اور نسبتاً لمبا راستہ اختیار کیا۔

(۳)

آدھی رات کے قریب خادمہ بھاگتی ہوئی زبیدہ کے کمرے میں داخل ہوئی، اور اسے جھنجھوڑ کر جگاتے ہوئے کہنے لگی۔" زبیدہ! زبیدہ!! وہ آ گئے۔ وُہ آ گئے!"

زبیدہ پر ایک سکتہ کا عالم طاری تھا۔ خادمہ نے ذرا بلند آواز میں کہا۔" زبیدہ! محمد آ گیا!!"

زبیدہ کی حالت اُس بھٹکے ہوئے مسافر کی سی تھی، جسے کسی نے بے ہوشی کی حالت میں تپتے ہوئے صحرا سے اُٹھا کر نخلستان میں پہنچا دیا ہو۔ جو ایک گھونٹ پانی کو ترسنے کے بعد دریا میں غوطے لگا رہا ہو۔ جذبات کی

شدّت سے زبیدہ ایک ثانیہ کے لئے بے حس و حرکت بیٹھی رہی ۔ خادمہ نے مشعل جلا کر رکھ دی ، اور کہا ۔ " زبیدہ اُٹھو ۔ اُن کے ساتھ چند مہمان ہیں ۔"

اتنی دیر میں زبیدہ اپنے حواس پر قابو پا چکی تھی ۔ " وہ کہاں ہیں ؟ " اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں سوال کیا ۔

" وہ اصطبل میں گھوڑے باندھ رہے ہیں ۔ دو لڑکیاں صحن میں کھڑی ہیں ۔"

زبیدہ نے باہر نکل کر چاند کی روشنی میں زہرا اور ناہید کی طرف دیکھا اور کہا ۔ " آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں ۔ اندر آئیے ۔ میں ابھی خواب دیکھ رہی تھی ۔ آپ ناہید اور زہرا ہیں نا ؟ "

ناہید جواب دیئے بغیر آگے بڑھ کر زبیدہ سے لپٹ گئی ۔ اور زہرا کی آنکھوں میں ضبط کی کوشش کے باوجود آنسو اُمڈ آئے ۔ ناہید سے علیحدہ ہو کر زبیدہ زہرا کی طرف متوجہ ہوئی ۔ اور اُس سے آنسوؤں کی وجہ پوچھنا چاہتی تھی ۔ لیکن اتنی دیر میں محمد بن قاسم ، خالد اور علی قریب آتے دکھائی دیئے ۔

محمد بن قاسم کے ساتھ دو اجنبی دیکھ کر زبیدہ نے ناہید اور زہرا کو اندر لے جانا چاہا ۔ لیکن ناہید نے کہا ۔ " ہمیں دوسرے کمرے میں آرام کرنے دیجئے ۔ ہم بہت تھکی ہوئی ہیں ۔"

زبیدہ نے کہا ۔ " بہت اچھا ۔ آپ آرام کریں ۔"

خادمہ زبیدہ کے اشارے سے زہرا اور ناہید کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اور محمد بن قاسم خالد اور علی کو اس کمرے میں پہنچانے کے بعد زبیدہ کے کمرے میں داخل ہوا۔

(۴)

رات کے پچھلے پہر محمد بن قاسم اپنے کمرے میں بیٹھا زبیدہ سے باتیں کر رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ زبیدہ کبھی کبھی اپنے شوہر کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر باہر جھانکتی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر رہ جاتی۔ سپیدۂ سحر اُسے شامِ جُدائی کا پیغام دے رہا تھا۔ مرغِ سحر کی اذان سے کچھ دیر پہلے ہی محمد بن قاسم سفر کے لئے تیار ہو گیا۔

زبیدہ کی والدہ محمد بن قاسم کے متعلق سلیمان کے ارادوں سے واقف ہوتے ہی زبیدہ کے ماموں اور بصرہ کے چند با اثر مسلمانوں کے وفد کے ساتھ دمشق روانہ ہو چکی تھی۔ محمد بن قاسم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "افسوس مَیں اُن سے مِل نہ سکا۔ زبیدہ! مجھے اُمید ہے کہ ناہید اور زہرا تمہیں اُداس نہ ہونے دیں گی۔ ابھی چند دن یہی کوشش کرنا کہ اُن کی آمد کا کسی کو پتہ نہ چلے۔"

زبیدہ ہونٹ بھینچ بھینچ کر ہچکیوں کو ضبط کر رہی تھی لیکن اس کی نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں۔ "آپ سچ مُچ جا رہے ہیں!"

محمد بن قاسم نے کہا۔ "زبیدہ خدا حافظ!"

زبیدہ نے ملتجی ہو کر کہا۔ "اگر آپ مجھے اجازت دیں تو مَیں آپ کو

اصطبل تک چھوڑ آؤں؟"

اُس نے جواب دیا۔" نہیں تم یہیں ٹھیرو ـــ اور میری طرف اس طرح نہ دیکھو۔"

زبیدہ کی نگاہوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہو رہے تھے۔ اُس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔" جائیے!"

محمد بن قاسم ایک لحظہ کے لئے پانی کے اُن دو قطروں کی طرف دیکھتا رہا، جن میں محبت اور اطاعت کے ہزاروں دریا بند تھے۔ اُس نے رومال نکال کر زبیدہ کے آنسوؤں کو پونچھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن اُس نے پھر کہا۔" جائیے!"

محمد بن قاسم نے دو قدم آگے کی طرف اُٹھائے۔ ایک بار مُڑ کر دیکھا اور پھر لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہُوا باہر نکل گیا۔

اصطبل کے سامنے اُسے خالد اور علی دکھائی دیئے اور اُس نے پوچھا

"خالد تم ابھی تک سوئے نہیں؟"

اُس نے جواب دیا۔" ہم میں سے کوئی بھی نہیں سویا۔"

محمد بن قاسم نے کہا۔" جاؤ آرام کرو۔"

"لیکن مَیں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

محمد بن قاسم نے خالد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔
"مَیں تمہارے جذبات سے واقف ہوں۔ لیکن مصلحت کا یہی تقاضا ہے کہ تم یہیں ٹھہرو۔ یہ میری زندگی کا ایسا جہاد ہے جس میں مجھے ساتھیوں کی

ضرورت نہیں"۔

"میں اپنے سالار کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کر سکتا لیکن میرے لئے یہاں ٹھہر کر آپ کے انتظار کی ہر گھڑی قیامت ہو گی"۔

محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ "یہ تمہارے سالار کا حکم نہیں۔ تمہارے دوست کی خواہش ہے۔ جب تک زبیدہ کا ماموں واپس نہیں آتا، تمہارا گھر میں رہنا ضروری ہے"۔

خالد نے مایوس ہو کر علی کی طرف دیکھا، اور وہ اصطبل سے گھوڑا نکال لایا۔

محمد بن قاسم نے گھوڑے پر سوار ہو کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ خالد نے جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ "میرے بھائی! میرے دوست! میرے آقا! خدا حافظ!"

خالد کے آنسو محمد بن قاسم کے ہاتھ پر گر پڑے۔ وہ ہاتھ چھڑا کر علی کی طرف متوجہ ہوا۔ علی اُس کا ہاتھ مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کانپتی ہوئی آواز میں خدا حافظ کہہ کر سسکیاں لینے لگا۔

دروازے سے باہر نکلتے ہوئے محمد بن قاسم نے پیچھے مڑ کر دیکھا صحن میں چند قدم کے فاصلے پر تین عورتیں کھڑی تھیں۔

جس وقت بصرہ کی مساجد میں اذانیں گونج رہی تھیں۔ محمد بن قاسم اُس بازار میں سے گزر رہا تھا جس میں کچھ عرصہ قبل بصرہ کے لوگوں نے سندھ پر حملہ کرنے والی افواج کے سترہ سالہ سپہ سالار کا شاندار جلوس

دیکھا تھا۔

شہر سے کچھ دُور جا کر اُس نے ایک ندی کے کنارے صبح کی نماز ادا کی اور گھوڑے پر سوار ہو کر اُسے سرپٹ چھوڑ دیا۔

(۵)

خلیفہ سلیمان مسجد میں مغرب کی نماز کے بعد قصرِ خلافت میں داخل ہو رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی "سلیمان!"

اس آواز میں غصہ بھی تھا اور جلال بھی۔ سلیمان نے چونک کر پیچھے دیکھا اور کہا "کون؟ عمر بن عبدالعزیز! خیریت تو ہے۔ آپ کب آئے؟"

عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان سوالات کا جواب دینے کی بجائے سلیمان کا بازو پکڑ لیا۔ اور کہا:-

"سلیمان! خدا کو کیا جواب دو گے؟"

سلیمان انتہا درجے کا خود پسند تھا۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز کی شخصیت کے سامنے وہ مرعوب سا ہو کر رہ گیا۔ زبیر چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ لیکن شام کے دھندلکے میں وُہ اُسے فوراً پہچان نہ سکا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "مجھے آپ کی گفتگو کا موضوع نازک معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس کے لئے تخلیہ بہتر نہ ہو گا؟ آیئے اندر چلیں۔"

عمرُ نے کہا "مَیں تو مسجد میں لوگوں کے سامنے تمہارا دامن پکڑنے کے لئے آیا تھا۔ لیکن اب چلو جلدی کرو۔ آؤ زبیر تم بھی۔"

چند قدم چلنے کے بعد تینوں محل کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ سلیمان نے مشعل کی روشنی میں زبیر کی طرف دیکھا، اور کہا۔ "میں نے تمہیں کہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔"

عمر بن عبدالعزیز نے کہا۔ "اب ان باتوں کا وقت نہیں۔ میں محمد بن قاسم کے متعلق کچھ کہنے کے لئے آیا ہوں۔"

محمد بن قاسم کا نام سُن کر سلیمان نے غصے اور اضطراب کی حالت میں عمرؓ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تو اُس کی سازش مدینے تک بھی پہنچ چکی ہے اور یہ ۔۔۔ اُس کا دوست ہے ۔۔۔؟"

زبیر نے کہا۔ "میں اُس کی دوستی سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن یہ غلط ہے کہ محمد بن قاسم آپ کے خلاف کوئی سازش کھڑی کر رہا ہے۔ میں یزید بن ابوکبشہ کا ایلچی بن کر مدینے پہنچا تھا۔"

سلیمان کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز نے یزید بن ابوکبشہ کا خط اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "پہلے یہ پڑھ لو۔ یزید تمہارے خاص احباب میں سے ہے۔ اگر اُسے محمد بن قاسم کی معصومیت ایسا خط لکھنے پر آمادہ کر سکتی ہے، تو مجھ سے یہ توقع نہ رکھو کہ میں تمہیں مسلمانوں کی گردن پر چھری رکھتے دیکھ کر خاموش رہوں گا۔ تم شاید اِس لئے خوش ہو گے کہ قدرت نے آج تمہیں انتقام کا موقع دیا ہے لیکن تم اُس نوجوان کی عظمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جس کے جاں نثار تمہارے جاں نثاروں سے کہیں زیادہ ہیں۔ جس کی تلوار تمہاری

تلوار سے زیادہ تیز اور جس کے تیر تمہارے تیروں کے مقابلہ میں زیادہ جگردوز ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک عاقبت نااندیش امیر کے سامنے سرِ تسلیم خم کر رہا ہے۔ تم نے پچاس آدمیوں کو اُسے قید کر کے لانے کا حکم دے کر سندھ بھیجا تھا۔ لیکن تم ہی بتاؤ کہ اگر تم خود اُس کی جگہ ہوتے اور تمہارے پاس ایک لاکھ سے زیادہ جاں نثاروں کی فوج ہوتی، اور پھر یہ تمہیں جاکر خلیفہ کا یہ حکم سُناتا کہ مَیں تمہیں زنجیریں پہنا کر لے جانا چاہتا ہوں، تو تم اُن پچاس آدمیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ تمہارا اپنا بھائی تمہارا امیر تھا۔ لیکن تم تمام عمر اُس کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہے لیکن محمد بن قاسم تمہیں اچھی طرح جانتا تھا۔ اُسے تم سے کبھی بھلائی کی اُمید نہ تھی۔ وہ اگر چاہتا تو سندھ کے ہر گھر کو اپنے لئے قلعہ بنا سکتا تھا۔ وہ اگر تمہارے ایلچی کو قتل بھی کر دیتا، تو بھی شاید تم اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔ لیکن اس کے باوجود وُہ تمہاری اطاعت سے منحرف نہیں ہوا۔ تم اپنے انتقام سے زیادہ نہیں سوچ سکے۔ لیکن اُس کے سامنے عالمِ اسلام کا مستقبل ہے۔ کیا تم اُس سے اِس بات کا انتقام لینا چاہتے ہو کہ وہ حجاج بن یوسف کا داماد ہے؟ اور فنونِ حرب کی نمائش میں اُس نے تمہیں نیچا دکھایا تھا؟ کاش! جس طرح وہ ایک سپاہی کے فرائض سمجھتا ہے اُسی طرح تم بھی ایک امیر کے فرائض سمجھو۔ اُس کی افواج ہندوستان کے آخری کونے تک اسلام کا پرچم لہرانے کا تہیّہ کر چکی تھیں۔ اگر اُسے واپس نہ بلایا جاتا۔ تو شاید وہ اِس وقت تک راجپوتانہ فتح کر چکا ہوتا۔ آج مجھے

دمشق پہنچتے ہی پتہ چلا ہے کہ تم نے اُسے صالح کی نگرانی میں واسط بھیج دیا ہے اور تم اُس کے لئے کوئی بدترین سزا تجویز کر چکے ہو۔ لیکن یاد رکھو! تم اُس کی عظمت اُس سے نہیں چھین سکتے۔ لوگ جلاّد کی تلوار بھول سکتے ہیں، لیکن شہیدوں کا خون نہیں بھول سکتے۔ سلیمان! میں تمہیں بہت کچھ سمجھاتا، لیکن اب باتوں کا وقت نہیں۔ اگر فاتح سندھ کے سینے میں پیوست ہونے والا تیر ابھی تک تمہارے ہاتھ میں ہے تو اُسے روک لو۔ ورنہ یاد رکھو آنے والے مؤرخ جہاں محمد بن قاسم کو اس زمانے کا سب سے بڑا مجاہد کہیں گے، وہاں تمہیں وہ اسلام کے سب سے بڑے دشمن کے نام سے یاد کریں گے۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو شاید کل تک نہیں دمشق کے لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دوں کہ مسلمانوں کی جماعت میں تمہارے جیسے امیر کے لئے کوئی جگہ نہیں ــــــ"

سلیمان کا غصہ ندامت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ اضطراب کی حالت میں مٹھیاں بھینچ کر کمرے میں ٹہلنے کے بعد مشعل کے سامنے رُکا پھر اس نے عمرؒ اور زبیر کی طرف دیکھا اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا: "کاش! آپ دو دن پہلے آ جاتے۔ میرا تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا!"

عمر بن عبدالعزیز نے پوچھا۔ "تو تم اس کے قتل کا حکم بھیج چکے ہو ــــ؟"

سلیمان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

زبیر نے کہا۔ "اگر آپ دُوسرا حکم لکھ دیں تو مَیں شاید وقت پر پہنچ سکوں۔"

سلیمان نے تالی بجائی۔ ایک غلام تعمیل کے لئے آموجود ہُوا۔ سلیمان نے کہا۔ "میرے اصطبل کا بہترین گھوڑا تیار کرو!"

غلام چلا گیا اور سلیمان خط لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

خط ختم کرنے کے بعد سلیمان نے عمر بن عبدالعزیز کو دیتے ہوئے کہا۔ "آپ پڑھ لیجیے!"

عمرؒ نے خط پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد یہ خط زبیر کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔

"اب خدا کرے یہ وقت پر پہنچ جائے۔ تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ کسی اور کو بھیج دیا جائے؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "یہ خط حاصل کرنے کے بعد میری تھکاوٹ دُور ہو چکی ہے۔ مَیں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ مَیں راستے میں آرام کئے بغیر واسط پہنچ سکتا ہوں۔ اگر مجھے راستے کی چوکیوں سے تازہ دم گھوڑے ملتے جائیں، تو میرا ارادہ ہے کہ مَیں طویل راستہ اختیار کرنے کی بجائے سیدھا صحرا عبُور کر لوں!"

سلیمان نے ایک اَور حکم نامہ راستے کی فوجی چوکیوں کے نام لکھ کر زبیر کے حوالے کیا۔ غلام نے آکر اطلاع دی کہ گھوڑا تیار ہے۔

زبیر نے سلیمان کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد عمر بن عبدالعزیز کی طرف

ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "آپ میرے لئے دُعا کریں۔"

عمر بن عبدالعزیز نے خدا حافظ کہتے ہوئے زبیر کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جو چند لمحے پہلے ایک طویل سفر کی کلفتوں سے مُرجھایا ہُوا تھا، اُمید کی روشنی جھلک رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد زبیر ایک تیز رفتار گھوڑے پر واسط کا رُخ کر رہا تھا۔

(۶)

چار دن کے بعد زبیر رات کے تیسرے پہر ایک سرسبز و شاداب علاقے میں سے گزر رہا تھا۔ مسلسل بے آرامی سے اُس کے اعضا شل ہو چکے تھے۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ گھوڑے کی تیز رفتار کے باوجود پچھلے پہر کی ہوا کے خوشگوار جھونکے اُسے زین پر سر ٹیک کر دُنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جانے پر مجبور کر رہے تھے۔ ایک ناقابلِ تسخیر عزم کے باوجود کبھی کبھی اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہو جاتیں۔ لگام پر ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی۔ اور گھوڑے کی رفتار تھوڑی دیر کے لئے سست ہو جاتی۔ لیکن ایک خیال اچانک کسی تیز نشتر کی طرح اس کے دِل میں اُتر جاتا۔ وہ چونک کر ستاروں کی طرف دیکھتا اور گھوڑے کی رفتار تیز کر دیتا۔

اس کی منزل قریب آ چکی تھی۔ وہ تصوّر میں سلیمان کا خط صالح کے ہاتھ میں دے رہا تھا ——— قید خانے کے دروازے پر

محمد بن قاسم سے بغلگیر ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: "محمد! مَیں اب سو جانا چاہتا ہوں۔ کسی ندی کے کنارے، کسی درخت کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے —— اور دیکھو، جب تک میں خود تازہ دم ہو کر نہ اُٹھوں، مجھے جگانا مت —— نیند کتنی عجیب چیز ہے۔ ہر دُکھ کا مداوا — ہر درد کا علاج —۔ مَیں کم از کم ایک دفعہ جی بھر کر سونا چاہتا ہوں — لیکن نہیں —۔ میرے دوست تمہیں سلامت دیکھ کر میری نیند اور تھکاوٹ دُور ہو جائے گی!"

اُفق مشرق پر صبح کا ستارہ نمودار ہو رہا تھا۔ زبیر کا تصوّر اُسے کہیں دُور لے جا رہا تھا۔ وہ پھر ایک بار دیبل کے راستے میں ایک ٹیلے پر کھڑا تھا۔ اور کم سِن سالار کے یہ الفاظ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے :۔

"زبیر! مجھے اِس ستارے کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ اِس کی زندگی جس قدر مختصر ہے اُسی قدر اُس کا مقصد بلند ہے۔ دیکھو یہ دُنیا کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ میری عارضی زندگی پر تأسف نہ کرو، قدرت نے مجھے سُورج کا ایلچی بنا کر بھیجا تھا اور مَیں اپنا فرض پُورا کر کے جا رہا ہوں۔ کاش! مَیں بھی اِس مُلک میں آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے صُبح کے ستارے کا فرض ادا کر سکوں!"

زبیر کے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھی اور اس نے پھر ایک بار تھکے ہوئے گھوڑے کو پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ افق مشرق سے شب کی ردائے سیاہ سمٹ رہی تھی۔ صبح کا ستارہ نور کے آنچل میں چھُپ گیا اور آفتاب خونی قبا پہن کر نمودار ہُوا۔

زبیر نے آخری چوکی سے اپنا گھوڑا تبدیل کیا۔ دو کوس اور چلنے کے بعد زبیر کو حدِ نظر پر واسط کی مساجد کے مینار نظر آرہے تھے وہ ہر قدم پر بیم و یاس کے اٹھتے ہوئے طوفانوں میں امید کی مشعل جلا رہا تھا۔

شہر کے مغربی دروازے پر آدمیوں کا ہجوم دیکھ کر زبیر نے گھوڑے کی باگ کھینچی۔ اور چند نوجوانوں کے کندھوں پر کسی کا جنازہ دیکھ کر گھوڑے سے اُتر پڑا۔ ٹانگوں میں اس کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ تھی۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے ایک عرب سے پُوچھا "صالح کہاں رہتا ہے؟"

عرب نے اس کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم کون ہو۔ اس سفاک سے تمہارا کیا کام ہے؟"

زبیر نے چند نوجوانوں کی پُرنم آنکھیں دیکھیں۔ پھر عرب کی طرف دیکھا اور دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں دمشق سے خلیفہ کا ایک ضروری پیغام لایا ہوں۔"

ٹھیک ہے، عرب نے سوال کیا "خلیفہ نے اب کس کے قتل کا حکم بھیجا ہے؟"

زبیر نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے عرب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا" یہ ...... جنازہ کس کا ہے؟"

عرب نے جواب میں کہا۔" تم نے فاتح سندھ کا نام سنا ہے؟"
زبیر کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ چھوٹ گئی۔ اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک نوجوان" زبیر! زبیر!" کہتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے قریب بیٹھ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ درد بھری آواز میں کہہ رہا تھا۔" زبیر! اٹھو۔ جلدی کرو۔ عماد الدین محمد بن قاسم کا جنازہ جا رہا ہے۔"

زبیر بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔" محمد! میں اب سو جانا چاہتا ہوں —— کسی ندی کے کنارے —— کسی درخت کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں —————— اور جب تک میں خود نہ اٹھوں ، مجھے جگانا مت۔"

نوجوان نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔" زبیر! میں خالد ہوں میری طرف دیکھو۔ محمد چل لبسا۔ سندھ کا آفتاب واسط کی خاک میں روپوش ہو رہا ہے۔ اٹھو! لوگ تمہارے دوست کا جنازہ لے جا رہے ہیں۔"

زبیر نے آنکھیں کھولیں اور پریشان سا ہو کر بولا ——

تم ؟ —— میں کہاں ؟ —— اُف میں شاید بے ہوش ہو گیا تھا - وہ جنازہ ؟ —— مجھے شاید کوئی یہ کہہ رہا تھا کہ ..... نہیں نہیں —— وہ محمد بن قاسم نہیں ہو سکتا —— دیکھو میں اُس کی رہائی کا حکم لایا ہوں ۔"

زبیر نے خط نکال کر خالد کو دے دیا اور کہا ۔" خالد ! اسے جلدی سے صالح کے پاس پہنچا دو ۔"

خالد نے بے توجّہی سے کاغذ کے پرزے کی طرف دیکھا اور اسے زمین پر پھینک دیا ۔ زبیر مبہوت سا ہو کر خالد کی طرف دیکھ رہا تھا ۔

ایک معمّر عرب نے جھک کر خط اٹھا لیا ۔ اور اسے کھول کر پڑھتے ہی چلّا اُٹھا ۔

" امیر المومنین کا حکم تھا ۔ کہ اسے عزت کے ساتھ دمشق پہنچایا جائے ۔ صالح نے اپنے ارادے سے اسے قتل کیا ہے ۔ امیر المومنین ایسا حکم نہیں دے سکتے تھے ۔ واسط کے مسلمانو ! محمد بن قاسم کی رُوح انتقام کے لئے پکار رہی ہے ۔ تم کیا دیکھتے ہو —— آؤ میرے ساتھ آؤ ۔"

ہجوم کے کھسک جانے کے بعد خالد نے زبیر کو اٹھانے کے لئے سہارا دینے کی کوشش کی ۔ لیکن اس نے کہا ۔" میں اب ٹھیک ہوں ۔ چلو ۔"

دونوں اُٹھ کر قبرستان کی طرف چل دیئے۔

جس وقت لوگ محمد بن قاسم کی لحد پر مٹی ڈال رہے تھے کوئی پچاس نوجوان، صالح کے مکان کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے اور تلواریں سونت کر اس پر ٹوٹ پڑے ÷